آئینِ تربیت

از

آیت اللہ استاد ابراہیم امینی

ترجمہ

قیصر عباس
ثاقب نقوی

ناشر

مصباح الہدیٰ پبلیکیشنز

۱۰۔ گنگارام بلڈنگ ○ شاہراہِ قائداعظم ○ لاہور

پاکستان

فہرست

انتساب

* حضرت علی و فاطمہ سلام اللہ علیہا — کی خدمت میں — کہ جو اسلام کے مثالی ماں باپ ہیں — جنہوں نے — امام حسنؑ، امام حسینؑ، زینبؑ اور ام کلثومؑ جیسی لائق اولاد کی تربیت کی۔
* ان لائق احترام ماں باپ — کی خدمت میں — کہ جن کے دامن میں امام خمینی (روحی فداہ) جیسے بابصیرت اور مضبوط موقف کے حامل رہبر کے سے فداکار اور آبرومند بیٹے پروان چڑھے۔
* ان ماں باپ — کی خدمت میں — جو اپنے تربیت یافتہ مجاہد اور جانباز فرزندوں کی جدائی کا داغ سینے پر لگائے ہوئے ہیں — وہی فرزند کہ جنہوں نے اسلام کے لیے جام شہادت نوش کیا اور اپنے عزیز خون کو نثار کر کے انقلاب اسلامی ایران کے چہرے کو گل رنگ کر دیا اور شجر اسلام کی آبیاری کی۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

عرضِ ناشر

دورِ حاضر میں جہاں حضرتِ انسان نے مادیت میں اس قدر ترقی کی ہے کہ اب وہ خلائی سفر کامیابی سے انجام دیتے ہوئے نظامِ شمسی میں دیگر سیارگان پر کمندیں ڈال رہا ہے، وہاں وہ اقدارِ انسانی میں مسلسل انحطاط کے مسئلے سے بھی شدت کے ساتھ دوچار ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مادی ترقی مادی تعلیم کے حصول کا منطقی نتیجہ ہے، لیکن اقدارِ حیات کی ترقی میں ایک اور چیز بھی ناگزیر ہے جس کو تربیت کہتے ہیں۔ یہ انسان کی ایسی ضرورت ہے جو مہد یعنی ماں کی گود سے شروع ہوتی ہے اور یہ وہ کیفیت ہے جس کی عدم موجودگی مادی تعلیم کے باوجود انسان کو اس سطح پر لے آئی ہے جہاں ترقی علومِ مادی کا عملی مقصد مخالفین کی حیات کو صفحۂ ہستی سے یکسر مٹا دینا ہے۔ دُنیا کی بڑی طاقتوں کے وہ منصوبے اس بات کی دلیل ہیں جو بتدریج سائنسی تجربات کی شکل میں سامنے آرہے ہیں۔ ان کے ذریعے کوشش کی جا رہی ہے کہ ایسے ہتھیار ایجاد کریں جن کا استعمال کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ انسانوں کو نیست و نابود کر دے۔

ان تمام حالات کے پیشِ نظر تربیت انسان کی ضرورت دن بدن زیادہ محسوس ہوتی جا رہی ہے۔ کتاب ہذا "آئین تربیت" ایران کے فاضل مصنف جناب ابراہیم امینی نجف آبادی

کی ایک نہایت عمدہ سعی ہے جس میں تربیتِ انسان کے موضوع پر اُسوۂ معصومین علیہم السّلام کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم نے سطورِ بالا میں عرض کیا ہے، تربیت کا پہلا مدرسہ آغوشِ مادر ہے۔ اس سلسلے میں شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

سیرتِ فرزند ہا از اُمہات　　　جوہرِ صدق و صفا از اُمہات

کتاب ہذا میں مندرجہ ذیل امور پر خصوصیت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے جو ضروریاتِ تربیت میں شامل ہیں :۔

۱۔ جسمانی اور نفسانی دونوں میدانوں میں تربیت کنندہ کی اُمورِ تربیت سے کما حقّہٗ واقفیت۔

۲۔ ہدفِ تربیت سے واقفیت۔

۳۔ تربیت کے لیے جن اقدار و اوضاع کی ضرورت ہوتی ہے، ان سے کما حقّہٗ واقفیت۔

فاضل مؤلف نے یہ سب کچھ سیرتِ معصومینؑ کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ ہم ان کی اس کاوش کو اُردو زبان میں بطور ترجمہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ اُمید واثق ہے کہ یہ کتاب والدین اور اساتذہ کے لیے تربیتِ اولاد و شاگردان میں ایسی معاون ثابت ہو گی جس سے دورِ مادیت میں قوم کو با اقدار انسان مل سکیں گے۔

قارئین کرام سے استدعا ہے کہ کتاب ہذا کے مطالعے کے بعد اپنی قیمتی آراء سے ادارہ مصباح الہدیٰ پبلیکیشنز کو ضرور مطلع فرمائیں۔

طلب گار تعاون :

ڈائریکٹر مصباح الہدیٰ پبلیکیشنز

لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کچھ ترجمے کے بارے میں

ترجمہ کیسا ہو؟ اس کی شرائط کیا ہیں؟ اس پر بہت کچھ کہا گیا ہے، کہا جا رہا ہے گا اور کہا جاتا رہنا چاہیے۔

عموماً دو طریقے ترجمے کے لیے رائج ہیں،

(۱) لفظی ترجمہ

(۲) آزاد اور مفہومی ترجمہ

ان دونوں کی اپنی اپنی خوبیاں ہیں، دونوں کے حامیوں کے اپنے اپنے دلائل ہیں اور دونوں کے لیے موجود وزنی دلائل کی اپنے اپنے مقام پر اہمیت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ہمیں یہاں صرف — زیر نظر ترجمے کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔

"آئین تربیت" کے خاص اسلوب نگارش اور ترجمے کے قارئین پر نظر نے ہم سے ایک جداگانہ سے طرز ترجمہ کا تقاضا کیا سو ہم نے:

- بعض مقامات پر لفظی ترجمہ ضروری سمجھا اور بعض عبارتوں کو فقط اردو کا لباس پہنا کر آپ تک پہنچا دیا ہے۔
- بعض — بلکہ بہت سے مقامات پر آزاد ترجمے کی روش اپنائی ہے اور مفہوم عبارت منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔
- بعض مقامات پر ان دونوں صورتوں سے کام نہیں لیا بلکہ "مقصود" پہنچانے کی کوشش

کی ہے کیونکہ وہاں "ترجمے" کی صورت میں "مقصود" منتقل ہو جاتا اور مطلوب و مقصود کو بہر حال لفظ اور مفہوم پر فوقیت حاصل ہے۔

جیسے اردو پر یورپی زبانوں کے اثرات بے پناہ ہیں اسی طرح فارسی جیسی وسیع زبان بھی اپنا دامن اس سے بچا نہیں سکی۔ بہت سے انگریزی لفظ اور اصطلاحات فارسی لہجے کا رنگ اختیار کرکے فارسی میں داخل ہو گئے ہیں یا یوں کہا جائے کہ "فارسیا" لیے گئے ہیں۔ اسی طرح فارسی کی اپنی اصطلاحات ہیں اور ہمارے ہاں اپنی اصطلاحات —— ان پہلوؤں کو ترجمہ کرتے ہوئے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ متبادل اصطلاحات لکھی گئی ہیں جہاں جہاں ضروری محسوس ہوا متبادل انگریزی اصطلاحات بھی لکھ دی گئی ہیں۔

اصل کتاب میں قرآنی آیات اور روایات کی عربی عبارات نہایت ہی کم درج کی گئی ہیں ترجمہ کرتے ہوئے خاص طور پر قرآنی آیات اپنے اصل متن کے ساتھ درج کر دی گئی ہیں اور بہت سے مقامات پر روایات کی عربی عبارات بھی اصل متن کو دیکھ کر لکھ دی گئی ہیں۔

کوشش کی گئی ہے کہ عبارت رواں، سادہ اور عام فہم ہو لیکن پھر بھی یہ ترجمہ ہی ہے —— تالیف یا تصنیف نہیں لہذا کہیں کہیں بوجھل پن کا احساس ہو تو قارئین معاف فرمائیں۔

کتاب چونکہ تربیتی ہے لہذا بہت سے مطالب تکراری ہیں اور یہ تربیت کا تقاضا بھی ہے اور خاصہ بھی —— ترجمہ کرتے ہوئے اس حوالے سے تصرف سے دامن بچانے کی کوشش کی گئی ہے۔

مذکورہ امور میں سے بنیادی امور پر خود صاحب کتاب یعنی حضرت آیت ا . . . . ابراہیم امینی سے تبادلہ خیال کے بعد ہم آہنگی پا کر ہمیں کچھ اور بھی اطمینان ہے۔

تنقید اور آراء کے لیے بہر حال ہم خندہ پیشانی سے منتظر ہیں —— کیوں کہ کمال کا راستہ انہی وادیوں سے ہو کر گزرتا ہے۔

مترجمین

پیشگفتار

تعلیم اور تربیت میں فرق ہے۔ تعلیم کا معنی ہے آموزش، سکھانا یا کسی کو کوئی مطلب یاد کرانا۔ جب کہ تربیت کا مطلب ہے شخصیت کی تعمیر اور پرورش۔ تربیت کے ذریعے سے اپنی پسند کے مطابق افراد ڈھالے اور تیار کیے جا سکتے ہیں اور نتیجتاً معاشرے کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

ضروری ہے کہ تربیت ایک سوچے سمجھے اور دقیق پروگرام کے تحت انجام پائے تاکہ کامیابی کے ساتھ نتیجہ بخش ثابت ہو۔ تربیت میں صرف وعظ و نصیحت اور ڈرانا دھمکانا ہی کافی نہیں بلکہ چاہیے کہ تمام حالات اور شرائط مقصد کے مطابق فراہم ہوں۔ تاکہ مقصود حاصل ہو سکے۔ تربیت کے لیے چند چیزیں ضروری ہیں۔

۱۔ چاہیے کہ مربی اس شخص کو اچھی طرح پہچانتا ہو کہ جس کی اسے تربیت کرنا ہے۔ اس کی خصوصیات اور اس کے جسمانی اور نفسیاتی رموز سے آگاہ ہو۔

۲۔ مربی کی نگاہ میں تربیت کا کوئی ہدف ہونا چاہیے۔ یعنی اس کی نظر میں یہ ہونا چاہیے کہ وہ کیسا انسان بنانا چاہتا ہے۔

۳۔ تربیت کے لیے مربی کے پاس کوئی پروگرام ہونا چاہیے۔ یعنی اسے جاننا چاہیے کہ جیسی شخصیت وہ پروان چڑھانا چاہتا ہے اس کے لیے کن حالات اور شرائط کی ضرورت ہے لہذا ان سب کو اُسے فراہم کرنا چاہیے اور پورے غور و خوض سے کام لینا چاہیے پھر یہ ممکن ہو سکتا ہے کسی مثبت نتیجہ کا انتظار کرے۔

تربیت کے لئے بہترین زمانہ بچپن کا ہے۔ کیونکہ بچے نے ابھی پوری شکل اختیار نہیں کی ہوتی اور ہر طرح کی تربیت کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ یہ حساس اور اہم ذمہ داری پہلے مرحلہ پر ماں باپ کے ذمے ہے۔ لیکن تربیت ایک سہل اور سادہ سا کام نہیں ہے۔ بلکہ ایک انتہائی ظریف وحساس فن ہے کہ جس کے لیے کام کی شناخت، کافی اطلاعات، تجربہ، بردباری اور حوصلہ وعزم کی ضرورت ہے۔ یہ بات باعث افسوس ہے کہ اکثر ماں باپ فن تربیت سے آشنا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر بچوں کی کسی حساب شدہ اور منظم پروگرام کے تحت پرورش نہیں ہوتی بلکہ وہ گویا خودرو پودوں کی طرح پروان چڑھتے ہیں۔

مشرق ومغرب کے ترقی یافتہ کہلانے والے ممالک میں تربیت کے مسئلے کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں بہت تحقیقات کی ہیں، بہت سی سودمند کتابیں لکھی ہیں اور ان کے ہاں اس فن کے بہت سے ماہرین موجود ہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں زندگی کے اس اہم مسئلہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ البتہ چند ایک ماہرین موجود ہیں اور تھوڑی بہت کتابیں بھی ہیں لیکن اتنا کچھ کفایت نہیں کرتا۔ دوسری زبانوں سے اس ضمن میں بہت سی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا ہے جو سب کی دسترس میں ہیں۔ لیکن ان مشرقی اور مغربی کتابوں میں دو بڑے نقص موجود ہیں۔

پہلا عیب یہ ہے کہ ان میں انسان کو فقط جسمانی حوالے اور اس کی دنیاوی زندگی کے حوالے سے دیکھا گیا ہے اور بحث وتحقیق کی گئی ہے۔

اور روحانی سعادت وبدبختی اور اخروی زندگی سے یا غفلت برتی گئی ہے یا اعراض کیا گیا ہے۔

مغرب میں تربیت کے لیے اس کے علاوہ کوئی ہدف نہیں کہ بچے کی جسمانی طاقت اس کی حیوانی قوتوں، اعصاب اور مغز کو صحیح طریقے سے پروان چڑھایا جائے تاکہ جس وقت وہ بڑا ہو تو آرام سے زندگی گزار سکے اور مادی فوائد اور حیوانی لذتوں سے بہرہ مند ہو سکے اور ان کتابوں میں اگر اخلاق کے بارے میں گفتگو ہوتی بھی ہے تو وہ بھی اسی دنیاوی زندگی اور مادی مفادات کے حصول سے مربوط ہے۔ ان کتابوں میں روحانی کمالات یا نقائص کا ذکر نہیں۔

اخروی خوش بختی یا بدبختی کا تذکرہ نہیں اور مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے ان میں اخلاقی اور روحانی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں۔

دوسرا عیب یہ ہے کہ مغرب والوں کے نزدیک تربیتی مسائل کا انحصار تجربات اور شماریات پر ہے۔ دین کا ان پر کوئی رنگ نہیں۔ لہذا یہ کتابیں مسلمانوں کے نزدیک مفید، جامع اور کامل نہیں ہو سکتیں کیوں کہ ایک مسلمان کی نظر میں انسان کے دو پہلو ہیں۔ ایک جسم اور دوسرا روح۔ ایک دنیاوی زندگی اور دوسری اخروی زندگی۔ لہذا راقم نے فیصلہ کیا کہ اس سلسلے میں مطالعہ اور تحقیق کی جائے اور پھر اپنے نتیجہ کو تحریر کی صورت میں طالبین کی خدمت میں پیش کیا جائے اس کتاب کی تحریر کے لیے راقم کا اصلی ماخذ قرآن اور کتب حدیث و اخلاق ہیں۔ البتہ بچے کی تربیت سے متعلق اور نفسیات سے متعلق دسیوں کتابیں جو فارسی اور عربی زبان میں ترجمہ ہو چکی ہیں اور حفظان صحت سے متعلق کتب سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ ایرانی علماء نے بچے کی تربیت کے متعلق جو کتابیں لکھی ہیں ان سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں راقم کے اپنے بھی کچھ تجربات ہیں۔ امید ہے کہ یہ ناچیز پیش کش تربیت کرنے والوں کے مفید ثابت ہو گی اور اسلام اور مسلمانوں کے لیے سودمند قرار پائے گی۔

ابراہیم امینی نجف آبادی
حوزہ علمیہ قم
بہمن ماہ ۱۳۵۸ھ
جنوری ۱۹۸۰ء

ماں باپ کی ذمہ داری

اسلام کی نظر میں ماں باپ کا مقام بہت بلند ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اکرمؐ نے اور آئمۂ معصومین علیہم السلام نے اس بارے میں بہت تاکید کی ہے اور اس سلسلے میں بہت سی آیات اور روایات موجود ہیں۔ ماں باپ سے حسن سلوک کو بہترین عبادات میں سے شمار کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَقَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعۡبُدُوۡۤا اِلَّاۤ اِیَّاہُ وَبِالۡوَالِدَیۡنِ اِحۡسَانًا۔

اور تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ صرف اسی کی عبادت کرو اور والدین کے ساتھ حسن سلوک اختیار کرو۔ (بنی اسرائیل۔ ۲۳)

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

تین چیزیں بہترین عمل ہیں :

(۱) پابندیٔ وقت کے ساتھ نماز پنجگانہ کی ادائیگی،

(۲) ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک اور

(۳) راہِ خدا میں جہاد۔

(اصولِ کافی ج ۲ ص ۱۵۸)

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ماں باپ کو یہ مرتبہ کیوں اور کیوں کر ملا ہے ؟ کیا اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ مقام بلا وجہ عطا کر دیا ہے یا ان کے کسی قیمتی عمل کی وجہ سے ؟ ماں باپ بچے کے لیے کون سا بڑا کام انجام دیتے ہیں کہ جس کے باعث وہ اس قدر مقام و خدمت کے لائق قرار

پاتے ہیں۔ باپ نے ایک جنسی جذبے کی تسکین کے لیے ایک خلیہ حیات (LIFE CELL) رحم مادر میں منتقل کیا ہے۔ یہ سیل ماں کی جانب سے ایک اور سیل کے ساتھ مل کر مرکب ہو جاتا ہے جو ایک نئے وجود کے طور پر رحم مادر میں پرورش پاتا ہے۔ جو نو ماہ کے بعد ایک ننھے منے بچے کی صورت میں زمین پر قدم رکھتا ہے۔ ماں اُسے دودھ اور دوسری غذا دیتی ہے۔ اُسے کبھی صاف کرتی ہے کبھی کپڑے بدلتی ہے اس کی تری اور خشکی کا خیال رکھتی ہے ان مراحل میں باپ خاندان کے اخراجات پورے کرتا ہے اور اُن کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ کیا ماں باپ کی ان کاموں کے علاوہ کوئی ذمہ داری نہیں؟ کیا انہی کاموں کی وجہ سے ماں باپ کو اس قدر بلند مقام حاصل ہے؟ کیا صرف ماں باپ اپنی اولاد پر حق رکھتے ہیں اور اولاد اپنے ماں باپ پر کوئی حق نہیں رکھتی؟ میرے خیال میں ایسا یک طرفہ حق تو کوئی بھی قبول نہیں کرتا۔ احادیثِ معصومین علیہم السلام میں ایسے حقوقِ اولاد بھی بیان فرمائے گئے ہیں کہ جن کی ادائیگی ماں باپ کی ذمہ داری ہے۔ ان میں سے چند احادیث ہم ذیل میں ذکر کرتے ہیں:

۱۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"چنانچہ جس طرح تیرا باپ تجھ پر حق رکھتا ہے تیری اولاد بھی تجھ پہ حق رکھتی ہے"۔

(مجمع الزوائد، ج ۸، ص ۱۴۶)

۲۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"جیسے اولاد اپنے ماں باپ کی نافرمانی کی وجہ سے عاق ہو جاتی ہے اُسی طرح سے ممکن ہے ماں باپ بھی اپنے فریضے کی عدم ادائیگی کے باعث اولاد کی طرف سے عاق ہو جائیں"۔ بحار، ج ۱۰، ص ۹۲

۳۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"خدا ایسے ماں باپ پر لعنت کرے جو اپنی اولاد کے عاق ہونے کا باعث بنیں"۔ (مکارم الاخلاق، ص ۵۱۸)

۴۔ امام سجاد علیہ السلام نے فرمایا:

"تیری اولاد کا حق یہ ہے کہ تو اس پر غور کر کہ وہ بری ہے یا اچھی ہے بہرحال

تجھ سے وجود میں آئی ہے اور اس دنیا میں وہ تجھ سے منسوب ہے اور تیری ذمہ داری ہے کہ تو اسے ادب سکھا، اللہ کی معرفت کے لیے اس کی راہنمائی کر اور اطاعت پروردگار میں اس کی مدد کر۔ تیرا سلوک اپنی اولاد کے ساتھ ایسے شخص کا سا ہونا چاہیے کہ جسے یقین ہوتا ہے کہ احسان کے بدلے میں اسے اچھی جزا ملے گی اور بدسلوکی کے باعث اسے سزا ملے گی۔"

(مکارم الاخلاق ص ۴۸۴)

۵۔ امیر المومنین علی علیہ السلام نے فرمایا:
"کہیں ایسا نہ ہو کہ تیری وجہ سے تیرا خاندان اور تیرے اقربا بدبخت ترین لوگوں میں سے ہو جائیں۔" (غرر الحکم ص ۸۰۲)

۶۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔
"جو کوئی بھی یہ چاہتا ہو کہ اپنی اولاد کو عاق ہونے سے بچائے اسے چاہیے کہ نیک کاموں میں اس کی مدد کرے۔" (مجمع الزوائد ج ۸ ص ۱۴۶)

۷۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
"جس کسی کے ہاں بیٹی ہو اور وہ اسے خوب ادب و اخلاق سکھائے، اسے تعلیم دینے کے لیے کوشش کرے، اس کے لیے آرام و آسائش کے اسباب فراہم کرے تو وہ بیٹی اسے دوزخ کی آگ سے بچائے گی۔"

(مجمع الزوائد۔ ج ۸۔ ص ۱۵۸)

سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:
یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ۔

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے بچاؤ کہ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔

(سورہ تحریم، آیۃ ۶)

بچے نے جب کہ ابھی وضع زندگی کے بارے میں کوئی راستہ متعین نہیں کیا ہوتا اور سعادت وبدبختی ہر دو کی اس میں قابلیت ہوتی ہے اُس سے ایک کامل انسان بھی بنایا جا سکتا ہے اور ایک گھٹیا درجے کا حیوان بھی۔ ہر انسان کی سعادت اور بدبختی اس کی کیفیت تربیت سے وابستہ ہے اور اس عظیم کام کی ذمہ داری ماں باپ کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے۔ اصولاً ماں باپ کا معنیٰ یہی ہے۔ ماں باپ یعنی انسان ساز اور کمال بخشنے والے دو وجود۔ عظیم ترین خدمت کہ جو ماں باپ اپنی اولاد کے لیے انجام دے سکتے ہیں وہ یہ ہے اُسے خوش اخلاق، مہربان، انسان دوست، خیر خواہ، حریت پسند، شجاع، عدالت پسند، دانا، درست کام کرنے والا، شرافت مند، با ایمان، فرض شناس، سالم محنتی، تعلیم یافتہ، اور خدمت گزار بننے کی تربیت دیں۔

ماں باپ کو چاہیے کہ اپنے بچے کو اس طرح سے ڈھالیں کہ وہ دنیا میں بھی سعادت مند ہو اور آخرت میں بھی سُرخرو۔ ایسے ہی افراد درحقیقت ماں باپ کے عظیم مرتبے پر فائز ہو سکتے ہیں نہ وہ کہ جنہوں نے ایک جنسی جذبے کے تحت اولاد کو وجود بخشا ہے اور اسے بڑا ہونے کے لئے چھوڑ دیا ہے کہ وہ خود بخود تربیت پائے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

باپ جو اپنی اولاد کو بہترین چیز عطا کر سکتا ہے وہ اچھا ادب اور نیک تربیت ہے۔ (مجمع الزوائد۔ ج ۸۔ ص ۱۵۹)

خصوصاً ماں کی اس سلسلے میں زیادہ اہمیت ہے۔ حتیٰ کہ دورانِ حمل بھی اس کی خوراک اور طرزِ عمل بچے کی سعادت اور بدبختی پر اثر انداز ہوتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

خوش نصیب وہ ہے کہ جس کی خوش بختی کی بنیاد ماں کے پیٹ میں پڑی ہو اور بدبخت وہ ہے جس کی سعادت کا آغاز شکم مادر سے ہوا ہو۔

(بحار الانوار۔ ج ۷۷۔ ص ۱۱۵-۱۳۳)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

الجنۃ تحت اقدام الامہات۔ (مستدرک۔ ج ۲۔ ص ۶۲۸)

جو ماں باپ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ نہیں کرتے بلکہ اپنی رفتار و کردار سے انہیں منحرف بنا دیتے ہیں وہ بہت بڑے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں ایسے ماں باپ سے پوچھنا چاہیے کہ کیا اس بے گناہ بچے نے تقاضا کیا تھا کہ تم اسے وجود بخشو کہ اب وجود میں لانے کے بعد اسے تم نے گائے کے بچھڑے کی طرح چھوڑ دیا ہے۔ اب جب کہ تم اس کے وجود کا باعث بن گئے ہو تو شرعاً اور عقلاً تم ذمہ دار ہو کہ اس کی تعلیم و تربیت کے لیے کوشش کرو۔ لہٰذا تعلیم و تربیت ہر ماں باپ کی عظیم ترین ذمہ داریوں میں سے ایک ہے۔

اس کے علاوہ ماں باپ معاشرے کے سامنے بھی جواب دہ ہیں۔ آج کے بچے ہی کل کے مرد اور عورت ہیں۔ کل کا معاشرہ انہیں سے تشکیل پاتا ہے۔ آج جو سبق سیکھیں گے کل اُسی پر عمل کریں گے۔ اگر ان کی تربیت درست ہوگئی تو کل کا معاشرہ ایک کامل تر اور صالح معاشرہ ہوگا اور اگر آج کی نسل نے غلط پروگرام کے تحت اور نادرست طور پر پرورش پائی تو ضروری ہے کہ کل کا معاشرہ فاسد تر اور بدتر قرار پائے۔ کل کی سیاسی، علمی، اور سماجی شخصیات انہیں سے وجود میں آئیں گی۔ آج کے بچے کل کے ماں باپ ہیں۔ آج کے بچے کل کے مربی قرار پائیں گے۔ اور اگر انہوں نے اچھی تربیت پائی ہوگی تو اپنی اولاد کو بھی ویسا ہی بنا لیں گے اور اسی طرح اس کے برعکس۔ لہٰذا اگر ماں باپ چاہیں۔ تو آئندہ آنے والے معاشرہ کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ اور اسی طرح اگر چاہیں تو اسے برائی اور تباہی سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔ اس طرح سے ماں باپ معاشرے کے حوالے سے بھی ایک اہم ذمہ داری کے حامل ہیں۔ اگر وہ اپنے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے لیے کوشش کریں تو انہوں نے گویا معاشرے کی ایک عظیم خدمت سرانجام دی ہے اور وہ اپنی زحمتوں کے صلے میں اجر کے حقدار ہیں اور اگر وہ اس معاملے میں غفلت اور سہل انگاری سے کام لیں تو نہ صرف اپنے بے گناہ بچوں کے بارے میں بلکہ پورے معاشرے کے لیے خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں اور یقینی طور پر بارگاہ الٰہی میں جواب دہ ہوں گے۔

تعلیم و تربیت کے موضوع کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔ ماں باپ اولاد کی تربیت کے لیے جو کوشش کرتے ہیں اور جو مصیبتیں اٹھاتے ہیں وہ سینکڑوں استادوں، انجینئروں، ڈاکٹروں اور عالموں کے کاموں پہ بھاری ہیں۔ یہ ماں باپ ہیں جو انسان کامل پروان چڑھاتے ہیں اور ایک

لائق و دیندار استاد، ڈاکٹر اور انجینئر وجود میں لاتے ہیں۔

خاص طور پر مائیں بچوں کی تربیت کے بارے میں زیادہ ذمہ داری رکھتی ہیں اور تربیت کا بوجھ ان کے کندھوں پر رکھا گیا ہے۔ بچے اپنے بچپن کا زیادہ عرصہ ماؤں کے دامن میں ہی گزارتے ہیں۔ اور آئندہ زندگی کے رخ کی بنیاد اسی زمانے میں پڑتی ہے۔ لہٰذا افراد کی خوشبختی اور بدبختی اور معاشرے کی ترقی اور تنزل کی کنجی ماؤں کے ہاتھ میں ہے۔ عورت کا مقام وکالت، وزارت، اور افسری میں نہیں یہ سب چیزیں مقام مادر سے کہیں کم تر ہیں، مائیں کامل انسانوں کی پرورش کرتی ہیں اور صالح وزیر، وکیل، افسر اور استاد پروان چڑھاتی ہیں اور معاشرے کو عطا کرتی ہیں۔

جو ماں باپ پاک، صالح اور قیمتی بچے پروان چڑھاتے ہیں نہ صرف یہ کہ وہ اپنی اولاد اور معاشرے کی خدمت کرتے ہیں بلکہ خود بھی اسی جہان میں ان کے وجود کی خیر و خوبی سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ نیک اولاد ماں باپ کی سرفرازی کا سرمایہ ہوتی ہے اور ناتوانی کے زمانے میں ان کا سہارا ہوتی ہے۔ اگر ماں باپ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے کوشش کریں تو اسی دنیا میں اس کا نتیجہ دیکھیں گے اور اگر اس معاملے میں غفلت اور سہل انگاری سے کام لیں تو اسی دنیا میں اس کا ضرر بھی دیکھ لیں گے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا،

بُری اولاد انسان کے لیے بڑی مصیبتوں میں سے ہے۔ (غرر الحکم۔ ص ۱۸۰)

حضرت علی علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا ہے:

بُری اولاد ماں باپ کی آبرو گنوا دیتی ہے اور وارثوں کو رسوا کر دیتی ہے۔

(غرر الحکم ۸۰)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،

خدا رحمت کرے ان ماں باپ پر جنہوں نے اپنی اولاد کو تربیت دی کہ وہ ان کے ساتھ حسن سلوک کریں۔

(مکارم الاخلاق۔ ص ۵۱۷)

لہذا جو ماں باپ بن جاتے ہیں ان کے کندھے پر ایک بھاری ذمہ داری آن پڑتی ہے اور یہ ذمہ داری خدا کے حضور بھی مخلوق کے روبرو بھی اور اولاد کے سامنے بھی ہے۔ اگر انہوں نے اپنی ذمہ داری کو صحیح طریقے سے ادا کردیا تو ان کے لئے ایک عظیم خدمت انجام دی ہے، وہ دنیا و آخرت میں اس کا نیک صلہ پائیں گے۔ لیکن اگر انہوں نے اس معاملے میں کوتاہی کی تو خود بھی نقصان اٹھائیں گے اور اپنی اولاد اور معاشرے کے ساتھ بھی خیانت اور ناقابل بخشش گناہ کے مرتکب ہوں گے۔

تربیت کرنے والوں کی آگاہی اور باہمی تعاون

بچے کی تربیت کوئی ایسی سادہ اور آسان سی بات نہیں ہے کہ جسے ہر ماں باپ آسانی سے انجام دے سکیں۔ بلکہ یہ کام بہت سی باریکیوں اور ظرافتوں کا حامل ہے۔ اس میں سینکڑوں بال سے باریک تر نکات موجود ہیں۔ مربی کا تعلق بچے کی روح سے ہوتا ہے۔ وہ روحانی، نفسیاتی علمی اور تجرباتی پہلوؤں سے آگاہی کے بغیر اپنی ذمہ داری بخوبی انجام نہیں دے سکتا۔ بچے کی دنیا ایک اور ہی دنیا ہے اور اُس کے افکار ایک اور ہی طرح کے افکار ہیں اس کی سوچوں کا انداز مختلف ہوتا ہے، جس کا بڑوں کے طرزِ تفکر سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ بچے کی روح نہایت ظریف اور حساس ہوتی ہے اور ہر نقش سے خالی ہوتی ہے اور ہر طرح کی تربیت کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوتی ہے۔ بچہ ایک ایسا چھوٹا سا انسان ہوتا ہے، جس نے ابھی تک ایک مستقل شکل اختیار نہیں کی ہوتی جب کہ ہر طرح کی شکل قبول کرنے کی اس میں صلاحیت ہوتی ہے۔ بچے کے مربی کو انسان شناس اور بالخصوص بچوں کا شناسا ہونا چاہیے۔ تربیت کے اسرار و رموز پر اس کی نظر ہونی چاہیے۔ انسانی کمالات اور نقائص پر اُس کی نگاہ ہونی چاہیے۔ اس کے اندر احساس ذمہ داری بیدار ہونا چاہیے اور اسے اپنے کام سے دلچسپی بھی ہونا چاہیے۔ اُسے صابر اور حوصلہ مند ہونا چاہیے اور مشکلات سے ہراساں نہیں ہونا چاہیئے۔ علاوہ ازیں تربیت کے قوانین سو فیصد کلی نہیں ہوتے کہ جنہیں ہر جگہ پر اور ہر کسی کے لیے قابل عمل قرار دیا جا سکے۔ بلکہ ہر بچے کی اپنی جسمانی ساخت اور عقلی صلاحیتوں کے اعتبار سے اپنی ہی خصوصیات ہوتی ہیں لہٰذا اس کی تربیت اس کی جسمانی ساخت، عقلی قوتوں، حالات اور ماحول کے تقاضوں کی مناسبت

سے ہونی چاہیے۔ ماں باپ کو چاہیے کہ بچے کی جسمانی ساخت کا صحیح طریقے سے جائزہ لیں اور اسی کے پیش نظر اس کی تربیت کریں ورنہ ممکن ہے ان کی کوششوں کا وہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکے جو ان کی خواہش ہے۔

مرد اور عورت کو چاہیے کہ ماں باپ بننے سے پہلے بچے کی تعلیم و تربیت کے طریقے سے آگاہی حاصل کریں۔ اس کے بعد بچے کی پیدائش کے لیے اقدام کریں، کیوں کہ بچے کی تربیت کا مرحلہ اس کی ولادت سے بلکہ اس سے بھی پہلے شروع ہو جاتا ہے۔ اس حساس عرصے میں بچے کی لطیف اور حساس طبیعت کوئی شکل اختیار کرتی اور اس کے اخلاق، کردار، عادات حتیٰ کہ افکار کی بنیاد پڑتی ہے۔

یہ صحیح نہیں ہے کہ ماں باپ اس حساس عرصے میں غفلت سے کام لیں اور تعلیم و تربیت کو آئندہ پر ٹال دیں۔ یعنی تعلیم و تربیت کو اس وقت پر اٹھا نہ رکھیں کہ جب بچہ اچھے یا بُرے اخلاق و کردار یا اچھی یا بُری عادتوں کے بارے میں تقریباً ایک مزاج اختیار کر چکا ہو۔ کیونکہ ابتدائی مراحل میں تربیت عادتوں کے تبدیل کرنے کی نسبت کہیں آسان ہے۔ عادت کا تبدیل کرنا اگرچہ ناممکن نہیں تاہم اس کے لیے بہت زیادہ آگاہی، صبر، حوصلے اور کوشش کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ سب تربیت کرنے والوں کے بس کی بات نہیں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں،

اَصْعَبُ السِّیَاسَاتِ نَقْلُ الْعَادَاتِ

"مشکل ترین سیاست لوگوں کی عادات کو تبدیل کرنا ہے"، (غررالحکم ص ۱۸۱)

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

لِلْعَادَةِ عَلٰی کُلِّ اِنْسَانٍ سُلْطَانٌ -

عادت انسان پر مسلط ہو جاتی ہے۔ (غرر الحکم۔ ص ۵۸۰)

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَلْعَادَةُ طَبْعٌ ثَانٍ"

"عادت فطرت ثانیہ بن جاتی ہے" (غرر الحکم۔ ص ۔ ۲۶)

ترک عادت اس قدر مشکل ہے کہ اسے بہترین عبادتوں میں سے شمار کیا گیا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اَفضَلُ العِبَادَۃ غَلَبَۃُ العَادَۃِ"

"بری عادت پہ غلبہ پالینا افضل ترین عبادتوں میں سے ہے" (غرر الحکم۔ص ۱۷۶)

بچے کو راہ کمال پر تربیت دینے کے لیے ایک مسئلہ یہ بھی اہم ہے کہ ماں باپ اور دیگر تمام مربیوں کے درمیان فکری اور عملی طور پہ تربیت کے تمام پروگراموں میں اور ان کے اجزا کی کیفیت میں ہم آہنگی اور تفاہم موجود ہو۔ اگر ماں باپ اور دیگر لوگ کہ جن کا بچے کی تربیت میں عمل دخل ہو مثلاً دادا اور دادی وغیرہ ان کے درمیان تربیتی پروگراموں میں اتفاق اور ہم آہنگی موجود ہو اور ان کے اجزا میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں تو وہ مطلوب نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں اور ایک اچھا اور ممتاز بچہ پروان چڑھا سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی ایک بھی تربیت کے بارے بے اعتنا یا تربیتی امور میں خلاف سلیقہ رکھتا ہو تو مراد حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ تربیت کے مسئلے میں مکمل یقین اور ہم آہنگی ضروری ہے۔

بچے کو اپنے فریضے سے آگاہی ہونا چاہیے۔ جب ماں باپ کچھ اور کہہ رہے ہیں اور دادا دادی اور تو بچہ حیران و پریشان ہو جاتا ہے۔ اسے سمجھ نہیں آتی کہ کیا کرے۔ بالخصوص اگر ان میں سے ہر کوئی اپنے نظریے پر زور دے رہا ہو۔ ایسی صورت میں نہ فقط یہ کہ اچھا نتیجہ نہیں نکلتا بلکہ ایسا ہونا تربیت میں نقص کا باعث بھی بن سکتا ہے۔ تربیت کی بڑی مشکلات میں سے یہ ہے کہ بچے کے بارے میں باپ کچھ فیصلہ کرے اور ماں یا دادی اس میں دخالت کر کے اس کے برخلاف عمل کرے یا پھر اس کے الٹ مسئلہ ہو۔ مربیوں کے درمیان ایسے اتفاق اور ہم آہنگی کی ضرورت ہے کہ جس سے بچہ واضح طور پہ یہ سمجھ سکے کہ اُسے کیا کرنا ہے اور اس کی خلاف ورزی کا خیال اس کے ذہن میں نہ آئے۔

کبھی یوں ہوتا ہے کہ باپ ایک خوش اخلاق اور اچھا تربیت یافتہ بچہ پروان چڑھانا چاہتا ہے لیکن ماں بداخلاق اور بے تربیت ہوتی ہے اسے تربیت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور کبھی معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ یہ مشکل بہت سے گھرانوں میں نظر آتی ہے۔ ایسے

خاندانوں میں پرورش پانے والے بچے عموماً اچھی اور صحیح تربیت کے حامل نہیں ہوتے کیونکہ ایک تربیت یافتہ اور صالح فرد کی تربیت اس کی ناصالح بیوی کے سبب بے اثر ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں صحیح تربیت بہت مشکل امر بن جاتا ہے البتہ ایسی دشواریوں کا یہ مطلب نہیں کہ ہم تربیت کی ذمہ داری سے دست بردار ہو جائیں۔

ایسی صورت میں تربیت کی ذمہ داری اور بھی سوا ہو جاتی ہے۔ چاہیے کہ ایسی صورت میں اولاد کی تربیت کے بارے میں زیادہ توجہ دی جائے۔ اپنے اخلاق و کردار کی پوری طرح اصلاح کی جائے اور بچوں کی زیادہ دیکھ بھال سے کام لیا جائے اور ان سے زیادہ سے زیادہ مانوسیت پیدا کی جائے۔ اچھے کام اور خوش رفتاری کے ذریعے بچوں کی توجہ اپنی طرف جذب کی جائے اور ان کے لیے بہترین نمونہ عمل بن جایا جائے۔ اپنے بچوں سے تفاہم پیدا کیا جائے۔ اچھائی برائی اور نیکی بدی کا مفہوم ان کے سامنے کامل طور پر واضح کیا جائے۔ ایسا عمل کیا جائے کہ بچہ خود بخود اچھے اور برے اخلاق کے درمیان تمیز کر سکے اور برائیوں سے متنفر ہو جائے۔ اگر مربی عاقل، مدبر، صابر اور حوصلہ مند ہو تو کسی حد تک اپنے ہدف تک پہنچ سکتا ہے اور اپنی بیوی کی غلط تربیت اور بدآموزی کے اثرات زائل کر سکتا ہے۔ بہرحال یہ ایک مشکل اور اہم کام ہے لیکن اس کے علاوہ چارہ بھی نہیں۔

ایک دانشور کا قول ہے،

وہ خاندان کہ جس میں ماں اور باپ بچے کی تربیت کے بارے میں ہم فکر ہیں اور اپنے کردار اور رفتار کو اس کے مطابق ڈھالتے ہیں تو بچے کے اعصاب کے لیے مناسب ماحول مہیا ہو جاتا ہے۔ خاندان ایک ایسا چھوٹا سا معاشرہ ہے کہ جس میں بچے کی اخلاقی خصوصیات ایک خاص صورت اختیار کرتی ہیں۔ وہ خاندان کہ جس کے افراد ایک دوسرے سے دوستانہ برتاؤ کرتے ہیں اس کے بچے عموماً متین، خوددار اور انصاف پسند ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ

گھر کہ جس میں ماں باپ کے درمیان روز روز کی نوک جھونک اور تو تکرار رہتی ہے اس کے بچے کج اخلاق، بہانہ ساز اور غصیلے ہوتے ہیں۔[1]

---

[1] روان شناسی تجربی کودک ص ۱۹۱

تربیت — عمل سے نہ کہ زبان سے

بہت سے ماں باپ ایسے ہیں جو تربیت کے لیے وعظ و نصیحت اور زبانی امر و نہی کافی سمجھتے ہیں۔ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ جب وہ بچے کو امر و نہی کر رہے ہوتے ہیں اُسے زبانی سمجھا بُجھا رہے ہوتے ہیں تو گویا وہ تربیت میں مشغول ہیں اور باقی امورِ حیات میں وہ تربیت سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے ماں باپ ننھے بچے کو تربیت کے قابل نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ ابھی بچہ ہے کچھ نہیں سمجھ سکے گا۔ جب بچہ رشد و تمیز کی عمر کو پہنچتا ہے تو وہ تربیت کا آغاز کرتے ہیں۔ جب وہ خوب و بد کو سمجھنے لگے تو اس کی تربیت شروع کرتے ہیں۔ جب کہ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ بچہ اپنی پیدائش کے روز ہی سے تربیت کے قابل ہوتا ہے۔ وہ لحظہ لحظہ تربیت پاتا ہے اور ایک خاص مزاج میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ ماں باپ متوجہ ہوں یا نہ ہوں۔ بچہ تربیت کے لیے اس امر کا انتظار نہیں کرتا کہ ماں باپ اُسے کسی کام کا حکم دیں یا کسی چیز سے روکیں۔ بچے کے اعصاب اور حساس و ظریف ذہن روزِ اوّل ہی سے ایک کیمرے کی طرح تمام چیزوں کی فلم بنانے لگتے ہیں اور اسی کے مطابق اُس کی تعمیر ہوتی ہے اور وہ تربیت پاتا ہے۔ پانچ چھ سالہ بچہ تعمیر شدہ ہوتا ہے اور جو ایک خاص صورت اختیار کر چکا ہوتا ہے اور جو کچھ اُسے بننا ہوتا ہے بن چکتا ہے۔ اچھائی یا بُرائی کا عادی ہو چکا ہے لہٰذا بعد کی تربیت بہت مشکل اور کم اثر ہوتی ہے بچہ تو بالکل مقلد ہوتا ہے وہ اپنے ماں باپ اور اِدھر اُدھر رہنے والے دیگر لوگوں کے اعمال، رفتار اور اخلاق کو دیکھتا ہے اور اس کی تقلید کرتا ہے وہ ماں باپ کو احترام کی نظر سے دیکھتا ہے اور انہیں کے طرزِ حیات اور کاموں کو اچھائی اور برائی کا

معیار قرار دیتا ہے اور پھر اسی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ بچے کا وجود تو کسی سانچے میں نہیں ڈھلا ہوتا وہ ماں باپ کو ایک نمونہ سمجھ کر اُن کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالتا ہے۔ وہ کردار کو دیکھتا ہے باتوں اور پند و نصیحت پر توجہ نہیں دیتا۔ اگر کردار گفتار سے ہم آہنگ نہ ہو تو وہ کردار کو ترجیح دیتا ہے۔

بیٹی اپنی ماں کو دیکھتی ہے اور اس سے آداب زندگی، شوہرداری، خانہ داری اور بچوں کی پرورش کا سلیقہ سیکھتی ہے۔ اور اپنے باپ کو دیکھ کے مردوں کو پہچانتی ہے۔ بیٹا اپنے باپ کے طرز زندگی سے درس حیات لیتا ہے۔ اس سے بیوی اور بچوں سے سلوک کرنا سیکھتا ہے۔ اور اپنی ماں کے طرز عمل سے عورتوں کو پہچانتا ہے اور اپنی آئندہ زندگی کے لیے اسی کو دیکھ کر منصوبے بناتا ہے۔

لہٰذا ذمہ دار اور آگاہ افراد کے لیے ضروری ہے کہ ابتدا میں ہی اپنی اصلاح کریں۔ اگر ان کے اعمال، کردار اور اخلاق عیب دار ہیں تو ان کی اصلاح کریں۔ اچھی صفات اپنائیں نیک اخلاق اختیار کریں اور پسندیدہ کردار ادا کریں۔ مختصر یہ کہ اپنے آپ کو ایک اچھے اور کامل انسان کی صورت میں ڈھالیں اس کے بعد نئے انسانوں کی تولید اور پرورش کی طرف قدم بڑھائیں۔

ماں باپ کو پہلے سوچنا چاہیے کہ وہ کس طرح کا بچہ معاشرے کے سپرد کرنا چاہتے ہیں اگر انھیں یہ پسند ہے کہ ان کا بچہ خوش اخلاق، مہربان، انسان دوست، خیر خواہ، دیندار، با ہدف، شریف، آگاہ، حریت پسند، شجاع، مفید، فعال اور فرض شناس ہو تو خود انہیں بھی ایسا ہی ہونا چاہیے تاکہ وہ بچے کے لیے نمونہ عمل قرار پائیں۔ جس ماں کی خواہش ہو کہ اس کی بیٹی فرض شناس، خوش اخلاق، مہربان، سمجھدار، شوہر کی وفادار، باتمیز، ہر طرح کے حالات میں گزر بسر کر لینے والی اور نظم و ضبط سے زندگی گزارنے والی ہو تو خود اُسے بھی ایسا ہونا چاہیے تاکہ اس کی بیٹی اس سے درس حیات حاصل کرے۔ اگر ماں بداخلاق، بے ادب، سست، بے نظم، بے مہر، کثیف، دوسروں سے زیادہ توقع باندھنے والی اور بہانہ ساز ہو تو وہ صرف وعظ و نصیحت سے ایک اچھی بیٹی پروان نہیں چڑھا سکتی۔

ڈاکٹر جلالی لکھتے ہیں:

"بچوں کو احساسات اور جذبات کے اعتبار سے وہی لوگ صحیح تربیت دے سکتے ہیں کہ جنہوں نے اپنے بچپن میں اور باقی تمام عمر صحیح تربیت پائی ہو۔ جو ماں باپ آپس میں ناراض رہتے ہوں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑتے ہوں، یا جن لوگوں نے کاروبار کے طور پر پرورش کا سلسلہ شروع کیا ہو اور انھیں تربیت دینے کا کوئی ذوق وشوق نہ ہو۔ اور جو بچوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں، خود حوصلے سے عاری ہوں اور غصیلی طبیعت رکھتے ہوں اور جنہیں خود اپنے آپ پر اعتماد نہ ہو وہ بچوں کے جذبات اور احساسات کو صحیح راستے پر نہیں ڈال سکتے۔[۱]

ڈاکٹر جلالی مزید لکھتے ہیں:

بچے کی تربیت جس کے بھی ذمے ہو اسے چاہیے کہ کبھی کبھی اپنی صفات کا بھی جائزہ لے اور اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں سوچے اور اپنی خامیوں کو دور کرے۔[۲]

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

مَنْ نَصَبَ نَفْسَهُ إِمَامًا فَلْيَبْدَأْ بِتَعْلِيمِ نَفْسِهِ قَبْلَ تَعْلِيمِ غَيْرِهِ وَلْيَكُنْ تَأْدِيبُهُ بِسِيرَتِهِ قَبْلَ تَأْدِيبِهِ بِلِسَانِهِ وَمُعَلِّمُ نَفْسِهِ وَمُؤَدِّبُهَا أَحَقُّ بِالْإِجْلَالِ مِنْ مُعَلِّمِ النَّاسِ وَمُؤَدِّبِهِمْ۔

جو شخص دوسروں کا پیشوا بنے، چاہیے کہ پہلے وہ اپنی اصلاح کرے پھر دوسروں کی اصلاح کے لیے اٹھے اور دوسروں کو زبان سے ادب سکھانے سے پہلے اپنے کردار سے ادب سکھائے اور جو اپنے آپ کو تعلیم اور ادب سکھاتا ہے وہ اس شخص کی نسبت زیادہ عزت کا حقدار ہے جو دوسروں کو ادب

---

۱ روان شناسی کودک۔ ص ۲۹۶

۲ روان شناسی کودک ص ۲۹۷

سکھاتا ہے۔ نہج البلاغہ۔ کلمات قصار نمبر ۳۷

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

وَقِّرُوْا كِبَارَكُمْ يُوَقِّرْكُمْ صِغَارُكُمْ۔

تم اپنے بزرگوں کا احترام کرو تاکہ تمہارے بچے تمہارا احترام کریں۔

(غررالحکم۔ ص - ۷۸)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوذر سے فرمایا:

جب کوئی شخص خود صالح ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے نیک ہو جانے کے وسیلے سے اس کی اولاد اور اس کی اولاد کی اولاد کو بھی نیک بنا دیتا ہے۔

مکارم الاخلاق۔ ص ۵۴۶

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

إِنْ سَمَتْ هِمَّتُكَ لِإِصْلَاحِ النَّاسِ فَابْدَأْ بِنَفْسِكَ فَإِنَّ تَعَاطِيكَ صَلَاحَ غَيْرِكَ وَأَنْتَ فَاسِدٌ أَكْبَرُ الْعَيْبِ۔

اگر تو دوسروں کی اصلاح کرنا چاہتا ہے تو اس سلسلے کا آغاز اپنی ذات کی اصلاح سے کر اور اگر تو دوسروں کی اصلاح کرنا چاہے اور اپنے آپ کو فاسد ہی رہنے دے تو یہ سب سے بڑا عیب ہوگا۔ غررالحکم ص ۲۷

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

إِنَّ الْوَعْظَ الَّذِي لَا يَمُجُّهُ سَمْعٌ وَلَا يَعْدِلُهُ نَفْعٌ مَا سَكَتَ عَنْهُ لِسَانُ الْقَوْلِ وَنَطَقَ بِهِ لِسَانُ الْفِعْلِ۔

جس نصیحت کے لیے زبان گفتار خاموش ہو اور زبان کردار گویا ہو کوئی کان اسے باہر نہیں نکال سکتا اور کوئی فائدہ اس کے برابر نہیں ہو سکتا۔ غررالحکم ص ۲۲۲

ایک خاتون اپنے ایک خط میں لکھتی ہے:

...... میرے ماں باپ کے کردار نے مجھ پر بہت اثر کیا ہے انہوں نے ہمیشہ میرے ساتھ اور میرے بہن بھائیوں کے ساتھ مہربانی کی ہے۔ میں نے کبھی بھی ان کے

کردار اور گفتار میں برائی نہیں دیکھی۔ خود ہماری بھی عادت ویسی ہی ہو گئی۔ میں ان کا اچھا اخلاق اور کردار بھلا نہیں سکتی۔ اب جب کہ میں خود ماں بن گئی ہوں تو کوشش کرتی ہوں کہ کوئی برا کام خاص طور پر اپنے بچوں کے سامنے مجھ سے سرزد نہ ہو۔ میرے ماں اور باپ کا کردار میری زندگی میں میرے لئے نمونہ عمل بن گیا۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ اپنے بچوں کی بھی اسی طرح سے تربیت کروں۔

ایک اور خاتون اپنے خط میں لکھتی ہیں:

...... جب میں اپنی گزشتہ زندگی کے بارے میں سوچتی ہوں تو مجھے یاد آتا ہے۔ کہ میری ماں چھوٹی چھوٹی باتوں میں ایسے ہی چیختی چلاتی تھی۔ اب جب کہ میں خود ماں بن گئی ہوں تو میں دیکھتی ہوں کہ تھوڑی سی کمی کے ساتھ وہی میری حالت بھی ہے۔ اس کی ساری بداخلاقیاں مجھ میں پیدا ہو گئی ہیں اور عجیب مسئلہ یہ ہے کہ میں جتنا بھی کوشش کرتی ہوں کہ اپنی اصلاح کروں نہیں کر پاتی ہوں۔ یقینی طور پر میرے لئے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ ماں باپ کا کردار اور اخلاق اولاد کی تربیت پر ضرور اثرانداز ہوتا ہے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے، کہ ماں اپنی تربیت کے ذریعے ایک دنیا کو بدل سکتی ہے بالکل درست بات ہے۔

گھریلو لڑائی جھگڑے سے پرہیز

بچے کے لیے گھر آشیانے کے مانند ہے۔ وہ خود کو اس سے وابستہ سمجھتا ہے اور اس کا دل اسی سے بندھا ہوا ہے۔ اگر اس کے ماں باپ آپس میں اچھے دوست ہوں تو اس کا آشیانہ پائیدار، گرم آغوش کی طرح اور باصفا ہوگا۔ ایسے گھر میں بچہ آرام و اطمینان کا احساس کرے گا۔ اس اچھے آشیانے میں پرورش پانے سے بچے کی داخلی صلاحیتیں صحیح طور پر پروان چڑھتی ہیں اور نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن اگر ماں باپ میں لڑائی جھگڑا ہوا تو بچے کا چین اور سکون چھن جاتا ہے۔ وہ پریشان اور مضطرب رہتا ہے۔ ماں باپ آپس میں لڑ رہے ہوتے ہیں۔ انہیں اس امر کا اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ بے چارے بچے کی کیا کیفیت ہے۔ ایسے عالم میں بچے خوف زدہ ہوتے ہیں اور ان کے دل ٹوٹے ہوتے ہیں وہ یا کسی کونے کھدرے میں حیرت و استعجاب میں ڈوبے ہوتے ہیں یا پھر ایسے آشیانے سے فرار کر کے کسی کوچہ و بازار میں پناہ حاصل کرتے ہیں۔ بچے کی زندگی کی تلخ ترین یادیں اس کے ماں باپ کی باہمی لڑائی ہے۔ بچے ایسے واقعات اپنی آخری عمر تک بھلا نہیں پاتے۔ یہ واقعات ان کی روح پر بُرے طریقے سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔

ایسے بچوں کے دلوں میں گرہیں پڑ جاتی ہیں، اعصاب کمزور ہو جاتے ہیں، دل شکستہ رہتے ہیں اور وہ بدبینی کے عالم میں زندگی گزارتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ایسے گھر کی بیٹی اپنے باپ کی بداخلاقی اور کج مزاجی سے یہ سمجھے کہ سارے مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ممکن ہے اس خیال کے باعث وہ شادی کے نام ہی سے خوف کھاتی ہو۔ ہو سکتا ہے ایسے گھر کا بیٹا

اپنی ماں کی بداخلاقی اور لڑاکا پن کے باعث سب عورتوں کو ایسا ہی خیال کرے اور شادی سے بیزار ہو جائے۔ اس صورت حال میں اولاد کے دل میں ماں یا باپ میں سے کسی ایک کے لیے کینہ اور نفرت پیدا ہو جاتی ہے یہاں تک کہ بعض اوقات اولاد انتقامی حربے بھی اختیار کرتی ہے۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے آوارہ، نشہ باز اور بدکردار بچے ماں باپ کے روز روز کے جھگڑوں کے باعث اس مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں۔

اگر آپ اپنے بچپن کے تلخ واقعات اور ماں باپ کے اختلافات (اگر تھے) کا سوچیں تو آپ محسوس کریں گے کہ سالہا سال گزرنے کے باوجود اُن کی تلخ یادیں آپ کے ذہن پر نقش ہیں۔

ایک دانشور لکھتے ہیں:

ماں باپ کو یہ بات معلوم ہونا چاہیے کہ گھر کے بڑے افراد کے درمیان لڑائی جھگڑا بچوں پہ بُرا اثر ڈالتا ہے اور بڑوں کے باہمی روابط بچے کی شخصیت کی تعمیر پر اثر انداز ہوتے ہیں .... اگر ایک گھر میں اتفاق و اتحاد کی فضا نہ ہو تو ایسی صورت میں ممکن نہیں کہ وہاں بچوں کی صحیح پرورش ہو سکے۔ جب بڑے لڑنے جھگڑنے لگیں تو انہیں بھول جاتا ہے کہ بچے بھی اُن کے ساتھ ہیں اور اُن کی تربیت بھی ان کے ذمہ ہے۔ ایسی صورت میں بچہ کوئی صحیح سبق نہیں سیکھ سکتا۔ اس کا مزاج بھی غصیلا ہو جاتا ہے وہ تند مزاج اور گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔ خصوصاً کچھ بڑی عمر کے بچے ایسی صورت میں سخت مشکل سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ ان کا دل باپ کی حالت پر کڑھتا ہے۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ کس کا ساتھ دیں اور کس کے ساتھ ہو جائیں۔ کبھی وہ حقیقت کو پہچانے بغیر ہر دو کے خلاف ہو جاتے ہیں۔[1]

کسی نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے کہ:

---

[1] روان شناسی تجربی ص ۶۷۳

"...... میرے بچپن کے بدترین واقعات میں سے وہ مواقع ہیں کہ جب میرے ماں باپ آپس میں جھگڑتے تھے اور گالی گلوچ کرتے تھے۔ میں، میری بہن اور میرا بھائی ایسے موقعے پر ایک طرف کھڑے ہو کر لرزتے رہتے تھے۔ جب تک لڑائی رہتی تھی ہم میں کچھ کرنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میری چھوٹی بہن اس صورت حال کو دیکھ کر رونے لگتی تھی اور کتنی دیر تک اس کے اوسان بحال نہ ہوتے تھے۔ اس وقت وہ ضعفِ اعصاب کا شکار ہو چکی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہمارے ماں باپ کے لڑائی جھگڑے میری بہن کی روح پر بری طرح اثر انداز ہوئے ہیں....."

ایک مرد نے اپنے خط میں لکھا ہے۔

..... بچپن کے ایک تلخ واقعے کی یاد میرے دل سے جاتی ہی نہیں۔ میرا باپ بہت بداخلاق، بدسلوک، غصیلا، اور خود غرض تھا گھر میں وہ بہانے بہانے سے جھگڑتا رہتا اور سب پر برستا۔ ہمارے ماں باپ صبح سے آدھی رات تک آپس میں لڑتے رہتے، خدا جانے وہ تھکتے کیوں نہ تھے۔ جھگڑے بھی بالکل معمولی معمولی باتوں پر ہوتے تھے۔ کوئی رات ایسی نہ تھی کہ میں روئے بغیر سو جاتا۔ اسی وجہ سے میرے اعصاب کمزور پڑ گئے ہیں ڈرتا رہتا ہوں اور ڈراؤنے خواب دیکھتا ہوں۔ ڈاکٹر کے پاس بھی گیا ہوں وہ کہتا ہے کہ گھریلو اختلافات کا اثر ہے اور اس کا آرام کے علاوہ کوئی علاج نہیں ہے۔ میری خوشی کا زمانہ اس وقت شروع ہوا جب میری شادی ہو گئی اور میں نے اُس گھر سے نجات پالی اور اب اگرچہ میری زندگی اچھی گزر رہی ہے پھر بھی یوں لگتا ہے جیسے میں ایک شکست خوردہ آدمی ہوں اور زندگی میں ترقی نہیں کر سکتا۔ میں والدین سے درخواست کرتا ہوں کہ خدارا! اگر تمہارے درمیان کوئی اختلاف ہو بھی تو اپنے بچوں کے سامنے لڑائی جھگڑا نہ کرو۔

وہ اپنے تفصیلی خط میں مزید لکھتا ہے: میرے بچپن کا بدترین واقعہ وہ ہے کہ میں جب آٹھ سال کا تھا اور میرے والدین کے درمیان سخت جھگڑا رونما ہوا۔ سارے

نیچے ڈر کے مارے مختلف گوشوں میں جا چھپے اس واقعے کا میری روح پر ایسا اثر ہوا کہ میں ایک عرصے تک مضطرب اور پریشان رہا۔ میں اپنے گھر والوں سے بیزار ہو گیا۔ میرا دل نہ کرتا کہ سکول سے گھر آؤں۔ میں خدا سے دعا کرتا کہ بیمار ہو جاؤں اور مر جاؤں۔ کئی دفعہ میں نے خودکشی کا سوچا بھی۔ بعض خوابوں میں میں نے دیکھا کہ میں اپنی ہونے والی بیوی سے لڑ رہا ہوں اور اس سے جنگ و جدال میں مصروف ہوں عالم خواب میں میں یہ پروگرام بناتا کہ اپنے حق کو میں کیسے بچا سکتا ہوں۔ شادی کے شروع شروع میں میں نے کئی بہانوں سے کوشش کی کہ اپنی بیوی سے جھگڑوں اور اسے بتاؤں کہ میں بہت غصے والا ہوں اور اونچی آواز سے بولوں تاکہ اس پر ظاہر کر سکوں کہ میری بھی کوئی شخصیت ہے۔ خوش قسمتی سے میری بیوی ٹھنڈے دل و دماغ والی اور عقل مند تھی۔ وہ میرے ساتھ اچھا سلوک کرتی تھی اور اس کے بعد دلیل و برہان سے مجھے مطمئن کرتی۔ خوش قسمتی کی بات یہ ہے کہ میرا یہ مزاج زیادہ دیر تک باقی نہ رہا۔ جب مجھے اپنے ماں باپ کی غلطی کا احساس ہوا اور میں نے خود اپنی کمزوریوں پر نظر کی تو میں نے اپنے اخلاق کو تبدیل کر لیا اور اب زندگی آرام سے گزر رہی ہے۔

ایک اور صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں۔

...... میں نو سال کا تھا کہ میرے ماں باپ نے باہمی اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے سے جدائی کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے مجھے، میری بہن اور بھائی کو دادا کے گھر بھجوا دیا۔ ہم وہاں رہتے رہتے۔ جب میں اپنی ماں سے ملنے جاتا تو راتوں کو ایسے خواب دیکھتا کہ کہہ رہا ہوتا کہ میں ابو کے گھر نہیں جاؤں گا۔ کچھ عرصے کے بعد امی اور ابو کے بعض رشتہ داروں نے مل ملا کر صلح کرا دی اور میری امی واپس گھر آ گئی۔ لیکن اس تھوڑے سے عرصے نے میری روح پر ایسا اثر کیا کہ ابھی تک اس کے آثار باقی ہیں۔ میں اب کوشش کرتا ہوں کہ اگر میرے اور بیوی کے درمیان کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو اسے اپنے بچوں کے سامنے ظاہر نہ ہونے دوں۔

ایک اور خط ملاحظہ کیجئے:

...... میرے بچپن کی بہت سی تلخ یادیں ہیں، خوشی کی یادیں تو بہت ہی کم ہیں۔ جب بھی مجھے وہ زمانہ یاد آتا ہے تو ناراحت ہو جاتی ہوں اور بے اختیار میرے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اس غم کی وجہ یہ ہے کہ جب سے مجھے یاد ہے میں نے ہمیشہ اپنے ماں باپ کو بحث و جدل اور لڑائی جھگڑا کرتے ہی دیکھا۔ اس طرح انہوں نے مجھ پر اور میرے بہن بھائیوں پر زندگی اجیرن کر دی تھی۔ ہم آٹھ بہن بھائی تھے اسی وجہ سے میں اپنے شوہر سے تو تکرار نہیں کرتی اور اپنے شوہر اور بچوں کی زندگی تلخ نہیں کرتی۔

ایک خط میں کسی نے لکھا:

...... پانچ سال کی عمر بچپن کا بہترین زمانہ ہوتا ہے۔ میں اس عمر کا تھا کہ میرے ماں باپ میں شدید اختلاف پیدا ہوئے۔ میرے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ اس اختلاف کی وجہ سے میری ماں نے طلاق لے لی۔ ہم چھ بہن بھائی تھے۔ ایک دن بہت تلخ تھا۔ میں اور میرا بھائی کھیل رہے تھے کہ امی جان خدا حافظ کہنے کو آئیں۔ خدا جانتا ہے کہ ہم کس قدر ناراحت ہوئے۔ ہماری ماں چلی گئی اور ہم اپنے باپ اور نئی ماں کے ساتھ رہ گئے۔ دو سال گویا ہم ماں کے بغیر رہے اور باپ کی بے اعتنائی کے صدمے سہتے رہے۔ اس کے بعد ایک روز ہماری امی آئیں اور مجھے اور میرے بھائی کو اپنے گھر لے گئیں۔ انہیں ہماری نانی سے جائیداد سے کچھ حصہ ملا تھا وہ اسی کے ذریعے ہماری دیکھ بھال کرتی رہیں۔ پھر دیگر بہن بھائی بھی آ گئے۔ ہماری ماں نے ہمارے ساتھ ماں کا کردار بھی ادا کیا اور باپ کا بھی۔ ہم اس کے ایثار اور قربانیوں کو بھلا نہیں سکتے۔

ایک خاتون اپنے خط میں لکھتی ہے:

...... میرے ماں باپ ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ اور ہمارے گھر میں ایک جنجال بپا ہوتا تھا۔ ہماری ماں ہمیشہ غصے میں رہتی ہیں آٹھ سال کی تھی دوسرے

بچوں کو میرے پاس چھوڑتی اور چلی جاتی۔ میرے بہن بھائی کوئی دو سال کا تھا، کوئی چار سال کا تھا، کوئی چھ سال کا تھا۔ یہاں تک کہ ایک چھ ماہ کا بھی تھا۔ میں ناچار ان سب کی خدمت کرتی رہتی۔ کبھی باپ سے بھی مار کھاتی۔ ان سارے حالات کے باوجود میں کوشش کرتی کہ پڑھتی بھی رہوں لیکن دوسری جماعت میں میں فیل ہو گئی تھی۔ میری استانیوں کو میرے حالات کی خبر تھی۔ انہوں نے میرے اوپر رحم کیا اور مجھے کچھ اضافی نمبر دے دیئے۔ انہیں حالات میں میں ہائی سکول تک جا پہنچی۔ اس وقت تو میں خود ماں بن چکی ہوں۔ کوشش کرتی ہوں کہ جنگ و جدل سے نہ اپنے آپ کو بے آرام کروں اور نہ شوہر اور نہ بچوں کو۔

جو ماں باپ احساس ذمہ داری رکھتے ہیں اور انہیں اپنے بچوں کی تربیت سے دلچسپی ہے تو انہیں چاہیے گھر کے لڑائی جھگڑے سے سختی سے اجتناب کریں اور ہرگز بچوں کے سامنے لڑائی جھگڑا نہ کریں اور دلی کدورتوں اور باہمی غصے سے بچوں کے لیے ناراضی اور پریشانی کے اسباب فراہم نہ کریں۔ اس سے بدتر کوئی کام نہیں ہو سکتا کہ ماں باپ گھر میں جھگڑیں اور بے گناہ بچوں کو چھوڑ کر اپنی راہ لیں۔ اگر ماں باپ کو پتہ ہو کہ اس مدت میں اگرچہ وہ تھوڑی سی ہی کیوں نہ ہو، بچوں پر کیا گزری تو وہ کبھی اس لڑائی جھگڑے کو اختیار نہ کریں۔ ایسے واقعات آخر عمر تک نہیں بھولتے اور اولاد کی روح کو اداس اور پریشان کر دیتے ہیں۔ البتہ شاید بہت کم ہی گھر ایسے ہوں جہاں سلیقے کا اختلاف نہ ہو۔ لیکن ازدواجی زندگی میں درگزر کی ضرورت ہوتی ہے۔ سمجھدار اور آگاہ ماں باپ اپنے اختلافات کو افہام و تفہیم اور منطق و استدلال کے ذریعے سے حل کرتے ہیں اور اگر ناچار کچھ سخت سست کہنا ہی پڑ جائے تو بچوں کے سامنے ایسا نہیں ہونا چاہیے اور اگر بچوں کو کچھ پتہ چل بھی جائے تو انہیں بتانا چاہیے کہ اختلاف کام میں نہیں ہے بلکہ ہمارے درمیان صرف طریقے میں اختلاف اور مشکلات ہیں اور ان کے حل کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے۔ ماں باپ کو نہیں چاہیے اگرچہ وہ غصے کے عالم میں ہوں طلاق اور جدائی کا ذکر کریں۔ کیونکہ اس سے نہ فقط ازدواجی زندگی متزلزل ہو جاتی ہے بلکہ بچوں کے لیے بھی بے اطمینانی اور اضطراب پیدا ہوتا ہے۔ میاں بیوی کی ایک دوسرے سے جدائی اولاد کے ساتھ

بھی ایک بہت بڑی خیانت ہے۔ کیونکہ ان کا تو گویا آشیانہ گر جاتا ہے اور ان کی زندگی پریشان و ویران ہو جاتی ہے۔ کیونکہ بچے تو ماں باپ دونوں کو چاہتے ہوتے ہیں نہ کہ ان میں سے کسی ایک کو۔ اگر طلاق کے بعد بچے باپ کی تحویل میں رہیں اور وہ دوسری شادی کر لے تو وہ بے گناہ مجبوراً سوتیلی ماں کے زیر دست زندگی گزاریں گے۔ سوتیلی ماں اگرچہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو حقیقی ماں کی جگہ نہیں لے سکتی۔ زیادہ تر تو وہ اپنے شوہر کے بچوں کو اذیت و آزار ہی پہنچاتی ہے۔ سوتیلی ماں کے سلوک کے بارے میں آپ اخبار و جرائد میں پڑھتے ہی ہوں گے اور اگر بچے ماں کی تحویل میں چلے جائے تو اگرچہ وہ باپ سے بہتر نگہداری کرتی ہے لیکن باپ کی جگہ خالی رہتی ہے اور باپ سے دوری کا غم انہیں ستاتا رہتا ہے اور اگر وہ دونوں ڈھٹائی سے کام لیں اور اپنے بچوں کو کسی اور کے پاس چھوڑ دیں تو وا مصیبتا۔

بہر حال بچے پیدا ہونے سے پہلے میاں بیوی آزاد ہیں۔ لیکن اولاد کی پیدائش کے بعد وہ ذمہ دار ہیں کہ اختلاف سے پرہیز کریں اور گھر کے نظام کی حتی المقدور حفاظت کریں اور بے گناہ بچوں کی پریشانی اور اذیت کا سامان فراہم نہ کریں۔ ورنہ وہ بارگاہ عدل الہی میں جواب دہ ہوں گے اور ان کا مواخذہ کیا جائے گا۔

ماں کی حیثیت سے زندگی کا آغاز

جب مرد کا نطفہ (SPERM) عورت کے رحم میں جاتا ہے اور عورت کے نطفے (OVAL) سے ملتا ہے تو اس ملنے سے عورت کے لیے ماں بننے کے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اسی وقت سے عورت کے رحم میں ایک زندہ موجود وجود میں آتا ہے اور وہ تیزی کے ساتھ حرکت کرتا ہوا تکمیل کی طرف بڑھتا ہے۔ وہ بہت چھوٹا سا وجود غیر معمولی صورت کے ساتھ پرورش پاتا ہے اور بڑا ہوتا ہے، یہاں تک کہ ایک انسان کی کامل صورت اختیار کر لیتا ہے۔ انسان کی عمر حقیقی طور پر اسی زمانے سے شروع ہو جاتی ہے۔

ایک دانشور لکھتا ہے:

> جس وقت انسان اس دنیا میں آتا ہے تو نو مہینے اس کی عمر کے گزر چکے ہوتے ہیں۔ اور ان اولین نو مہینوں میں وہ ایسے مراحل سے گزرتا ہے کہ جس میں ایک ایسے وجود کا تعین ہو جاتا ہے جو بالکل مختلف اور بے نظیر ہوتا ہے اور یہ زمانہ اس کی ساری عمر کے لیے مؤثر ہوتا ہے۔[1]

عورت جب حاملہ ہو جاتی ہے تو اسی وقت سے وہ ماں بن جاتی ہے اور جو بچہ اس کے پیٹ رحم میں پرورش پا رہا ہوتا ہے اس کے بارے میں وہ ذمہ دار ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ باپ کا نطفہ قانون وراثت کے اعتبار سے بچے کی جسمانی اور نفسیاتی شخصیت پر اثر رکھتا ہے

---

[1] بیوگرافی پیش از تولد ص ۱۶

لیکن اس موجود زندہ کا مستقبل بہت زیادہ ماں کے اختیار میں ہوتا ہے۔ باپ کا نطفہ بیج کی حیثیت رکھتا ہے اور ماحول کسی فرد کی شخصیت کی پرورش پر بہت زیادہ اثر پذیر ہوتا ہے۔

ایک دانشور لکھتا ہے:

بچے کے والدین اس کی ایک ایسے ماحول میں نشوونما کر سکتے ہیں کہ جو اس کی طبیعت اور مزاج کے لیے صحیح و سلامت ہو اور وہ اسے ایک خراب اور گندے ماحول میں بھی پروان چڑھا سکتے ہیں۔ اور امر مسلّم ہے کہ ایسا ماحول ایک انسان کی روح جاوداں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماں باپ انسانیت کی طرف سے سب سے بھاری ذمہ داری کے حامل ہوتے ہیں۔[1]

ہر شخص کی سلامتی یا بیماری، طاقت یا کمزوری، خوبصورتی یا بدصورتی، خوش استعدادی یا بد استعدادی اور خوش اخلاقی یا بداخلاقی کی بنیاد ماں کے رحم میں پڑتی ہے۔

بچے کی خوش بختی یا بدبختی کی اساس ماں کے بطن میں ہی رکھی جاتی ہے۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ہر شخص کی سعادت اور بدبختی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب وہ ماں کے رحم میں ہوتا ہے۔[2]

دوران حمل ایک نہایت حساس اور ذمہ داری کا زمانہ ہے۔ ایک خاتون کہ جو اپنی اہم ذمہ داری سے واقف ہو وہ دورانِ حمل کو ایک معمولی زمانہ تصور نہیں کر سکتی اور اس سے بے پرواہ نہیں رہ سکتی کیونکہ اگر وہ تھوڑی سی بھی غفلت یا سہل انگاری سے کام لے تو ممکن ہے اس کی اپنی صحت خراب ہو جائے یا اس کا بچہ ناقص ہو جائے، یا بیمار پڑ جائے اور ہمیشہ کے لیے بدنصیب بن کر دنیا میں آئے۔ اور ساری عمر آہ و زاری کرتا رہے۔

---

[1] راز آفرینش انسان۔ ص ۱۰۸۔

[2] بحار الانوار۔ ج ۷۷۔ ص ۱۳۳ نیز ج ۷۷۔ ص 115

ایک دانشور لکھتے ہیں:

ماں کا بدن اور اس پر اثر انداز ہونے والے واقعات بچے کے پروان چڑھنے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور بچہ ماں کے بدن کی نسبت حساس تر ہوتا ہے چونکہ ماں کا بدن تو مکمل ہو چکا ہوتا ہے اور اسے ابھی تکمیل کے مراحل طے کرنا ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہر عورت کا یہ فریضہ ہے کہ اپنے بچے کے پہلے گھر کے لیے بہترین ماحول فراہم کرنے کی کوشش کرے اور ایسا وہ صرف اسی صورت میں کر سکتی ہے کہ جب اسے معلوم ہو کہ کون سے واقعات اور امور بچے کے رُشد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ صرف اس امر سے ڈرتے رہنا کہ بچے کا رشد معمول کے خلاف ہو بچے کی بھلائی کے لیے کافی نہیں ہے اور ان عوامل سے غفلت کہ جو اس چیز کا باعث بنتے ہیں کسی درد کی دوا نہیں بن سکتی۔ انسان کا رشد کس طریقے سے ہوتا ہے اور کس طریقے سے اس میں تبدیلیاں جنم لیتی ہیں اگر ماں اس سے واقف ہو تو وہ اپنی ذمہ داری ادا کر سکتی ہے اور ان نو مہینوں میں بچے کے لیے زندگی کا بہترین ماحول فراہم کر سکتی ہے۔ بچے کی نشوونما کے لیے ولادت سے پہلے یا ولادت کے بعد ایک کامل ماحول کی ضمانت کبھی بھی ممکن نہیں البتہ قدر مسلم یہ ہے کہ تمام والدین یہ چاہتے ہیں کہ ایک سالم اور صحت مند بچہ دنیا میں آئے یہ والدین اور گھر کے بڑے افراد کی ذمہ داری ہے کہ بچے کو صحیح و سالم دنیا میں لانے کی کوشش کریں۔ البتہ جہالت طبعی حوادث کو نہیں روک سکتی۔ اگر انسان کو یہ خبر نہ ہو کہ بچہ کس طرح نشوونما پاتا ہے تو یہ بے خبری آنے والوں کی بدبختی کا باعث بنتی ہے۔ دنیا میں بے نقص آنا ہر انسان کا حق ہے[1]

---

[1] بیوگرافی پیش از تولد ص ۱۸۴

جنین کی سلامتی میں ماں کی غذا کا اثر

رحم مادر میں بچہ ماں کے بدن کا کوئی باقاعدہ حصہ نہیں ہوتا تاہم وہ ماں کے خون اور غذا سے ہی پرورش پاتا ہے۔ ایک حاملہ خاتون کی غذا کامل ہونی چاہیے جو ایک طرف تو خود اس کے بدن کی ضروریات پوری کر سکے تاکہ اس کی جسمانی طاقت اور تندرستی میں کوئی کمی واقع نہ ہو اور صحیح و سالم طریقے سے اپنی زندگی جاری رکھ سکے اور دوسری طرف اس کی غذا کو بچے کے جسم کی ضروریات کا بھی کفیل ہونا چاہیے تاکہ وہ معصوم بچہ اچھے طریقے سے پرورش پا سکے اور اپنی اندرونی طاقتوں کو ظاہر کر سکے۔

لہٰذا ایک حاملہ عورت کا غذائی پروگرام سوچا سمجھا، کسی حساب کے تحت اور مرتب ہونا چاہیے۔ کیونکہ ممکن ہے بعض وٹامن یا غذائی مواد کی کمی سے ماں کی سلامتی خطرے میں جا پڑے یا بچے کی صحت و سلامتی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ جائے۔

اسلام کی نظر میں ماں کی غذا بہت اہمیت رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ حاملہ عورت کہ جس کے اپنے لیے یا اس کے بچے کے لیے روزہ رکھنا باعث ضرر ہو اسے اجازت دی گئی ہے کہ ماہِ رمضان کا واجب روزہ نہ رکھے بعد میں قضا کرے۔

ایک تحقیق کے مطابق دنیا کے اسی فیصد ناقص الخلقت نیز فکری، اعصابی یا جسمانی طور پر کمزور بچوں کے نقص اور کمزوری کا سبب یہ ہے کہ رحمِ مادر میں انہیں صحیح غذا نہیں ملی[1]

---

[1] بہداشتِ جسمی و روانی کودک ص ۹۲

ڈاکٹر جزائری کہ جو ایک ماہر غذا ہیں لکھتے ہیں :

ماں اور جنین کی سلامتی اس غذا سے وابستہ ہے کہ جو ماں حمل کے دوران میں کھاتی ہے۔[1]

مدتوں سے انسان کو اس بات کا علم ہے کہ جنین اور بچے کے رشد میں ولادت سے پہلے اور دودھ دینے کے دوران میں ماں کی غذا اثر رکھتی ہے۔ ماں کو چاہیے کہ تمام پروٹین، وٹامن، کاربو ہائیڈریٹس، روغنیات اور دیگر درکار غذا کو اس زندہ سیل یعنی بچے کی نشوونما کے لیے فراہم کرے۔ تجربات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ماں کے لیے ضروری ہے کہ وٹامنز کی وہ مخصوص مقدار جنین کے لیے مہیا کرے کہ جو زندہ خلیوں کے لیے ضروری ہے۔ اس طرح سے کہ جنین کے رشد کو یقینی بنایا جا سکے کیونکہ مختلف وٹامنز کی کمی بچے پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے کیونکہ وہ تو حالت رشد میں ہوتا ہے جب کہ ماں کی نشوونما تو مکمل ہو چکی ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ دوران حمل ماں بالکل تندرست رہے جب کہ بچہ مخصوص وٹامنز کی کمی کا شکار ہو جائے اور اس کے نتیجے میں اس کے رشد کی حالت خلاف معمول ہو۔[2]

کرز کہتا ہے :

بچے کے غیر طبعی ہونے کی وجہ کبھی یہ ہوتی ہے کہ تخم تو اچھا ہوتا ہے لیکن اسے فضا اچھی میسر نہیں آتی اور کبھی یہ ہوتا ہے، تخم اچھا نہیں ہوتا جبکہ فضا اچھی میسر آجاتی ہے۔ بہت سارے جسمانی نقائص مثلاً ہونٹوں کا پھٹا ہوا ہونا، آنکھیں چھوٹی اور دھنسی ہوئی ہونا اور پاؤں کے تلوے کا ہموار ہونا کہ جنہیں پہلے موروثی عوامل کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا آجکل ماحول بالخصوص دوران حمل آکسیجن کی کمی جیسے عوامل

---

[1] اعجاز خوراکیہا ص ۲۲۰

[2] بیوگرافی پیش از تولد ص ۱۸۲

کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔ ماحول اور فضا کو بہت سے پیدائشی نقائص اور بچوں کے اعضائے فالج زدہ ہونے کی علت شمار کیا جاتا ہے[1]

امام صادق علیہ السلام ایک حدیث میں فرماتے ہیں:

جو کچھ ماں کھاتی اور پیتی ہے بچے کی خوراک اسی سے بنتی ہے[2]

---

[1] روانشناسی کودک ص۱۹۰

[2] بحار الانوار۔ جلد ۶۰۔ ص۳۴۲

جنین کے اخلاق پر ماں کی غذا کا اثر

ایام حمل میں ماں کی غذا کی کیفیت بچے کے اخلاق، عقل اور استعداد تک پر بہت زیادہ اثر کرتی ہے کیونکہ بچے کے اعصاب اور اس کا مغز ماں کی غذا ہی سے تیار ہوتا ہے اور ہر طرح کی غذا اپنا ایک خاص اثر رکھتی ہے۔ اسلام نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ ماں کی غذا بچے کے اخلاق کی تعمیر میں نہایت موثر ہوتی ہے۔ ہم نمونے کے طور پر چند احادیث پیش کرتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا،

ماؤں کو چاہیے کہ دوران حمل کے آخری مہینوں میں کھجور کھائیں تاکہ ان کے بچے خوش اخلاق اور بردبار ہوں[1]

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

حاملہ عورتوں کو تاکید کرو کہ بہی دانہ کھائیں تاکہ ان کے بچے خوش اخلاق ہوں[2]

امام رضا علیہ السلام نے فرمایا:

بہی دانہ عقل و دانائی کو بڑھاتا ہے[3]

---

[1] مستدرک ج ۲۔ص ۱۱۳

[2] مستدرک ج ۲۔ص ۱۱۶

[3] مکارم الاخلاق ج ۱۔ص ۱۹۶

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

جو حاملہ عورت خربوزہ کھائے گی اس کا بچہ خوبصورت اور خوش اخلاق ہوگا۔[۱]

---

[۱] مستدرک ج ۲ - ص ۶۲۵

ماں کی غذا

یہاں ان مختلف قسم کی غذاؤں کے بارے میں تحقیق نہیں کر سکتے اور نہ ہی ان کے خواص اور آثار گنوا سکتے ہیں کیونکہ یہ ایک دشوار اور مفصل بحث ہے۔ اور راقم اس میں ماہر بھی نہیں ہے خوش قسمتی سے اس سلسلے میں بہت سی مفید کتابیں لکھی جا چکی ہیں قارئین ان کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ پُرا ہنیں کچھ مجموعی طور پر اس سلسلے میں بعض امور کی یاد دہانی کروا دی جائے۔

اگرچہ حاملہ عورتوں کی غذائی ضروریات بڑھ جاتی ہیں لیکن یہ امر باعث افسوس ہے کہ ان میں کھانے کی طلب کم پڑ جاتی ہے۔ اور ان میں اکثر کی طبیعت بوجھل سی ہو جاتی ہے ایسی صورت میں انہیں کوشش کرنی چاہیے کہ ایسی کم حجم غذائیں کھائیں کہ جو غذائیت کے اعتبار سے کامل ور بھرپور ہوں۔ انسانی بدن کو جن غذاؤں کی ضرورت ہے وہ مختلف چیزوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ لہذا غذا میں تنوع رکھنے سے ایک عورت کے لیے بہترین غذائی پروگرام تشکیل پا سکتا ہے۔ اس ضمن میں ایک ماہر لکھتے ہیں۔

"بدن کو صحیح و سالم رکھنے کے لیے نہ فقط حسب کفایت غذا کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ چاہیے کہ غذا متنوع ہو اور مناسب طور پر صرف کی جائے"[1]

ایک اور ماہر لکھتے ہیں،

ماں کو چاہیے کہ وہ اپنی صبح و شام کی غذا میں کچھ اضافی وٹامن اور معدنیات اپنے

---

[1] علم و زندگی ص ۲۰۹/۴

جسم کو مہیا کرے تاکہ جنین اپنے سات مہینے کے رشد کے سفر میں اس سے استفادہ کر سکے اور اس سے نہ صرف دانت اور مسوڑھے بن سکیں بلکہ اس کی پیچیدہ ہڈیاں بھی نشو و نما پاسکیں۔[1]

ڈاکٹر غیاث الدین جزائری لکھتے ہیں :

دہی اور پنیر کا استعمال حالتِ حمل میں عورت کو وٹامن د (VITAMIN) اور خاص قسم کا خمیر مہیا کرتا ہے اور اُسے ادھر ادھر کی دوسری چیزوں کے کھانے سے روکنے میں مفید ہوتا ہے۔ البتہ کھٹا دہی استعمال کرنا حاملہ عورت کے لیے مفید نہیں ہے۔ باسی پنیر کا بھی کوئی مزہ نہیں ہے۔ ہر روز صبح ناشتے کے طور پر ایک گلاس دودھ کا پینا حاملہ عورت کے لیے ضروری ہے نیز آبِ جَو کا خمیر اور دلیہ بھی مفید ہے اوجڑی، شیر دان، دل، کلیجی اور جگر میں وٹامن بی بہت زیادہ پایا جاتا ہے اور یہ مفید بھی ہیں۔[2]

بہت اچھا ہے کہ حاملہ عورتیں مسلسل صحیح طریقے سے دودھ سے استفادہ کریں یہ غذا اس قدر مفید اور کامل ہے کہ انبیاء کی باقاعدہ غذا رہی ہے۔

حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

دودھ انبیاء کی غذا ہے۔[3]

ڈاکٹر غیاث الدین جزائری لکھتے ہیں :

زیادہ تر عورتیں حمل کے دوران کیلشیم کی کمی کی وجہ سے پاؤں میں درد، کمر درد، اور ناخنوں کے ٹوٹنے میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا حاملہ خواتین کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ ایسے پھل اور سبزیاں کھائیں کہ جن میں کیلشیم زیادہ ہوتی ہے۔ اور اسی طرح

---

[1] بیوگرافی پیش از تولد ص۴
[2] اعجاز خوراکیہا ص ۲۲۴
[3] بحار جلد ۶۶ ص ۱۰۱

یخنی اور آبلیمو کو فراموش نہ کریں [1]

عام لوگوں کے لیے اور خاص طور پر حاملہ خواتین کے لئے کچی اور پکی سبزیاں اور مختلف پھل بہترین غذا ہیں۔ پودے اور درخت غذائی مواد زمین، پانی، ہوا اور سورج کی روشنی سے حاصل کرتے ہیں اور ہمارے لئے غذا تیار کرتے ہیں۔ صحیح وسالم غذا کے لئے تمام پھل مفید ہیں البتہ خاص طور پر مرکبات، سیب، بہی دانہ، ناشپاتی، اور کھجور مفید ہیں لیکن ہر پھل میں تمام تر مواد غذائی نہیں ہوتا۔ ہر ایک کا اپنا خاص فائدہ اور تاثیر ہے۔ اسی طرح ہر سبزی کی اپنی خاصیت ہے۔ مختلف وٹامن اور مختلف قسم کا غذائی مواد مختلف پھلوں، اناج اور سبزیوں میں پھیلا ہوا ہے۔ جو شخص اپنی صحت و تندرستی کا خواہش مند ہو اُسے چاہیے کہ وہ مختلف پھلوں اور سبزیوں سے اگرچہ کبھی کبھار ہو استفادہ کرے۔ خاص طور پر حاملہ عورتوں کے لیے ایسا کرنا مفید اور ضروری ہے۔ دینِ اسلام نے مسلمانوں سے اور خاص طور پر حاملہ عورتوں کو تاکید کی ہے کہ وہ پھلوں اور سبزیوں سے استفادہ کریں۔ نمونے کے طور پر چند ایک روایات ذکر کی جاتی ہیں۔

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

ہر چیز کی کوئی نہ کوئی زینت ہے اور سبزی دسترخوان کی زینت ہے [2]

ایک روز امام رضا علیہ السلام کھانے کے لیے بیٹھے دیکھا کہ سلاد موجود نہیں ہے خادم سے فرمایا:

تو جانتا ہے کہ میں سلاد کے بغیر کھانا نہیں کھاتا مہربانی کر دا ور سلاد بھی لے آؤ۔

اور جب سلاد آیا تو امام نے کھانا شروع کیا [3]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

بہی دانہ کھاؤ کیوں کہ بہی دانہ عقل کو بڑھاتا ہے، غم کو دور کرتا ہے اور بچے کو

---

[1] اعجاز خوراکیہا ص ۲۲۴

[2] مستدرک۔ جلد ۳۔ ص ۱۱۸

[3] مکارم الاخلاق۔ جلد ۱۔ ص ۲۰۱

نیک کرتا ہے[1]

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

بہی دانہ کھاؤ اور اس اچھے پھل کو اپنے دوستوں کو ہدیہ کے طور پہ دو۔ کیونکہ بہی دانہ آنکھوں کی بینائی کو زیادہ کرتا ہے اور دلوں کو مہربان کرتا ہے۔ حاملہ عورتیں بھی اس میوے سے خوب استفادہ کریں تاکہ ان کی اولاد نیک اور خوبصورت ہو۔[2]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

حاملہ عورتیں آخری مہینوں میں کھجور کھائیں تاکہ ان کے بچے بردبار ہوں[3]

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

کھجور کھاؤ کیونکہ کھجور سب دردوں کی دوا ہے[4]

اس طرح کی احادیث بہت سی ہیں۔ یہ چند حدیثیں نمونے کے طور پر ذکر کی گئی ہیں۔ آپ پھلوں اور سبزیوں کے خواص کتابوں میں پڑھیں اور اس کے مطابق اپنے کھانے کا پروگرام تیار کریں یا پھر اس سلسلے میں کسی غذاشناس ڈاکٹر سے مشورہ کریں۔

---

[1] مکارم الاخلاق۔ ج ۱۔ ص ۱۹۶

[2] مستدرک ج ۳۔ ص ۱۱۶

[3] مستدرک ج ۳۔ ص ۱۱۳

[4] مستدرک ج ۳ ص ۱۱۳

تمباکو نوشی

حاملہ عورتوں کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ سگریٹ اور ہر طرح کی تمباکو نوشی سے بچیں۔ کیونکہ تمباکو نوشی نہ صرف ماں کی صحت کے لئے خطرناک ہے بلکہ اس کے بُرے اثرات رحم میں موجود بچے کے جسم اور اعصاب پر بھی پڑتے ہیں۔ اس ضمن میں ہم ایک غیر ملکی مجلے کے ایک مقالے کا خلاصہ نقل کرتے ہیں۔ اس کی طرف توجہ فرمائیے گا۔

ایک تحقیق جو سکنڈانیوین ممالک میں ۶۳۶۳ حاملہ عورتوں پر کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو عورتیں سگریٹ کی عادی ہیں ان کے بچوں کا اوسط وزن دوسرے بچوں کے اوسط وزن سے ۱۷۰ گرام کم ہوتا ہے۔ وزن کی یہ کمی ان ماؤں کے ۵۰٪ بچوں میں پائی گئی ہے۔ جب کہ دوسری طرف ان بچوں کا قد بھی دوسروں سے کم تر پایا گیا ہے۔ اسی طرح سے ان کے سر اور شانے بھی دوسرے بچوں سے چھوٹے ہوتے ہیں۔ ان بچوں کی موت بھی دوسرے بچوں کی نسبت چھ گنا زیادہ ہوتی ہے۔ ان بچوں کے اعضا میں نقص بھی دوسرے بچوں کی نسبت کہ جن کی مائیں سگریٹ کی عادی نہیں ہیں زیادہ ہوتا ہے۔ سگریٹ کا استعمال ماں اور رحم میں بچے کے خون میں آکسیجن کی کمی اور کاربوکسی ہوموگلوبین[۱] کی زیادتی کا باعث بنتا ہے۔ سگریٹ پینے والی ماں کے بچوں میں دل کی پیدائشی بیماری دوسری ماؤں کے

سلہ

بچوں کی نسبت ۵۰٪ زیادہ ہوتی ہے اعداد و شمار اس امر کا پتہ دیتے ہیں کہ تمباکو نوشی کرنے والی ماؤں کے بچے تعلیم میں اپنے ہم سن بچوں سے پیچھے ہوتے ہیں اور یہ عقب ماندگی دوران حمل سگریٹ نوشی کی مقدار کے مطابق ہوتی ہے کیونکہ سگریٹ بچے کے مغز کے خلیوں کی کمی کا باعث بنتی ہے۔ یہ تو ان نقصانات کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے کہ جو سگریٹ نوشی سے ماؤں اور نوزاد بچوں کو پہنچتا ہے۔ شاید اس کے اور بھی بہت سے عوارض اور پہلو ہیں کہ جو ابھی ناشناختہ ہوں۔ لہٰذا وہ سب مائیں جو اپنی اور اپنے بچوں کی صحیح و سالم زندگی کی خواہش رکھتی ہیں انہیں نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ تمباکو نوشی سے اجتناب کریں۔[1]

ڈاکٹر جزائری لکھتے ہیں :-

تمباکو نوشی ماں کے لیے بھی نقصان دہ ہے اور رحم مادر میں موجود بچے کے لیے الکحلی مشروبات بھی حاملہ عورتوں کے لیے غیر معمولی طور پر خطرناک ہیں۔ اس بات سے صرف نظر کہ الکحل جو زہر پیدا کرتی ہے ان وٹامنز کو بھی تباہ کر دیتی ہے کہ جو ماں اور اس کے پیٹ میں بچے کی ضرورت ہوتے ہیں اور اولاد ناقص الخلقہ اور عیب دار ہو جاتی ہے۔ تمباکو نوشی اور تیز چائے بھی حاملہ عورتوں کے لیے غیر معمولی طور پر ضرر رساں ہیں۔[2]

ڈاکٹر جلالی لکھتے ہیں :

الکحل، چرس اور دیگر تمام منشیات انسان کے خون میں شامل ہو جاتی ہیں اور یہی خون جنین کے گرد ہوتا ہے اور نتیجتاً اس کے رشد و نمو پر اثر کرتا ہے یہاں تک کہ بعض ماہرین کا نظریہ ہے کہ عورتوں کی تمباکو نوشی سے جنین کا دل متاثر ہوتا ہے اور دل کی دھڑکن کو تیز کرتا ہے۔[3]

---

[1] مکتب اسلام - سال ۱۵ - شمارہ ۶

[2] اعجاز خوراکیہا ص ۲۱۵

[3] روانشناسی کودک ص ۲۲۲

اگر حاملہ خاتون بیمار ہو جائے

اگر حاملہ عورت بیمار ہو جائے اور اسے دوا کی ضرورت پڑ جائے تو دوا کے استعمال میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے کیوں کہ یہ دوا زیادہ تر بڑی عمر والوں کے لیے تیار کی جاتی ہے اور جب عورت اس سے استفادہ کرتی ہے تو شک نہیں کہ وہ اس کے پیٹ میں جا کر بچے کے بدن تک جا پہنچتی ہے اور اس پر بھی اثر انداز ہوتی ہے کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ بچے پر وہ کیا اثر ڈالے۔ بہر حال کوئی بھی دوا پیٹ میں موجود بچے کے لئے بے اثر نہیں ہوتی لہٰذا حاملہ خاتون کو نہیں چاہیے کہ بغیر سوچے سمجھے نتیجے کو ملحوظ رکھے بغیر دوا استعمال کرے اولاً تو جب تک ضرورت تقاضا نہ کرے دوا استعمال نہ کرے۔ ثانیاً اگر ناچار ہو جائے تو لازمی طور پر ڈاکٹر کو بتائے کہ میں حاملہ ہوں کیا یہ دوا میرے بچے کے لیے تو ضرر رساں نہیں لہٰذا کسی لائق ڈاکٹر کے مشورے سے ضروری مقدار میں دوا کھائے۔

البتہ اگر بیماری کوئی اہم ہو تو چاہیے کہ اپنی سلامتی اور بچے کی حفاظت کے لئے ڈاکٹر کی طرف رجوع کرے کیونکہ وہ بیماری نہ صرف ماں کے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے بلکہ ممکن ہے بچے کی سلامتی کو بھی خطرے میں ڈال دے۔

ایک ماہر لکھتے ہیں :

ممکن ہے کہ بعض وائرس (VIRUS) اور بیماری کے جرثومے (MICROBE) میاں بیوی سے گزر کر رحم مادر میں موجود اپنا دفاع نہ کر سکنے والے بچے پر حملہ آور ہو جائیں اور اسے بھی اسی بیماری میں مبتلا کر دیں۔[۱]

---

[۱] بیوگرافی پیش از تولد صفحہ ۱۵۰

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں :

ماں کی غذائی کیفیت میں تبدیلی اور جو دوا وہ استعمال کرتی ہے نیز جن بیماریوں سے وہ دوچار ہوتی ہے یہ سب جنین پر اثر انداز ہوتی ہیں..... ابتدائی دنوں میں رحم مادر میں بچے میں پیدا ہونے والی چھوٹی سی خرابی بڑے ہوتے ہوئے بہت زیادہ اثرات مرتب کرتی ہے اسی بنیاد پر دوران حمل اپنی صحت کی حفاظت کے سلسلے میں خواتین پر خاص ذمہ داری عائد ہوتی ہے یہاں تک کہ ان کے حمل ٹھہرنے کی صلاحیت کے ضائع ہونے کا احتمال ہے [1]

وہ یہ بھی لکھتے ہیں :

بہت سے غیر غذائی مواد بھی ایسے ہیں کہ جو ماں باپ سے گزر کر بچے پر اس طرح سے اثر انداز ہو سکتے ہیں کہ اس کی نشوونما پر منفی اثر ڈالیں۔ زیادہ تر دوائیاں جو عموماً استعمال کی جاتی ہیں وہ بالغ افراد کی تندرستی کے لیے بنی ہوتی ہیں یعنی ان کا تجربہ پورے (کامل) انسان پر کیا جاتا ہے۔ وائرس، بیکٹیریا اور تمام جراثیم کہ جو ماں کے بدن میں ہوتے ہیں بعض اوقات بچے کو بھی اس بیماری میں مبتلا کر دیتے ہیں یا بعض اوقات بچے کی نشوونما کو خراب کر دیتے ہیں اور بچہ غیر معمولی طور پر بڑا ہونے لگتا ہے [2]

---

[1] بیوگرافی پیش از تولد ص ۴۸

[2] بیوگرافی پیش از تولد ص ۱۸۲

ماں کی نفسیاتی کیفیت کا جنین پر اثر

ماہرین کے درمیان یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ کیا ماں کی نفسیاتی کیفیات جنین کی روح پر اثر انداز ہوتی ہیں یا کہ نہیں؟

بعض ماہرین کہتے ہیں کہ ماں اگر شدید خوف اور اضطراب سے دوچار ہو تو رحم مادر میں موجود بچے پر بھی اس کا اثر ہوگا اور ممکن ہے کہ وہ بھی ڈرپوک بن جائے اور اسی طرح ماں کا حسد اور کینہ بھی جنین کی روح پر اثر ڈالتا ہے اور ممکن ہے یہ دو صفتیں اس کی طرف منتقل ہو جائیں۔ اس کے برعکس خوش خلقی، انسان دوستی، ایمان، شجاعت اور مہر و محبت کہ جو ماں میں موجود ہو وہ بچے کی نفسیات اور اعصاب پر بھی اچھا اثر ڈالتی ہیں۔ یہ ماہرین کہتے ہیں کہ ماں کے پیٹ میں بچہ ماں کا ایک حقیقی عضو ہوتا ہے لہذا جیسے ماں کی نفسیاتی کیفیات اور افکار اس کے اپنے جسم پر اثر انداز ہوتے ہیں اسی طرح سے بچے پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ البتہ بعض جنین شناس اور بچے کی نفسیات کے ماہرین نے اس بات کو رد کر دیا ہے اور اس امر کے غلط ہونے کو ثابت کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ دوران حمل ماں کے افکار اور اس کی نفسیاتی کیفیت ممکن نہیں ہے کہ مستقیماً بچے کے اعصاب اور نظریات پر اثر انداز ہو۔

ڈاکٹر جلالی لکھتے ہیں:

> ماں اور جنین کے درمیان مستقیم ربط نہیں ہے۔ بلکہ ماں اور بچے کے درمیان رابطہ ناف کے ذریعے سے ہے اور اس ناف میں کوئی اعصاب نہیں ہیں کہ جو سلسلہ اعصاب کو ہدایت کرے بلکہ بند ناف میں خون کی رگیں ہوتی ہیں لہذا

جیسا کہ گزشتہ لوگوں کا خیال رہا ہے کہ اعصاب اور ہیجانی کیفیت بچے پر اثر انداز ہوتی ہے ایسا نہیں ہو سکتا [۱]

البتہ حق اس دانشور کے ساتھ ہے اور یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ حاملہ عورت کے افکار اور نفسیاتی کیفیات بلا واسطہ بچے کی روح اور اعصاب پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ البتہ یہ بات بھی درست نہیں کہ کوئی یہ کہے کہ ماں کے افکار اور جذبات بچے پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتے بالواسطہ طور پر بچے کے اخلاق اور نظریات پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے مندرجہ ذیل تین نکات کی طرف توجہ فرمائیں۔

۱۔ انسان کی روح اور جسم ایک دوسرے سے مربوط اور وابستہ ہے۔ انسانی جسم کی بیماری اور صحت، اور اعصاب اور جسمانی قویٰ کی قوت اور کمزوری یہاں تک کہ بھوک اور سیری انسان کے طرز تفکر اور اس کے اخلاق پر اثر انداز ہوتی ہے انسان کی اخلاقی شخصیت اس کے خاص مزاج اور اس کے اعصاب اور مغز کی تعمیر کے انداز سے کسی حد تک وابستہ ہے۔ روحِ سالم بدنِ سالم ہی میں ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ غذا کی کمی یا نقدان اعصاب اور مغز کو برے اخلاق اور ہیجانی کیفیت کے ظہور پر ابھارے۔

۲۔ جنین اسی غذا سے استفادہ کرتا ہے کہ جو ماں کے اندرونی نظام میں تیار ہو کر اس تک پہنچتی ہے۔ بچہ جب تک رحم مادر میں زندگی گزارتا ہے غذا کے اعتبار سے ماں کے تابع ہوتا ہے۔ ماں کی غذا کی کیفیت بچے کی جسمانی اور نفسیاتی پرورش پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

ڈاکٹر جلالی لکھتے ہیں:

جو چیز بھی ماں کی سلامتی کے لیے مؤثر ہے وہی جنین کی سلامتی کے لیے مؤثر ہے اگر ماں کی غذا میں کیلشیم کی کمی ہوگی تو یہ کمی بچے کی ہڈیوں اور دانتوں کی تعمیر پر اثر انداز ہوگی [۲]

---

[۱] روان شناسی کودک ص ۱۸۸

[۲] روان شناسی کودک ص ۲۲۲

۳۔ یہ بات یقینی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ انسان کا شدید اضطراب اور ہیجان اس کے سارے بدن بشمول اس کے نظامِ ہضم کے اثر انداز ہوتا ہے۔ رنج وغم کی زیادتی یا خوف کی شدت کھانے کی طلب کو کم کر دیتی ہے اور غذا صحیح طور پہ ہضم نہیں ہوتی۔ نظام ہضم خراب ہو جاتا ہے، نظمِ اعصاب بگڑ جاتا ہے اور غدودوں کے معین اور طبعی نظام میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔

ان تین مقدمات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ماں کے افکار اور روحانی کیفیات اگر مستقیماً بچے کے اعصاب اور مغز کی طرف منتقل نہیں ہوتیں تاہم ان امور کا تعلق ماں کے نظام ہضم سے ہے اور بچے کی خوراک کا تعلق ماں ہی کے نظام ہضم اور غذائی کیفیت سے ہے اور یہ کیفیت بچے کی روح اور مستقبل کی شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہے اس لحاظ سے یہ قطعی طور پہ کہا جا سکتا ہے کہ ماں کی نفسیاتی کیفیات اور افکار بدون شک بچے کی روح نفسیات پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کی تعمیر شخصیت میں مؤثر ہیں۔

ماں کا شدید غصہ یا اضطراب یا شدید خوف اس کے عمومی مزاج اور نظام ہضم کو دگرگوں کر دیتا ہے اس کے اعصاب اس کے باعث خلل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ غیر معمولی کیفیت جیسے ماں کے جسم و جان کے لیے باعث ضرر ہے اسی طرح اس کے رحم میں موجود بچے کی غذائی کیفیت کے لیے خرابی کا سبب ہے۔

ممکن ہے اس صورت میں بچے کے اعصاب اور مغز ایک ایسی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہو جائیں کہ جو بعد میں ظاہر ہو۔

ڈاکٹر جلالی لکھتے ہیں:

> ماں کو پیش آنے والے شدید ہیجانی کیفیات اور ناراحت کر دینے والے امور مسلماً بچے کے مزاج اور رشد کے لیے باعث ضرر ہیں۔ چونکہ اس طرح کی کیفیات نظام کو خراب کر دیتی ہیں اور غیر طبعی غدود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے باعث نظام ہضم اپنا کام صحیح طور پہ انجام نہیں دے سکتا۔ شاید یہی ایک وجہ ہو کہ بچہ جو اعصاب رکھتا ہے اور بہت سی نفسیاتی بیماریاں اس میں پیدا ہو سکتی ہیں انہی ہیجانی

کیفیات کی وجہ سے ممکن ہے ایام حمل ہی میں بچہ ضائع ہو جائے[1]

ایک حاملہ خاتون کہ جو جسم اور روح کے اعتبار سے بالکل سکون میں ہو۔ خوش و خرم، باایمان ہو، انسان دوست ہو، مہر و محبت سے بسر کرنے والی ہو، سالم جسم اور پاک روح کی حامل ہو تو اس کے رحم میں زندگی گزارنے والا بچہ بھی جسم و جاں کے اعتبار سے پُرسکون ہو گا۔ ایسا پُرامن اور سالم ماحول بچے کی پرورش، جسمانی نشو و نما اور روحانی شخصیت پر بہت زیادہ اثر انداز ہو گا۔ اس کے برعکس ایک بے ایمان، حاسد، کینہ پرور، غصیلی، ڈرپوک، پریشان حال اور نفسیاتی مریض ماں بچے کے نظامِ غذا کو تباہ کر دے گی، اس کی روحانی آرام کو ختم کر دے گی، اس کے لیے بُرے اخلاق اور نفسیاتی بیماریوں کے لیے فضا سازگار بنا دے گی۔

اس ضمن میں

"ماہرین نفسیات نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ نفسیاتی امراض میں مبتلا ۶ فیصد بچے یہ بیماری ماں سے وراثت میں پاتے ہیں چنانچہ اگر ایک ماں صحیح و سالم ہو تو اس کا بچہ بھی ایک صحیح و سالم نظامِ اعصاب کا حامل ہو گا۔ اگر کوئی عورت چاہے کہ اس کا بچہ صحیح و سالم، شاداب اور عقلی قوتوں کے اعتبار سے بے نقص ہو تو اُسے چاہیے کہ بچے کی ولادت سے پہلے اپنی سلامتی کے بارے میں فکر کرے"[2]

"ماحول کے عوامل بچے کے جسمانی اور نفسیاتی رشد و تکامل پہ اثر انداز ہوتے ہیں"[3]

---

[1] روان شناسی کودک ص۲۲۲

[2] اطلاعات، شمارہ ۱۰۳۵۵، کودک ج ۱ ص۱۱۹

[3] بہ گرانی پیش از تولد ص۱۲۵

حاملہ خواتین کو ایک نصیحت

حاملہ خواتین کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ بھاری چیزوں کے اٹھانے، زیادہ سخت کام کرنے اور تھکا دینے والے امور سے اجتناب کریں۔ کیوں کہ ماں کے لیے تھکا دینے والے اُمور بچے کے امن و آرام کو بھی درہم برہم کر دیتے ہیں اور اس کے لیے بھی ناراضی کا سامان بنتے ہیں یہاں تک کہ ممکن ہے ایسے کاموں کی وجہ سے حمل ساقط ہو جائے۔

حمل کے آخری مہینوں میں عورت کے لیے سفر ضرر رساں ہوتا ہے۔ اگر اہم مسئلہ نہ ہو تو بہتر ہے کہ سفر ترک کر دیا جائے۔ البتہ ہلکے پھلکے افعال اور چھوٹی موٹی فعالیت نہ صرف یہ کہ باعث ضرر نہیں ہے بلکہ ماں اور بچے ہر دو کی صحت و سلامتی کے لئے مفید ہے۔

ڈاکٹر جلالی لکھتے ہیں:

ماں کی زیادہ خستگی خون میں زہریلے مواد کا موجب بنتی ہے اور چونکہ یہی خون جنین کی غذا بھی بنتا ہے لہذا بچے کی نشو و نما پر اثر انداز ہوتا ہے[1]

---

[1] روانشناسی کودک ص ۲۲۲

صاف ستھری فضا

رحمِ مادر میں نشو و نما پانے والا بچہ آکسیجن کا احتیاج مند ہوتا ہے۔ البتہ جنین خود سانس نہیں لیتا اور بلاواسطہ کھلی ہوا سے استفادہ نہیں کرتا بلکہ اس آکسیجن سے استفادہ کرتا ہے کہ جو ماں کے تنفس کے ذریعے سے مہیا ہوتی ہے۔ ماں نہ صرف اپنے بدن کی ضرورت کے مطابق آکسیجن فراہم کرتی ہے بلکہ جنین کی ضرورت کو بھی پورا کرتی ہے۔ اگر ماں صاف ستھری اور اچھی ہوا میں سانس لے گی تو اپنی سلامتی کی بھی حفاظت کرے گی اور بچے کی بھی سلامتی اور پرورش کے لیے مددگار ثابت ہو گی۔ لیکن اگر وہ گندی اور زہریلی ہوا میں سانس لے گی تو اپنی اور بچے دونوں کی صحت کو نقصان پہنچائے گی۔ لہٰذا حاملہ خواتین کو نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ کوشش کریں کہ صاف ستھری ہوا سے استفادہ کریں۔ صاف فضا میں چلیں اور گہرا سانس لیں۔ اسی طرح تھکا دینے والی شب بیداری سے بھی سختی سے اجتناب کریں۔

انہیں یہ بھی چاہیے کہ تمبا کو نوشی سے بچیں۔ اور مسموم فضا میں سانس لینے سے اجتناب کریں۔ سوتے ہوئے کمرے کی کھڑکی کھلی رکھیں تاکہ تازہ ہوا داخل ہو سکے کیونکہ آکسیجن کی کمی ممکن ہے بچے پر ناقابل تلافی منفی اثر ڈالے۔

ڈاکٹر جلالی کا وہ پیرا ہم پھر آپ کی توجہ کے لیے نقل کرتے ہیں جو قبل ازیں آپ کی نظروں سے کبھی گزر چکا ہے۔

جسم کے بہت سے نقائص مثلاً ہونٹوں کی خرابی، پاؤں کے تلوے کا سیدھا ہونا یہاں تک کہ آنکھوں کا بہت چھوٹا ہونا کہ جنہیں پہلے موروثی سمجھا جاتا ہے آج کل ماحول بالخصوص دوران حمل آکسیجن کی کمی جیسے عوامل کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے۔[1]

---

[1] روانشناسی کودک ص۱۹۰

اسقاطِ حمل

اسلام کے نقطہ نظر سے عورت اور مرد کی باہمی رضامندی سے حمل ٹھہرنے کو روکنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اگر بیوی اور شوہر اولاد کی خواہش نہ رکھتے ہوں تو پھر وہ بے ضرر گولیوں، ٹیکوں یا انزال وغیرہ کے ذریعے حمل ٹھہرنے کو روک سکتے ہیں۔ البتہ بچے کی پیدائش کو روکنا اسلام کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام کی خواہش ہے کہ مسلمانوں کی نسل جتنی بھی ہو سکے پھولے پھلے لیکن بہر حال ایسا کرنا حرام نہیں ہے لیکن جب نر اور مادہ سیل ترکیب پاکر عورت کے رحم میں ٹھہر جائیں اور ایک زندہ موجود وجود میں آجائے تو وہ اسلام کی نظر میں محترم ہے اور زندگی کا حق رکھتا ہے۔ وہ نیا موجود اگرچہ بہت چھوٹا ہی کیوں نہ ہو صلاحیت کے اعتبار سے انسان ہے۔ وہ ایسا موجود زندہ ہے کہ بڑی تیزی کے ساتھ اور حتمی طور پر غیر معمولی طریقے سے کمالات انسانی کی طرف رواں دواں ہے۔ وہ ننھا منا سا موجود جو کہ اتنی غیر معمولی استعداد رکھتا ہے اپنی مہربان ماں سے امید رکھتا ہے کہ وہ اس کے لیے پرامن ماحول فراہم کرے گی تاکہ وہ پرورش پا کر ایک کامل انسان بن سکے۔ اگر اس بالیاقت اور باشرف وجود کو تو نے ساقط کر دیا اور اسے قتل کر دیا تو تم قاتل قرار پاؤ گی اور اس برے عمل کے ارتکاب کی وجہ سے قیامت کے دن تمہاری بازپرس کی جائے گی۔

دینِ مقدس اسلام کہ جو تمام لوگوں کے حقوق کا نگہبان ہے اس نے اسقاطِ حمل اور اولاد کشی کو کلی طور پہ حرام قرار دیا ہے۔ اسحاق بن عمار کہتے ہیں کہ میں نے حضرت موسیٰؑ ابن جعفرؑ کی خدمت میں عرض کیا کہ وہ عورت جو حاملہ ہونے سے ڈرتی ہے کیا آپ اسے اجازت دیتے ہیں کہ

وہ دوا کے ذریعے حمل گرادے۔ آپؑ نے فرمایا:

نہیں، میں ہرگز اس چیز کی اجازت نہیں دیتا۔

راوی نے پھر کہا: ابتداء دورِ حمل کہ جب ابھی نطفہ ہوتا ہے، اس وقت کے لیے کیا حکم ہے؟

فرمایا:

انسان کی خلقت کا آغاز اسی نطفے سے ہوتا ہے[1]

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ ○ بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ ○

یعنی۔ قیامت کے دن ماں باپ سے پوچھا جائے گا کہ تم نے کس جرم میں اپنے بے گناہ بچے کو مار ڈالا؟ (تکویر - ۸، ۹)

اسقاطِ حمل نہایت بُرا عمل ہے کہ جس سے اسلام نے روکا ہے۔ علاوہ ازیں یہ کام ماں کے جسم وجاں کے لیے بھی باعثِ ضرر ہے۔ ڈاکٹر پاک نژاد نے اسقاط حمل کے بارے میں منعقدہ ایک کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

...... یہ ثابت ہوا ہے کہ اسقاطِ حمل اوسط عمر میں کمی کر دیتا ہے نیز سائنسی تحقیق کے مطابق اسقاطِ حمل عورتوں کے نفسیاتی اعتدال (BALANCE) کو تباہ کر دیتا ہے[2]

۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۳ء تک کے نیویارک کے اعداد وشمار کے مطابق ۲۹۰۱ عورتوں کی وفات اسقاط حمل کی وجہ سے ہوئی دس سال کے دوران میں اس تعداد میں ۱۶۲۴٪ کا اضافہ ہوا۔ چلی میں ۱۹۶۳ء کے ریکارڈ کے مطابق ۳۹٪ عورتوں کا انتقال اسقاط حمل کی وجہ سے ہوا۔

---

[1] وسائل الشیعہ، ج ۱۹، ص ۱۵

[2] مکتب اسلام سال ۱۳، شمارہ ۸۔

اسقاط حمل کا ایک بہانہ فقر و تنگ دستی بھی قرار دیا جاتا ہے۔ بعض نادان ماں باپ فقر و غربت کے بہانے سے اپنے بے گناہ بچوں کو ضائع کر دیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ فقر و تنگ دستی ایک بڑی مصیبت ہے اور بہت سارے خاندان اس میں مبتلا ہیں اور اسے برداشت کرنا بہت مشکل کام ہے۔ لیکن اسلام اسے بچہ ضائع کرنے کا عذر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ آخر بے گناہ بچے کا کیا قصور ہے کہ ماں باپ اسے حق حیات سے محروم کر دیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا۔

اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو ہم ہیں کہ جو تمہیں اور انہیں روزی دیتے ہیں۔ اولاد کو قتل کرنا یقیناً ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ بنی اسرائیل آیہ ۳۱

اب جب کہ ایک انسان کا نطفہ ٹھہر چکا ہے ماں باپ کو چاہیے کہ سختی کو برداشت کریں ممکن ہے یہی بچہ کل ایک ممتاز اور عظیم شخصیت بن جائے کہ ماں باپ اور معاشرہ جس کے وجود سے استفادہ کریں۔ ممکن ہے اسی بچے کے وجود کی برکت سے خاندان کی اقتصادی حالت بھی بہتر ہو جائے یا اس کے ذریعے سے فقر و تنگ دستی سے نجات مل جائے۔

اس کے علاوہ بھی کئی بہانے پیش کیے جاتے ہیں۔ مثلاً گھر سے باہر کی مشغولیات، دفتر کی مصروفیات یا بچوں کی کثرت وغیرہ لیکن یہ ایسے عذر نہیں ہیں کہ ان کی وجہ سے شریعت یا عقل اس بُرے عمل کو جائز قرار دے دے۔

اسقاطِ حمل نہ یہ کہ اسلام کی نظر میں ایک بُرا اور حرام عمل ہے بلکہ اس بڑے گناہ کے لیے کفارہ بھی مقرر کیا گیا ہے کہ جو جنین کی عمر کے اختلاف کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اگر ساقط شدہ بچہ نطفہ ہو تو اس کا خون بہا سونے کے بیس دینار ہے، اگر علقہ اور لوتھڑا ہو تو سونے کے چالیس دینار، اگر مُضغہ اور گوشت کی حد تک پہنچ چکا ہو تو سونے کے ساٹھ دینار، اگر اس میں ہڈی بن گئی ہو تو سونے کے اسّی دینار

اگر وہ انسان کی صورت اختیار کر چکا ہو تو سونے کے سو دینار اور اگر اس میں روح بھی پیدا ہو چکی ہو تو اس کی دیت ایک کامل انسان کی دیت ہوگی[1]

خانم افسر الملوک عاملی نے اس بارے میں ایک خوبصورت نظم کہی ہے:

بخواب آمد مرا طفل جنینی
بگفتا مادرم را گر بہ بینی

بگو مادر خطا از من چہ دیدی
کہ بی جرم بہ خونم در کشیدی

درون کودکی آرام بودم
کجا محکوم بر اعدام بودم؟

بخونم چنگ و دندان تیز کردی
زخون دامانِ خود، لبریز کردی

بدم تازہ رسیدہ میہمانت
نہ آسیبی رسید از من بجانت

بہ مہمان بایدت مہمان نوازی
نہ بیرحمانہ اش نابود سازی!

تو فکر خرج و برجم را نمودی
زجسم کوچکی جان در ربودی

مرا روزی بہرہ بود مادر
ولی افسوس ننمودی تو باور!

تو گردش را بہ من ترجیح دادی
اساس ظلم در عالم نہادی!

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۹ ص ۱۶۹

امید کودکان بر مام باشد
چو مادر باشدش آرام باشد
امیدم بود رویت را ببینم
گلی از گلشن حسنت بچینم
دلم میخواست پستانت زنم چنگ
غمت بیرون نمایم از دل تنگ
دلم می خواست از شیرت بنوشم
صدای مادرم آید بگوشم !
امیدم بود بنشستم ببینی
کنار تختخوابم خوش نشینی
امیدم بد دبستانم فرستی
دهی تعلیم، درس حق پرستی
بیایم از ره و شادت نمایم
سرود کودکان بهرت سرایم
امیدم بود گردم من جوانی
زمان پیریت قدرم بدانی
زمان پیریت غمخوار باشم
بهر کاری برایت یار باشم
من اینک روح پاکم در جنان است
مکانم در جوار حوریان است !
کنون کن توبه، استغفار، شاید
خدای مهربان رحمت نماید
تمنا دارد آخر از توانی

پیام را بہ مادر ہارسانی [1]

نظم کا ترجمہ:

چھوٹا سا سقط شدہ بچہ میرے خواب میں آیا اور بولا میری ماں کو دیکھو تو اس سے کہو!
امّی! تو نے میری کیا خطا دیکھی تھی کہ بے جرم ہی تو نے میرا خون بہا دیا۔
میں تو بچپن میں آرام سے رہتا تھا میرے قتل کا حکم کیسے سرزد ہو گیا۔
میرے خون پر تو نے اپنے پنجے اور دانت تیز کئے۔ اور اپنے دامن کو میرے خون سے آلودہ کر لیا۔
میں ابھی تیرے پاس تازہ مہمان آیا تھا اور مجھ سے ابھی آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔
چاہیے کہ آنے والے مہمان کی مہمان نوازی کی جائے نہ کہ بے رحمی سے اس کا کام تمام کر دیا جائے۔
تجھے میرے بارے میں خرچ کی فکر میں تھی لہذا تو نے میرے ننھے سے جسم سے جان نکال دی۔
ماں! میں تو اپنی روزی ساتھ لے کر آیا تھا لیکن افسوس کہ تجھے اس کا یقین نہ آیا۔
تو نے گھومنے پھرنے کو مجھ پر ترجیح دی اور دنیا میں ظلم کی بنیاد ڈالی۔
بچوں کی امید تو ماں ہی ہوتی ہے اور جب ماں کے پاس ہو تو وہ سکھ چین سے ہوتے ہیں۔
مجھے تمنا تھی کہ میں تیرے چہرے کو دیکھوں اور میں بھی تیرے گلشن حسن سے ایک پھول چنوں۔
میرا دل چاہتا تھا کہ میں تیرے پستان سے دودھ پیوں اور یوں تیرے دل کا غم دور کر دوں۔
میری آرزو تھی کہ تیرا دودھ پیوں اور تیری آواز میرے کانوں میں پڑے۔
میرا خیال تھا کہ جب تو میری مسکراہٹ کو دیکھے گی تو میرے بستر کے پاس خوش خوش بیٹھے گی۔
آرزو تھی کہ تو مجھے مدرسہ بھیجتی، مجھے تعلیم دیتی اور حق پرستی کا درس پڑھاتی۔
میں گھر آتا اور تجھے خوش کرتا اور بچوں والے گیت تجھے سناتا۔

---

[1] مجلہ مکتب اسلام سال ۲۱۔ شمارہ ۱۲

خیال تھا کہ جب میں جوان ہو جاؤں گا تو پھر مجھے اپنے بڑھاپے میں میری قدر معلوم ہوتی۔
تیرے بڑھاپے میں میں تیرا غم خوار ہوتا اور ہر کام میں تیرا مددگار بنتا۔
میں کہ ایک پاک روح بن کر اب جنت میں ہوں اور میرا مقام یہاں حوروں کے جوار میں ہے
اب تو توبہ اور استغفار کر کہ شاید خدائے مہربان اپنی رحمت کرے۔
اے افسر میری تجھ سے یہ تمنا ہے کہ تو میرا یہ پیغام تمام ماؤں تک پہنچا دے۔

پیدائش کی مشکلات

بچہ عموماً رحم مادر میں نو ماہ اور دس دن رہتا ہے۔ ولادت سے پہلے کی زندگی نہایت حساس اور پرخطر ہوتی ہے کیوں کہ بچے کا مستقبل اسی سے وابستہ ہوتا ہے۔ بچہ اس عرصے میں ایسے محیط میں زندگی گزارتا ہے کہ جس کا نظم و نسق اس کے اپنے ہاتھ میں نہیں ہوتا اور وہ دسیوں قسم کے جسمانی اور روحانی خطروں میں گھرا ہوتا ہے اور خود انہیں دور کرنے کی اس میں طاقت نہیں ہوتی۔ جب اس مرحلے سے جان سالم لے کر آجائے اور نو ماہ کی خطرناک مسافرت کو تمام کر بیٹھے تو اب ناچار ہے کہ ایک اور دشوار مرحلے کا آغاز کرے اور یہ مرحلہ پیدائش کا ہے۔ بچے کی پیدائش کا مرحلہ ایسا سادہ اور معمولی سا نہیں بلکہ نہایت دشوار اور حساس ہے۔

بچہ نو ماہ میں اتنا بڑا ہو جاتا ہے، خاص طور پر دیگر اعضاء کی نسبت اس کا سر بڑا ہو چکا ہوتا ہے کہ اب اسے ناچار ایک نئے سخت مرحلے سے گزرنا ہی ہوتا ہے۔ اس تنگ مقام تولد سے باہر آنا انسان کی پوری زندگی میں انجام پانے والے کسی بھی سفر سے خطرناک تر ہے۔ ممکن ہے بچہ پس جائے یا اس کی کوئی ہڈی ٹوٹ جائے۔ ممکن ہے اس کی نازک اور ظریف ہڈیاں کہ جو ابھی باہم اچھی طرح ملی نہیں ہوتیں، ان پر دباؤ پڑ جائے جس سے بچے کے اعصاب اور مغز کو نقصان پہنچے۔

ایک ماہر لکھتے ہیں:

> پیدائش کا مرحلہ ممکن ہے کہ بچے میں دائمی لیکن غیر مرئی قسم کے نفسیاتی نقائص پیدا ہونے کا سبب بنے۔ نفسیاتی بیماریوں کے معالجین کے نزدیک پیدائش کے عمل کو انسان کی پوری زندگی کی ماہیت کے لیے ایک مؤثر عامل شمار ہوتا ہے ان ماہرین

کی نظر میں پیدائش ایک انقلابی تبدیلی کا نام ہے کہ جو بچے کے ماحول اور زندگی میں پیدا ہوتی ہے اور اچانک وہ خاص قسم کی آسودگی اور آرام جو جنین کی زندگی میں اسے حاصل ہوتا ہے وہ ختم ہو جاتا ہے۔ ان کی نظر میں پیدائش کے موقع پر خوف اور اضطراب انسان کی نفسیات کا حصہ بن جاتا ہے اور انسان کی آئندہ زندگی ہمیشہ نامعلوم یادوں کے آثار کے تحت گزرتی ہے۔ زندگی کا ایک پر آرام دور جنین کا اور پھر مستقل زندگی کی طرف نہایت مشکل عالم میں ورود[1]

ڈاکٹر جلالی لکھتے ہیں:

جب بچہ دنیا میں آتا ہے تو عموماً چند گھنٹے وہ ایک دباؤ کے تحت رہتا ہے اور سب سے زیادہ مشکل سے اس کا سر دوچار ہوتا ہے کہ جو اس کے بدن کے تمام تر اعضاء میں سے سب سے بڑا ہوتا ہے اگر پیدائش غیر معمولی طریقے سے ہو تو دنیا میں آنے کے مرحلے اور بھی سخت تر ہو جاتے ہیں اور بچہ عام حالات کی مشکلات برداشت کرنے کے علاوہ میکانیاتی آلات کی مصیبت بھی برداشت کرتا ہے اور زیادہ تر بچوں کا ضائع ہو جانا یا پیدائش کے تھوڑی ہی مدت بعد ان کا مر جانا ایسی ہی مصیبتوں اور مشکلوں کے باعث ہوتا ہے فالج اور دیوانگی وغیرہ جیسے بدنی اور ذہنی نقائص جو بچوں میں دکھائی دیتے ہیں عموماً ایسی ہی مصیبتوں کا باعث ہوتے ہیں جو دنیا میں آتے وقت ان پر وارد ہوتی ہیں۔[2]

بنابریں پیدائش کا مرحلہ ایک معمولی اور غیر اہم مرحلہ نہیں بلکہ ایک دشوار اور قابل توجہ عمل ہے کیونکہ زچہ اور بچہ کی سلامتی اس سے وابستہ ہوتی ہے۔ تھوڑی سے غفلت یا سہل انگاری ماں یا بچے کے لیے ناقابل تلافی نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔ یہاں تک کہ ممکن ہے اس مرحلے میں ان کی جان چلی جائے۔ لیکن آج کل کی حالت میں جب مراکز پیدائش، ڈاکٹر اور دوا زیادہ تر لوگوں کی دسترس

---

[1] بیوگرافی پیش از تولد ص ۱۶۰

[2] روانشناسی کودک ص ۱۹۳

میں ہے تو احتمالی خطرات سے بچا جا سکتا ہے۔

لہذا حاملہ خواتین کو نصیحت کی جاتی ہے کہ اگر وہ ڈاکٹر یا مرکز پیدائش تک دسترس رکھتی ہیں تو وقت سے پہلے ان کی طرف رجوع کریں اور بچے کی پیدائش کے وقت کے بارے میں معلومات حاصل کریں اور جب ضروری ہو تو فوراً مرکز پیدائش کی طرف رجوع کریں چونکہ یہ مراکز گھر سے ہر لحاظ سے بہتر ہوتے ہیں کیونکہ اولاً تو وہاں ڈاکٹر، دوا اور نرس موجود ہیں اور ضروری موقع پر وہ زچہ کی فوری مدد کر سکتے ہیں اور اگر پیدائش میں کوئی غیر معمولی مسئلہ پیش آجائے تو ہر لحاظ سے وسائل موجود ہوتے ہیں اور جلدی سے اس کی مدد کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر وہ گھر میں ہو اور پیدائش میں کوئی غیر معمولی مسئلہ پیش آجائے تو اسے ڈاکٹر یا مرکز پیدائش تک لے جانے میں ممکن ہے کہ زچہ اور بچہ کی جان خطرے میں پڑ جائے۔

دوسرا یہ کہ مرکز پیدائش کے کمرے صحت و سلامتی کے نقطۂ نظر سے گھر کے کمروں سے بہتر ہوتے ہیں اور عورت وہاں زیادہ آرام کر سکتی ہے۔

تیسرا یہ کہ وہاں پر رشتے داروں اور ہمسایہ عورتوں کا پیدائشی عمل میں دخل نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی مختلف قسم کی آراء ہوتی ہیں جب کہ ان کی وکالت عموماً علم و آگہی کی بنا پر نہیں ہوتی لہذا ضرر رساں ہو سکتی ہے۔

مرد کی بھی اس ضمن میں بھاری ذمہ داری ہوتی ہے۔ شرعاً اور عقلاً اس کا فریضہ ہے کہ ان حساس اور خطرناک لمحات میں اپنی بیوی کی مدد کرے اور احتمالی خطرات سے اسے اور بچے کو بچانے کی کوشش کرے۔ اگر اس کی غفلت یا سستی کی وجہ سے بیوی یا بچہ تلف ہو جائے یا پھر انہیں جسمانی یا روحانی لحاظ سے نقصان پہنچے تو ایسا بے انصاف شوہر شریعت اور ضمیر کی عدالت میں مجرم قرار پائے گا اور روز قیامت اس سے بازپرس کی جائے گی۔ علاوہ ازیں اس جہان میں بھی وہ اپنے کام کا نتیجہ بھگتے گا اور اگر آج سہل انگاری یا کنجوسی یا کسی اور بہانے سے بیچاری بیوی کی مدد نہیں کرے گا تو بعد میں مجبور ہو گا کہ اس کے مقابلے میں سوگنا خرچ کرے لیکن پھر بھی زندگی کا پہلا سکون واپس نہیں لایا جا سکے گا البتہ اگر ڈاکٹر اور پیدائش گاہ تک رسائی نہ ہو تو پھر گھر میں ہی یہ کام ان دائیوں کے ذریعے انجام پانا چاہیے کہ جو اس کام میں مہارت رکھتی ہیں۔

اس ضمن میں مندرجہ ذیل ہدایات کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

۱۔ پیدائش کے کمرے کا درجہ حرارت معتدل اور طبیعی ہونا چاہیے اور سرد نہیں ہونا چاہیے کیونکہ زبردست دباؤ، درد اور کئی گھنٹوں کی زحمت کی وجہ سے عورت کی طبیعت عام حالات سے مختلف ہوجاتی ہے اُسے پسینے آتے ہیں اور بچے کے لیے بھی ٹھنڈ لگنے اور بیماری کا خطرہ ہوتا ہے، جب بچے کی پیدائش کا دشوار گزار مرحلہ گزر جائے تو اگر کمرے کی ہوا کا درجہ حرارت سرد ہوا تو احتمال قوی ہے کہ زچہ کو ٹھنڈ لگ جائے اور اس کی وجہ سے کئی بیماریاں پیدا ہو جائیں۔ علاوہ ازیں ٹھنڈی ہوا نومولود کے لیے بھی نہایت خطرناک ہے کیونکہ بچہ رحم مادر میں طبیعی حرارت کے ماحول میں رہا ہوتا ہے کہ جس کا درجہ حرارت تقریباً ۳۷،۵ سینٹی گریڈ ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ دنیا میں آتا ہے تو کمرے کا درجہ حرارت عموماً اتنا نہیں ہوتا اس وجہ سے نومولود کہ جو بہت ناتوان ہوتا ہے اور اُس میں یہ طاقت نہیں ہوتی کہ اپنے بدن کے لیے درکار حرارت اور توانائی مہیا کر سکے، اُسے ٹھنڈ لگ جانے کا اور بیماری میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے اور ان نومولودگان کا معالجہ بھی نہایت مشکل ہوتا ہے۔ اس طرح بیمار ہونے والے زیادہ تر بچے مر جاتے ہیں۔

۲۔ محتاط رہنے کی ضرورت ہے کہ کمرے کی ہوا مٹی کے تیل یا کوئلے کے جلنے کی وجہ سے دھوئیں سے مسموم اور آلودہ نہ ہو جائے کیونکہ ایسی مسموم ہوا میں سانس لینا زچہ اور بچہ ہر دو کے لئے ضرر رساں ہے۔

۳۔ بہتر ہے کہ پیدائش کے کمرے میں حتی المقدور خلوت ہو۔ غیر متعلق عورتوں کو کمرے سے باہر کر دیں کیونکہ ایسی خواتین علاوہ اس کے کہ ان کی ضرورت نہیں ہوتی وہ زچہ کے لیے ناراضی اور شرمندگی کا باعث بنتی ہیں۔ کمرے کی ہوا کو کثیف کرتی ہیں علاوہ ازیں پیدائش کے وقت زچہ کی شرم گاہ کی طرف دیگر عورتوں کا دیکھنا حرام ہے اور وہ اس عالم میں اپنی ستر پوشی نہیں کر سکتی۔

امام سجاد علیہ السلام نے ایک موقع پر جب کہ ایک حاملہ عورت کا وضع حمل ہونے والا تھا تو فرمایا عورتوں کو باہر نکال دیں کہ کہیں زچہ کی شرم گاہ کی طرف نہ دیکھیں[1]

حاملہ عورت اگر اپنی ذمہ داری پر عمل کرے تو اسے چاہیے کہ پوری احتیاط کے ساتھ اپنے حمل کے زمانے کو اختتام تک پہنچائے اور ایک سالم اور بے عیب بچہ معاشرے کو سونپے۔ اس نے ایک بہت ہی قیمتی کام انجام دیا۔ ایک صحیح اور بے نقص انسان کو وجود بخشا ہے کہ جو ہمیشہ اپنی ماں کا مرہون حق رہے گا۔ اس کے علاوہ اس نے انسانی معاشرے کی بھی خدمت انجام دی ہے کہ اُسے ایک بے نقص اور قیمتی انسان عطا کیا ہے ممکن ہے اس کا وجود معاشرے کے لیے خیرات و برکات کا موجب قرار پائے اور یہ عظیم خدمت خدا کے نزدیک بھی بے اجر نہیں رہے گی۔ ایک روز پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہاد کی فضیلت کے بارے میں گفتگو فرما رہے تھے۔ ایک عورت نے عرض کی یا رسول اللہ! کیا عورتیں جہاد کی فضیلت سے محروم ہیں۔ پیغمبرؐ نے فرمایا! نہیں عورت بھی جہاد کا ثواب حاصل کر سکتی ہے۔ جس وقت عورت حاملہ ہوتی ہے اور اس کے بعد اس کا وضع حمل ہوتا ہے اور جب بچے کو دودھ دیتی ہے یہاں تک کہ بچہ دودھ پینا چھوڑ دیتا ہے تو اس ساری مدت میں عورت اُس مرد کی طرح ہے جو میدان کارزار میں جہاد کر رہا ہو۔ اگر اس عرصے میں عورت فوت ہو جائے تو بالکل ایک شہید کے مقام پر ہے[2]

---

[1] وسائل الشیعہ۔ جلد ۱۰ صفحہ ۱۱۹

[2] مکارم الاخلاق ج ۱ ص ۲۶۸

ولادت کے بعد

بچہ پیدا ہوتا ہے تو ہوا اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس سے وہ سانس لینا شروع کرتا ہے۔ عمل تنفس کے آغاز کے بعد وہ زندگی میں پہلی مرتبہ روتا ہے۔ بچے کا یہ رونا اس ہوا کے ردِ عمل کے طور پر ہوتا ہے کہ جو اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہوتی ہے۔ اگر وہ سانس نہ لے اور نہ روئے تو اُسے پاؤں سے پکڑ کر اُلٹا کر کے اس کے سر پہ آہستہ آہستہ ہاتھ مارتے ہیں تاکہ وہ سانس لے پھر اس کے بندِ ناف کو باندھ دیتے ہیں اور بچے کے بدن سے ابھری ہوئی ناف کو جراثیم سے پاک کسی چیز سے کاٹ دیتے ہیں اور ناف کو بھی جراثیم سے پاک کرتے ہیں۔ اس کے بعد بچے کو صابن کے ساتھ نیم گرم پانی سے نہلا کر لباس پہنا دیتے ہیں۔ کچھ دیر تک بچے کو غذا کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر نیم گرم پانی میں چینی ملا کر اس کے منہ میں قطرہ قطرہ ڈالتے ہیں۔

بچہ عموماً حالت خواب میں رہتا ہے۔ اسے استراحت کی بہت ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اس کی زندگی کی داخلی و خارجی حالت بالکل تبدیل ہو چکی ہوتی ہے۔ پہلے وہ ماں کی غذا ہی سے استفادہ کرتا تھا لیکن اب اس کا اپنا نظامِ ہضم کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔

پہلے بچہ اس آکسیجن سے استفادہ کرتا تھا جو ماں کے تنفس سے حاصل ہوتی تھی لیکن اب اس کا اپنا نظامِ تنفس کام کرنا شروع کر دیتا ہے اور اس کا اپنا نظام اس کے لیے آکسیجن حاصل کرتا ہے اور بدن کے لیے نقصان دہ ہوا خارج کرتا ہے۔ اس کی داخلی کیفیت میں بہت بڑی تبدیلی واقع ہو چکی ہوتی ہے۔ نیز اس کی خارجی حالت اور ماحول بھی بدل چکا ہوتا ہے۔

پہلے وہ رحم مادر میں تھا جہاں درجۂ حرارت ۵ء۳۷ درجے سنٹی گریڈ تھا لیکن اب وہ اس ماحول میں ہوتا ہے کہ جس کا درجہ حرارت مستقل نہیں ہے پیدائش کے وقت بھی اس کے جسم و روح پر مختلف قسم کا دباؤ پڑتا ہے جس کی تلافی کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس عالم میں بچہ ایک ایسے بیمار کے مانند ہوتا ہے جو عمل جراحی کے بعد ابھی ابھی آپریشن تھیٹر سے باہر آیا ہو جسے ہر چیز سے زیادہ استراحت کی ضرورت ہوتی ہے ۔ وہ سانچے میں ڈھل کے نکلی ہوئی نئی نئی ایسی مشینری ہے کہ جس کی دیکھ بھال اور خصوصی توجہ ضروری ہے ۔ اس لحاظ سے بچے کے لیے جو بہترین کام انجام دیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے لیے آرام دہ ماحول فراہم کیا جائے تا کہ وہ آرام کر سکے ۔ جس سخت عمل سے گزرا ہے اس کی تلافی کر سکے اور اپنی زندگی کو نئے حالات کے مطابق ڈھال سکے ۔

ڈاکٹر جلالی لکھتے ہیں ۔

> بچے کو ہنسانا ، اسے مستقل چومتے رہنا اور ہر وقت اسے اٹھا کر دوسروں کو دکھانا اور اس کے کپڑے تبدیل کرتے رہنا تا کہ وہ خوبصورت دکھائی دے یہ سب ایسے نامطلوب کام ہیں کہ جن سے اجتناب کرنا چاہیے ۔ بچہ کھیل کا سامان نہیں ہے اسے پھلنے پھولنے کے لیے آرام دہ ماحول کی ضرورت ہے ۔ ایسا کام نہیں کرنا چاہیے کہ اس کے آرام کی داخلی حالت درہم برہم ہو جائے ۔ اس کے سامنے اونچی آواز میں نہیں بولنا چاہیے ۔ اسے کبھی اونچا ، کبھی نیچا نہیں کرنا چاہیے ۔ اسی طرح اسے چومنا چاٹنا ، اس پہ دباؤ ڈالنا یہ سب چیزیں اس کے منظم رشد اور آرام پر اثر انداز ہوتی ہیں ۔[1]

ماں کو بھی استراحت اور تقویت کی شدید ضرورت ہوتی ہے ۔ دوران حمل نو ماہ کے عرصے میں اس نے بہت مشکلات اٹھائی ہوتی ہیں وہ بالکل ضعیف اور ناتواں ہو چکی ہوتی ہے ۔ خاص طور پر وضع حمل کے دوران وہ جس جانگسل مرحلے سے گزری ہوتی ہے اور جس طرح

---

[1] روانشناسی کودک ص ۲۲۳

سے اس کا خون بہا ہوتا ہے اس کا تن بدن خستہ حال ہو چکا ہوتا ہے۔ اس عالم میں مہربان شوہر پر لازم ہے کہ وہ اس کے لیے مکمل آرام کے اسباب فراہم کرے اور غذا کے ذریعے سے اس کی قوت بحال کرے۔ اگر ڈاکٹر اور دوا کی ضرورت ہو تو پوری طرح سے معالجہ کرے تاکہ اس کی جسمانی ناتوانی دور ہو سکے اور صحت معمول پر آسکے اور پہلے کی سی سلامتی اور شادابی پلٹ سکے تاکہ وہ اپنے سالم جسم اور شاداب روح سے پھر سے زندگی بسر کرنے لگے اور اپنے بچوں اور شوہر کی خدمت کر سکے۔ اگر شوہر نے اس امر میں کوتاہی کی تو اس کی شریکۂ حیات رنجور اور ناتواں رہ جائے گی اور اس کا نتیجہ بعد میں شوہر کو خود بھگتنا پڑے گا۔

ماں کا دودھ بہترین غذا ہے

ماں کا دودھ بچے کے لیے بہترین، کامل ترین اور سالم ترین غذا ہے اور کئی پہلوؤں سے ہر غذا پر ترجیح رکھتا ہے۔ مثلاً

۱۔ غذائی مواد کی کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے ماں کا دودھ بچے کی مشینری سے بالکل ہم آہنگ ہوتا ہے کیونکہ بچہ نو ماہ رحمِ مادر میں رہا ہوتا ہے اور ماں کی داخلی مشینری سے تیار شدہ غذا سے استفادہ کرنا اس کی عادت ہو چکی ہوتی ہے۔ اب وہی مواد دودھ کی صورت میں بچے کی غذا بن کے آتا ہے۔

۲۔ ماں کا دودھ چونکہ طبعی طور پر اور خام حالت میں استعمال ہوتا ہے اس لیے اپنی غذائیت برقرار رکھتا ہے۔ جب کہ اس کے برخلاف گائے وغیرہ کے دودھ کو ابالا جاتا ہے اور پھر استعمال کیا جاتا ہے۔ جس سے اس کے اندر موجود بعض غذائی مواد ضائع ہو چکا ہوتا ہے۔

۳۔ بچے کی صحت کے اعتبار سے ماں کا دودھ زیادہ قابلِ اعتبار ہے اور خارجی جراثیم سے آلودہ نہیں ہوتا کیونکہ ماں کے پستان سے سیدھا بچے کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے دودھ ممکن ہے مختلف برتنوں اور ہاتھوں کے جراثیم سے آلودہ ہو جائیں۔

۴۔ ماں کا دودھ ہمیشہ تازہ بہ تازہ استعمال ہوتا ہے۔ جب کہ کوئی دوسرا دودھ ممکن ہے، پڑا رہنے سے خراب ہو جائے۔

۵۔ ماں کے دودھ میں ملاوٹ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ جب کہ دوسرے دودھ میں اس کا امکان موجود ہے۔

۶۔ ماں کا دودھ بیماریوں کے حامل جراثیم سے آلودہ نہیں ہوتا اور بچے کی صحت وسلامتی کے لیے زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔ جب کہ کوئی دوسرا دودھ ممکن ہے بعض جراثیم سے آلودہ ہو جو بچے کو بھی مبتلا اور آلودہ کر دیں۔

اسہال شیر، تپ مالت اور سل گا وجیسی بیماریاں دوسرے دودھ ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ ان اور دیگر وجوہات کی بنا پر ماں کا دودھ بچے کے لیے یقینی طور پر بہترین اور سالم ترین غذا ہے۔ جو بچے ماں کا دودھ پی کر پلتے ہیں وہ دوسرے بچوں کی نسبت زیادہ تندرست ہوتے ہیں اور بیماریوں کے مقابلے کی زیادہ طاقت رکھتے ہیں اور ایسے بچوں میں شرح اموات بھی کم تر ہے۔

ماں اگر بچے کو دودھ دے تو ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ عمل حیض میں زیادہ تر تاخیر ہو جاتی ہے اور نتیجے کے طور پر دیر سے حاملہ ہوتی ہے۔

دین اسلام نے بھی ماں کے دودھ کو بچے کے لیے بہترین غذا قرار دیا ہے اور اسے بچے کا ایک فطری حق گردانا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ما من لبن رضع به الصبی اعظم برکتہ علیہ من لبن اُمّہ۔

بچے کے لیے کوئی دودھ ماں کے دودھ سے بڑھ کر بہتر نہیں ہے۔[1]

ماں کا دودھ اسلام کی نظر میں اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ ماں کی تشویق کے لئے اس کا بہت زیادہ ثواب مقرر کیا گیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

فاذا ارضعت کان لہا بکل مصتہ کعدل عتق محرر من ولد

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۵۔ ص ۱۷۵

اسماعیل فاذا فرغت من رضاعہ ضرب ملک کریم علی جنبھا وقال : استانفی العمل فقد غفرلک۔

یعنی ہر عورت جو اپنے بچے کو دودھ پلائے گی بچہ جتنی مرتبہ بھی اس کے پستان سے دودھ پیے گا اللہ تعالیٰ ہر مرتبہ اُسے اولادِ اسماعیل میں سے غلام آزاد کرنے کا ثواب عطا کرے گا جس وقت دودھ پلانے کی مدت ختم ہوگی تو ایک مقرر فرشتہ اس کے پہلو پہ ہاتھ رکھ کے کہے گا: زندگی کو نئے سرے سے شروع کر کیوں کہ اللہ نے تیرے پچھلے گناہ بخش دیئے ہیں۔[1]

میڈیکل کا ایک بین الاقوامی سمپوزیم کہ جو شیراز کی یونیورسٹی میں منعقد ہوا اس میں تمام تر ماہرین کی مشترکہ رائے یہ تھی کہ کوئی غذا بھی اور وٹامن کا حامل کوئی اور مواد بھی شیر مادر کی جگہ نہیں لے سکتا۔

ڈاکٹر سیمین واقفی کہتی ہیں :

باعث افسوس ہے کہ بہت سی جوان مائیں مغربی ماؤں کی تقلید میں کوشش کرتی ہیں کہ اپنے نونہالوں کو خشک دودھ اور دیگر خاص طرح کی مصنوعی غذائیں دیں اور یہ بچپن میں بچے کی صحیح غذائی ضروریات کے بالکل مخالف ہے جوان مائیں یہ جان لیں کہ کوئی مصنوعی دودھ بھی ماں کے دودھ کے برابر نہیں ہو سکتا وہ اپنے بچے کو اس بہترین غذا سے محروم نہ رکھیں کہ جو طبیعی طور پہ اس کے لئے تیار کی گئی ہے۔[2]

ایک اور ماہر لکھتے ہیں :

شیر مادر ایک ایسی بے مثال غذا ہے کہ جو فطرت نے بچے کے لئے بنائی ہے اور کوئی غذا بھی اُس کا بدل نہیں ہو سکتی۔ لہذا حتی الامکان کوشش کی جانی چاہیے کہ بچے کو ماں کا دودھ پلایا جائے اور اگر ماں کا دودھ نہ آتا ہو تو اسے کوشش

---

[1] وسائل الشیعہ۔ جلد ۱۵۔ ص ۱۷۵

[2] بہداشت جسمی روانی کودک ص ۹۳

کرنا چاہیے کہ اس بہت بڑے نقص کو مختلف اور دودھ لانے والی غذائیں کھا کر دور کرے [1]

ذمہ دار اور آگاہ خواتین کہ جو اپنے بچوں کی صحت و سلامتی سے دلچسپی رکھتی ہیں اپنے عزیز بچوں کی اپنے دودھ کے ذریعے سے پرورش کریں اور انہیں اس عظیم نعمت الٰہی سے محروم نہ رکھیں کہ جس کا نظام اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے پہلے سے بنا رکھا ہے۔ سمجھدار خواتین ماں کی عظیم ذمہ داری سے آشنا ہوتی ہیں اور بچے کے جسم و جان پہ دودھ کے اثر کو سمجھتی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ خوشی سے اپنے آپ کو بچے کی صحت و سلامتی کے لیے نثار کرتی ہیں اور انہیں شیر جان سے سیراب کرتی ہیں۔ ایسی ہی خواتین کو ماں کا نام دیا جا سکتا ہے نہ ان بیوقوف اور خود غرض ماؤں کو کہ جن کا دودھ اترتا ہو لیکن وہ طرح طرح کے بے جا بہانوں سے اپنے پستان کو خشک کر لیتی ہیں اور بے گناہ بچے کو خشک دودھ سے پالتی ہیں۔ یہ خود غرض عورتیں اتنا بھی جذبہ ایثار نہیں رکھتیں کہ عزیز بچوں کی صحت و سلامتی کی خاطر اپنے آپ کو دودھ پلانے کی زحمت دیں۔

علاوہ ازیں جو خواتین بغیر کسی عذر کے بچے کو دودھ نہیں پلاتیں ممکن ہے کہ وہ بعض جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جائیں۔ سرطانِ پستان ان خواتین میں زیادہ دیکھا گیا ہے کہ جو اپنے بچے کو دودھ نہیں پلاتیں۔

اس مقام پر ضروری ہے کہ جو مائیں بچوں کو دودھ پلاتی ہیں انہیں متوجہ کیا جائے کہ ماں کی غذا کی کیفیت دودھ کی کیفیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ دودھ ماں کی غذا سے تیار ہوتا ہے۔ لہٰذا دودھ پلانے والی ماں کی غذا کو متنوع اور مختلف ہونا چاہیے اور اُسے ہر طرح کی غذا سے استفادہ کرنا چاہیے۔ مختلف پھلوں، سبزیوں اور دانوں کا گاہے بگاہے استعمال کرنا چاہیے تاکہ وہ خود بھی تندرست رہیں اور ان کا دودھ بھی بھرپور اور کامل رہے۔

مائع اور آبدار غذائیں مفید ہیں۔ ماں کو یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ صحیح اور اچھی غذا قیمتی ترین اور خوش مزہ ترین غذائیں ہیں بلکہ کامل غذا کے لیے ایک ایسا پروگرام بنایا جا سکتا ہے کہ جس میں غذا

---

[1] اعجاز خوراکیہا ص ۲۵۸

متنوع بھی ہو، کم خرچ بھی، بھرپور بھی اور حفظانِ صحت کے مطابق بھی ہو۔ اس سلسلے میں غذا شناسی کی کتابوں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ جن میں سے ایک کتاب میں لکھا ہے:

ماہرین غذا دودھ پلانے والی عورتوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ ہر طرح کی غذا سے کچھ نہ کچھ استفادہ کرے خصوصاً لوبیا، چنے، دودھ، تازہ مکھن، ناریل، زیتون، اخروٹ، بادام، میٹھے اور رسیلے پھل مثلاً خربوزہ، تربوز، گرما، سردا اور ناشپاتی وغیرہ[1]

اسلام نے بھی اس امر کی طرف توجہ دی ہے کہ ماں کی غذا اس کے دودھ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

اگر تم نے اپنے بچے کو دودھ پلانے کے لیے کسی یہودی یا عیسائی عورت کا انتخاب کیا ہے تو انہیں شراب پینے اور سور کا گوشت کھانے سے روکو[2]

اگر ماں بیمار ہو جائے اور اُسے دوا کی ضرورت پیش آجائے تو اسے چاہیے کہ اس امر کی طرف توجہ رکھے کہ اس کی دوائیں اس کے دودھ پر بھی اثر کریں گی اور ممکن ہے بچے کی صحت و سلامتی کو اس سے نقصان پہنچے۔ ماں کو نہیں چاہیے کہ اپنے آپ یا غیر آگاہ افراد کے کہنے سے کوئی دوا استعمال کرے بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ڈاکٹر کی طرف رجوع کرے اور اسے یہ بھی بتائے کہ میں بچے کو دودھ پلا رہی ہوں۔

---

[1] اعجاز خوراکیہا ص۲۵۱ تا ص۲۵۶

[2] مستدرک جلد ۲ ص۶۲۴

ماں کے دودھ کے ساتھ ساتھ

بچے کی اصلی غذا ماں کا دودھ ہی ہے لیکن جب تک فقط غذا کا انحصار ماں کے دودھ پر ہو تو بہتر ہے کہ ہر روز کچھ مچھلی کا تیل اور کچھ پھل اسے دیئے جائیں تاکہ وٹامن اور معدنی مواد کے اعتبار سے اس کی خوراک جامع تر ہو جائے اور بچہ بہتر رشد کرے۔ بچہ جوں جوں بڑا ہوتا جاتا ہے اُس کی غذائی ضرورت بھی بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ مرحلہ آجاتا ہے کہ وہ ماں کے دودھ سے سیر نہیں ہوتا۔ اس صورت میں چاہیے کہ دوسری غذاؤں سے شیر مادر کی کمک کے طور پر استفادہ کیا جائے۔ چار مہینوں کے بعد اور زیادہ سے زیادہ چھ مہینے کے بعد چاہیے کہ بچے کو دوسری غذاؤں سے آشنا کیا جائے ضروری ہے کہ بچے کی غذا، سادہ اور مائع کی صورت میں ہو۔ مختلف پھلوں کا جُوس بچے کے لیے مفید ہوتا ہے۔

سبزیوں کو اُبال کر ان کا پانی بھی بچے کو دیا جا سکتا ہے۔ یخنی بچے کی نشوونما کے لیے مفید ہوتی ہے۔ جب بچے کے دانت نکل آئیں تو نسبتاً سخت غذا دی جا سکتی ہے۔ مثلاً پکے ہوئے آلو، اُبلے ہوئے انڈے، بسکٹ، تازہ پنیر اور کچھ روٹی اور مکھن، چاول، تازہ پھل وغیرہ۔ بچے کی غذا مختلف قسم کی ہونی چاہیے۔ لیکن دھیان رہے کہ اتنی مقدار میں اسے غذا دی جائے جتنی اسے ضرورت ہے نہ کہ اس سے زیادہ۔

ماں کے دودھ کی ممانعت

چند مواقع ایسے ہیں کہ جہاں بچہ ماں کے دودھ سے محروم ہو جاتا ہے۔

۱۔ اس صورت میں کہ جب ماں کسی متعدی مرض میں مبتلا ہو مثلاً ٹی۔بی وغیرہ

۲۔ جب ماں کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہو مثلاً دل کی بیماری، اور ڈاکٹر اسے دودھ دینے سے منع کردے۔

۳۔ جب ماں پاگل پن یا مرگی کے مرض میں مبتلا ہو۔

۴۔ جب ماں خون کی شدید کمی کا شکار ہو اور دودھ دینا اس کے لیے باعث ضرر ہو۔

۵۔ جب ماں شراب یا منشیات کی عادی ہو کیونکہ ان کا زہر دودھ میں داخل ہو جاتا ہے اور بچے کو بھی مسموم کر دیتا ہے۔

ایسے مواقع پر کہ جب دودھ دینا ماں کے لئے باعث ضرر ہو یا بچے کو بیماری میں مبتلا کردے یا اُسے مسموم کردے تو چاہیے کہ بچے کو ماں کا دودھ نہ پلایا جائے اور کسی دوسرے طریقے سے اُس کو غذا فراہم کی جائے۔ اگر دودھ پلانے والی عورت حاملہ ہو جائے تو وہ بتدریج اپنے بچے کا دودھ روک سکتی ہے اور اسے کوئی اور خوراک دے سکتی ہے۔

دودھ پلانے کا پروگرام

ماہرین نے بچے کو دودھ پلانے کے لیے دو طریقے تجویز کیے ہیں۔
بعض کا یہ نظریہ ہے کہ بچے کو غذا یا خوراک دینے کے لیے چاہیے کہ منظم اور دقیق پروگرام بنایا جائے اور بچے کو اسی پروگرام کے تحت معین وقفوں میں دودھ پلایا جائے۔ دو مرتبہ دودھ پلانے کے درمیان بعض نے تین گھنٹے کا وقفہ معین کیا ہے اور بعض نے چار گھنٹے کا۔ یہ ماہرین کہتے ہیں کہ ہر تین یا چار گھنٹے بعد بچے کو دودھ دینا چاہیے اور اس دوران بچے کو دودھ دینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔
بعض دوسرے ماہرین نے اس روش کو پسند نہیں کیا اور انہوں نے آزاد پرورش یا طبعی تنظیم کو تجویز کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب بھی بچہ بھوکا ہو جاتا ہے اور وہ بھوک کا تقاضا کرتا ہے تو اسے دودھ دینا چاہیے۔
بعض کی نظر میں دوسری روش اس پہلی سے بہتر ہے کہ جس میں معین وقفوں کی پابندی کی جاتی ہے چاہے جب دودھ دیا جائے بچہ بھوکا بھی نہ ہو۔ ان کے نزدیک دوسری تجویز علاوہ بر اینکہ عملی لحاظ سے آسان ہے ظاہراً پسندیدہ اور معقول تر ہے کیونکہ پہلے مجوزہ پروگرام کا تقاضا اگرچہ یہ ہے کہ بچے کو بھوک کے وقت دودھ دیا جائے نہ کہ معین اوقات میں لیکن اس کے باوجود یہ بہت سے نقائص کا حامل ہے۔ بہرحال دوسری تجویز بھی نقائص سے خالی نہیں، ذیل کے چند نکات کی طرف توجہ کیجئے۔
۱۔ بچے میں بھوک اور پیاس کو یقینی طور پر مشخص نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بچہ بات تو نہیں کر

سکتا کہ اپنے داخلی محسوسات کو بیان کر سکے اگرچہ ابتدائی طور پر بچہ بھوک مٹانے کے لیے دودھ پیتا ہے لیکن آہستہ آہستہ وہ دودھ پینے کا عادی بن جاتا ہے اور پستان کو چوسنے سے لطف اٹھاتا ہے۔ اس صورت میں کبھی کبھی بچے کے اندرونی احساسات اُسے تحریک کرتے ہیں کہ وہ روئے تاکہ دوسروں کی محبت کو اپنی طرف جذب کر سکے۔ ماں بھی اُسے چپ کرانے کے لیے اپنا دودھ پیش کر دیتی ہے۔ بچہ بھوک کے بغیر بھی روتا ہے اور ماں اس خیال سے دودھ دیتی ہے کہ وہ بھوکا ہے۔ کبھی بھوک کی وجہ سے دودھ پیتا ہے اور کبھی بغیر بھوک کے بھی۔ البتہ واضح ہے کہ نامنظم طور پر اور بھوک کے بغیر غذا کا استعمال جیسے بڑوں کے لیے نقصان دہ ہے اسی طرح بچوں کے لیے بھی کہ جن کا نظامِ ہضم ابھی قوی نہیں ہوتا۔ نامنظم طور پر دودھ دینے سے ممکن ہے بچے کے نظامِ ہضم میں کوئی خلل پیدا ہو جائے اور بچہ کسی بیماری کے لیے تیار ہو جائے۔ اس بنا پر غذا دینے کی آزاد روش بچے کی صحت و سلامتی کے لیے بے ضرر نہیں ہو سکتی کیونکہ اس میں بھوک کے وقت کو مشخص نہیں کیا جا سکتا۔ بچوں میں بہت سی بیماریاں نامنظم اور زیادہ غذا کے باعث پیدا ہوتی ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

زیادہ کھانے اور کھانے کے بعد پھر کھانے سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ زیادہ کھانے والا بیمار بھی زیادہ ہوتا ہے۔[1]

۲۔ جو بچہ شروع ہی سے بغیر کسی نظم و حساب کے دودھ پیتا ہے وہ شروع سے بے نظمی کا عادی ہو جاتا ہے اور اپنی آئندہ کی زندگی میں نظم و ضبط سے عاری ایک فرد ثابت ہو گا۔

۳۔ جو بچہ جب بھی روتا ہے اور اس کے منہ میں پستان دے دیا جاتا ہے وہ اسی عمر سے گریہ وزاری کا عادی ہو جاتا ہے اور وہ آئندہ بھی رونے دھونے اور منت

---

[1] مستدرک ج ۳ ص ۸۲

سماجت کو ہی مقصد تک پہنچنے کا بہترین وسیلہ سمجھنے لگتا ہے۔ کاموں میں صبر اور حوصلے سے کام نہیں لیتا۔ وہ چاہتا ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے مقصد تک پہنچ جائے اگرچہ اس کے لیے رونا پڑے یا التماس کرنی پڑے یا ذلت کا بوجھ اٹھانا پڑے۔

۴۔ ایسے بچے کے ماں باپ اور مربیوں کو راحت و آرام نہیں ملتا کیونکہ وہ وقت بے وقت رونے لگتا ہے اور دودھ مانگتا ہے۔

انہیں نقائص کی وجہ سے میں پہلی روش کو دوسری روش پر ترجیح دیتا ہوں اور منظم طریقے سے غذا دینے کو بچے کی جسمانی اور روحانی نشوونما کے لیے بہتر سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر جلالی اس بارے میں لکھتے ہیں:

اگر کسی ماہر ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق بچے کے لیے دودھ پلانے کا منظم پروگرام بنایا جائے تو اس میں اسی کے مطابق عادت پیدا ہو جائے گی اور عادت خود اس بات کا سبب بنے گی کہ اس عادت سے مربوط طرز عمل اور رد عمل سے مائیں بچے کی سیری اور بھوک کی حالت سے آگاہ ہو سکیں۔

ثانیاً انسان کے بہت سارے کام ہر روز چونکہ عادت کے مطابق انجام پانے چاہئیں لہٰذا دودھ دینے کا یہی منظم پروگرام اس کی بعد کی عادتوں کے لئے اچھی بنیاد بن جائے گا۔[1]

رسل لکھتا ہے:

آج کل ہر ماں بچے کی پرورش کے سادہ سے حقائق جانتی ہے اور اس کی تربیت کرتی ہے۔ مثلاً وہ جانتی ہے کہ بچے کو مناسب وقفوں سے غذا دینا کتنا ضروری ہے نہ کہ جب وہ رو رہا ہو۔ اسے علم ہے کہ ایسی پابندی اس لیے رکھی جاتی ہے کہ یہ غذا کے ہضم ہونے میں بہت فائدہ مند ہے.....

علاوہ ازیں تربیت اخلاق کے حوالے سے بھی مطلوب ہے کیونکہ شیرخوار بچے

---

[1] روان شناسی کودک ص ۲۲۴

اس سے زیادہ حیلہ ساز اور مکرباز ہوتے ہیں کہ جتنا بڑے ان کے بارے میں تصور کرتے ہیں۔ بچے جب دیکھتے ہیں کہ رونے دھونے سے ان کا مقصود حاصل ہوجاتا ہے تو وہ پھر اسی روش کو اختیار کرتے ہیں اور بعد میں جب کہ وہ دیکھتے ہیں کہ شکوہ اور آہ وزاری کی عادت بجائے اس کے کہ نوازش کا باعث بنے نفرت کا سبب بنتی ہے تو تعجب کرتے ہیں اور ان کو بہت دھچکا پہنچتا ہے اور دنیا ان کی آنکھوں میں سرد، خشک اور بے روح ہوجاتی ہے۔[1]

لیکن چند نکات کی طرف توجہ ضروری ہے۔

۱۔ سب بچوں کے لیے اور دودھ پینے کے تمام عرصے کے لیے غذا کا ایک جیسا پروگرام معین نہیں کیا جا سکتا کیونکہ نظام ہضم اور بچے کی غذائی ضرورت تمام مدت میں ایک جیسی نہیں رہتی۔ نوزائیدہ بچہ کا معدہ اور نظام ہضم آغاز تولد سے چالیس پچاس روز تک بہت چھوٹا ہوتا ہے کہ جو تھوڑے سے دودھ سے بھر جاتا ہے۔ نوزائیدہ بچہ تھوڑے سے دودھ سے سیر ہوجاتا ہے لیکن تھوڑی ہی مدت بعد پھر بھوکا ہو جاتا ہے اس مدت میں چاہیے کہ دودھ پلانے کے درمیان فاصلہ کم ہو مثلاً ۱½ سے ۲ گھنٹے تک۔ لیکن اس کے بعد بچے کے بڑے ہونے کے اعتبار سے وقفوں میں زیادہ اضافہ کیا جا سکتا ہے مثلاً تین گھنٹے یا چار گھنٹے یہاں تک کہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ کا۔

۲۔ سب بچے جسمانی ساخت اور نظام ہضم کے اعتبار سے ایک جیسے نہیں ہوتے بعض کو جلدی بھوک لگ جاتی ہے اور بعض کو دیر سے لہٰذا ان سب کے لئے ایک جیسا پروگرام تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ سمجھدار اور ہوشمند مائیں اپنی ذمہ داری کا احساس کرتی ہیں اور اپنے بچوں کی صحت و سلامتی کی خواہاں ہوتی ہیں۔ وہ بذاتِ خود اپنے بچے کے لیے خاص شرائط و حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے غذا کا پروگرام منظم کرتی ہیں اور ضروری ہو تو وہ ڈاکٹر کی طرف رجوع کر کے مشورہ بھی کرتی ہیں۔

---

[1] در تربیت ص ۸۷

۲۔ جب بھی بچے کو دودھ دیا جائے تو اسے پوری طرح سیر کرنا چاہیے البتہ خواتین کو اس امر کی طرف متوجہ رہنا چاہیے کہ بچہ بالخصوص نوزاد بچہ جلدی سو جاتا ہے اور معمولاً دودھ پیتے پیتے سو جاتا ہے جب کہ ابھی وہ سیر نہیں ہوا ہوتا اس صورت میں ماں بچے کی پشت پر آہستہ آہستہ ہاتھ مار سکتی ہے تاکہ وہ بیدار رہے اور پوری طرح سے سیر ہو جائے۔

۴۔ جب بچے کو دودھ دینے کا منظم پروگرام ترتیب پا جائے تو اس پر صحیح طرح سے عمل درآمد کی طرف توجہ رکھنا چاہیے اور مقرر اوقات کے درمیان میں اسے ہرگز دودھ نہیں دینا چاہیے اگرچہ وہ گریہ وزاری کرے۔ اس کام میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرنا چاہیے تاکہ بچہ آہستہ آہستہ اس غذائی پروگرام کا عادی ہو جائے۔ اس کے بعد وہ خود بخود معین اوقات میں بیدار ہونے لگے گا اور دودھ کا تقاضا کرنے لگے گا۔ ایسی صورت میں ایک صابر، بردبار اور منظم بچہ بھی پروان چڑھے گا اور آپ بھی آرام و راحت میں رہیں گے۔

۵۔ بچے کے غذائی پروگرام کو اس طریقے سے مرتب کرنا چاہیے کہ آدھی رات کے بعد سے صبح تک اُسے غذا نہ دی جائے تاکہ وہ اس طرز عمل کا عادی ہو جائے۔ اس صورت میں بچہ بھی آرام و راحت سے سو جائے گا اور ماں بھی چند گھنٹے سکون اور چین سے آرام کر سکے گی۔

۶۔ ہر مرتبہ بچے کو دودھ دینے کے بعد پستان کو تھوڑی سی رُوئی سے صاف کرنا چاہیے۔ یہ کام بچے کی صحت و سلامتی کے لیے بھی مفید ہے اور پستان کو زخمی ہونے سے بھی بچاتا ہے۔

۷۔ جب بچہ دُودھ پیتا ہے تو عموماً کچھ ہوا اس کے معدے میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور اس کے لیے ناراحتی کا سبب بنتی ہے اور اس کے پیٹ میں ہوا بھر جاتی ہے۔ دودھ دینے کے بعد آپ اُسے بلند کر سکتے ہیں اور آہستہ آہستہ اس کی پشت پر ہاتھ مار سکتے ہیں تاکہ ہوا نکل جائے اور بچہ دل کی تکلیف میں مبتلا نہ ہو۔

۸۔ بچے کو دونوں پستانوں سے دودھ دیں تاکہ آپ کا دودھ خشک نہ ہو اور آپ پستان کے درد میں مبتلا نہ ہوں۔ ایک خاتون کہتی ہے:

حضرت صادق علیہ السلام نے مجھ سے فرمایا اپنے بچے کو ایک پستان سے دودھ نہ دے بلکہ دونوں پستانوں سے دودھ دے تاکہ اسے کامل غذا مل سکے۔[۱]

۹۔ دودھ پلانے والی ماؤں کو چاہیے کہ وہ زیادہ تھکا دینے والے کام اور شدید غصہ سے اجتناب کریں کیونکہ ماں کی ناراضی اور شدید غصے کے اثرات دودھ پر مرتب ہوتے ہیں کہ جو بچے کے لیے نقصان دہ ہیں۔

۱؎ وسائل۔ ج ۱۵ ص ۱۷۶

ماں کا دودھ نہ ہو تو؟

اگر ماں کا دودھ بچے کی ضرورت پوری نہ کرتا ہو تو ماں کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اسے اپنے دودھ سے بالکل ہی محروم کر دے بلکہ اس کا جتنا بھی دودھ ہے وہ بچے کو پلائے اور کمی کو دوسرے دودھ اور غذا سے پورا کرے۔ لیکن اگر ماں کا دودھ بالکل نہ ہو (البتہ ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے) یا وہ دودھ دینے سے معذور ہو تو پھر گائے کے دودھ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے کہ جو کسی حد تک شیر مادر سے ملتا جلتا ہے یا پھر خشک دودھ سے۔ اگر گائے کے دودھ سے استفادہ کیا جائے تو چاہیے کہ مندرجہ ذیل نکات کی طرف توجہ رکھی جائے۔

۱۔ گائے کا دودھ عموماً ماں کے دودھ سے زیادہ گاڑھا اور زیادہ بھاری ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے چاہیے کہ اس میں کچھ اُبلا ہوا پانی ملا دیا جائے اس حد تک کہ وہ ماں کے دودھ جیسا ہو جائے اس میں تھوڑی سی چینی بھی ملا لینی چاہیے۔

۲۔ دودھ کو پندرہ منٹ تک کے لیے اُبال لینا چاہیے تاکہ اگر اس میں جراثیم ہوں تو وہ ختم ہو جائیں۔

۳۔ بچے کو جو دودھ پلایا جائے نہ زیادہ گرم ہو اور نہ زیادہ سرد بالکل ماں کے دودھ جیسی اس کی حرارت ہو۔

۴۔ ہر مرتبہ بچے کو دودھ پلاتے وقت فیڈر (دودھ والی بوتل) کو دھو لینا چاہیے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دودھ خراب ہو جائے اور بچہ بیمار ہو جائے۔

۵۔ کوشش کرنی چاہیے کہ حتی المقدور تازہ اور صحیح دودھ سے استفادہ کیا جائے۔

اگر آپ بچے کی غذا کے لیے خشک دودھ سے استفادہ کرنا چاہیں ، تو ضروری ہے کہ اس بارے میں ڈاکٹر سے مشورہ کریں کیونکہ خشک دودھ مختلف قسم کا ہوتا ہے اور ہر قسم کا دودھ ہر بچے اور ہر عمر کے لیے مفید اور مناسب نہیں ہوتا۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر ہی فیصلہ کر کے آپ کی راہنمائی کر سکتا ہے۔ اگر ڈاکٹر کوئی دودھ آپ کے بچے کے لئے تجویز کرے اور وہ آپ کے بچے کے مزاج سے ہم آہنگ نہ ہو تو آپ پھر ڈاکٹر کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

دودھ چھڑوانا

بچے کو پورے دو سال دودھ پلانا چاہیے۔ دو سال دودھ پینا ہر بچے کا فطری حق ہے کہ جو خداوند بزرگ نے اس کے لیے مقرر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ۔

مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔ بقرہ آیہ ۲۳۳

اگر ماں چاہے تو دو سال سے جلدی بھی بچے کو دودھ چھڑوانے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ کم از کم اکیس مہینے اسے دودھ پلا چکی ہو۔

حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔

الرضاع واحد وعشرون شهراً فما نقص فهو جور على الصبي

دودھ پلانے کی مدت کم از کم اکیس ماہ ہے۔ اگر کسی نے اس مدت سے کم پلایا تو یہ بچے پر ظلم ہے۔[۱]

ان دو سالوں میں بچہ آہستہ آہستہ دوسری غذاؤں سے آشنا ہو جاتا ہے۔ ماں رفتہ رفتہ بچے کا دودھ کم کر دیتی ہے اور اس کے بجائے اسے دوسری غذا دیتی ہے۔ دودھ پلانے کی مدت پوری ہونے کے بعد بچے کو دودھ چھڑوایا جا سکتا ہے اور صرف دوسری غذاؤں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ سمجھدار اور معاملہ فہم مائیں خود بہتر جانتی ہیں کہ بچے کے لیے کس طرح

---

[۱] وسائل الشیعہ جلد ۱۵ ص ۱۷۷

کی غذا انتخاب کرنی چاہیے کہ جو بچے کے مزاج سے بھی ہم آہنگ ہو اور غذائیت کے اعتبار سے بھی کامل۔

البتہ بچے کو دودھ چھڑوانا کوئی ایسا آسان کام بھی نہیں۔یقیناً وہ چند روز گریہ وزاری وفریاد کرے گا لیکن صبر واستقامت سے کام لینا چاہیے تاکہ وہ بالکل دودھ چھوڑ دے۔ماں شرعی حد تک دودھ کو برا کہہ سکتی ہے اپنے پستان کو سیاہ اور خراب کر سکتی ہے یا پستان کے سرے کو کڑوا کر سکتی ہے تاکہ بچہ دودھ پینے سے رُک جائے۔

لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے کسی خیالی یا دوسری چیز سے ڈرایا جائے۔اس امر سے غافل نہ رہیے کہ بچے کو ڈرانا کوئی اچھا کام نہیں ہے اس سے اس کے جسم اور روح پر برے اثرات پڑتے ہیں جو بعد میں ظاہر ہوتے ہیں۔

بیٹی یا بیٹا

جونہی عورت حاملہ ہوتی ہے وہ اس مسئلہ میں مضطرب رہتی ہے کہ بیٹا ہوگا یا بیٹی، دعا کرتی ہے نذر مانتی ہے نیاز دیتی ہے کہ بیٹا ہو۔ جب اس کے عزیز رشتے دار ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تمہارے چہرے کے رنگ سے لگتا ہے کہ بیٹا پیدا ہوگا۔ جب کہ اس کے برخلاف اس کے دشمن کہتے ہیں کہ تمہاری آنکھوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیٹی پیدا ہوگی۔ شوہر بھی بیگم سے پیچھے نہیں ہوتا اس کے بھی دل میں بیٹے کی خواہش چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ موقع بے موقع وہ اس بارے میں بات کرتا ہے اور ادھر ادھر کے وعدے کرتا رہتا ہے۔ پیدائش کے وقت سب حاضرین کی توجہ اس مسئلے کی طرف رہتی ہے کہ بیٹا ہے یا بیٹی۔ اگر بیٹی ہو تو ایک دفعہ کمرہ پیدائش میں سرتا پا سکوت ہو جاتا ہے اور چہرے اتر جاتے ہیں لیکن اگر بیٹا ہو تو خوشی کا شور و شین بلند ہو جاتا ہے۔ ماشاءاللہ سے آواز گونج اٹھتی ہے۔ جب بچے کی پیدائش کی خبر باپ تک پہنچتی ہے تو اگر بیٹا ہو تو خوش ہو جاتا ہے، ادھر ادھر دوڑتا ہے، مٹھائیاں اور پھل لاتا ہے، ڈاکٹر اور دوا کا بندوبست کرتا ہے۔ کہتا پھرتا ہے بچے کا دھیان رکھنا اسے کہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے۔ بیگم کے بارے میں احتیاط کرنا کہ کہیں ہلے جلے نہ۔ دائیہ اور نرسوں کو انعام دیتا ہے۔ لیکن اگر بیٹی جنم لے تو اس کا چہرہ ہی اتر جاتا ہے۔ کونے میں جا بیٹھتا ہے اپنی بدبختی پر روتا ہے اور اپنی زندگی کو تلخ بنا لیتا ہے۔ بیمار بیوی کی طرف اعتنا نہیں کرتا اس کی احوال پرسی اور عیادت نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اسے ایسا غصہ آتا ہے کہ طلاق کی دھمکی دینے لگتا ہے۔ ہمارے انحطاط پذیر اور بے تربیت معاشرے کی اکثریت میں ایسے ہی غلط افکار اور بری عادت موجود ہے۔ البتہ سب ایسے نہیں ہیں روشنفکر

لوگ بھی موجود ہیں کہ جن کی نظر میں بیٹا اور بیٹی برابر ہے لیکن وہ اقلیت میں ہیں۔

والد عزیز اور والدہ گرامی!

بیٹا ہو یا بیٹی ان میں کیا فرق ہے۔ کیا بیٹی میں انسانیت کم ہوتی ہے؟ کیا اس میں ترقی اور پیش رفت کی صلاحیت نہیں ہوتی؟ کیا وہ ایک مفید اور قیمتی انسان نہیں بن سکتی؟ کیا بیٹی تمہاری اولاد نہیں ہے؟ آخر بیٹوں کا ماں باپ کے لیے کون سا ایسا فائدہ ہے جو بیٹی کا نہیں؟ اگر بیٹی کی کی کوئی اہمیت نہ ہوتی تو اللہ اپنے رسولؐ کی نسل کو فاطمہؑ کے ذریعے کیسے برقرار رکھتا۔ اگر بیٹی کی آپ اچھی پرورش کریں تو وہ بیٹے سے پیچھے نہیں رہے گی تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں آپ کو ایسی خواتین نظر آئیں گی جن میں سے ایک ایک ہزاروں مردوں پر بھاری ہے۔ یہ کیسے غلط افکار ہمارے معاشرے میں پھیل گئے ہیں کہ جن سے عورت کا مقام گر گیا ہے۔ ایسے جاہلانہ اور غلط افکار کے خلاف جہاد کیجیے بیٹے اور بیٹی میں غلط قسم کے فرق کو اپنے ذہن سے نکال دیجیے۔ ذمہ دار اور مفید انسانوں کی تعمیر کے بارے میں سوچیے۔ سودمند اور قیمتی انسان بیٹی بھی ہو سکتی ہے اور بیٹا بھی۔ جس وقت تمہیں بچے کی پیدائش کی خبر ملے اگر وہ صحیح و سالم ہو تو خدا کا شکر کرو کہ وہ پروردگار عالم کا عطیہ ہے اور تمہارے وجود کی یادگار ہے کہ جو زندگی کے حساس اور خطرناک مرحلے سے صحیح و سالم گزر آیا ہے اور اس نے زمین پر قدم رکھا ہے۔

پیغمبر اکرم اور آئمہ اطہار علیہم السلام کی یہی روش تھی۔

جس وقت امام سجاد علیہ السلام کو نومولود کی خبر دی جاتی تو بیٹی یا بیٹے کے بارے میں ہرگز سوال نہ کرتے۔ لیکن جب ان کو بتایا جاتا کہ صحیح و سالم ہے تو خدا کا شکر ادا کرتے [1]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دوستوں کے ساتھ محو گفتگو تھے اسی اثنا میں ایک شخص محفل میں داخل ہوا اور حضور کو خبر دی کہ اللہ نے آپ کو بیٹی عطا کی ہے۔ رسول اللہ اس خبر پہ خوش ہوئے اور اللہ کا شکر ادا کیا آپؐ نے جب اپنے اصحاب کی طرف نظر کی تو ان کے چہروں پر ناراضگی کے آثار ہویدا تھے۔ آپؐ نے برا مانتے ہوئے فرمایا!

---

[1] وسائل۔ ج ۱۵۔ ص ۱۴۳

مالكم؟ ريحانة اشمها ورزقها على الله عز وجل۔

کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ اللہ نے مجھے پھول عطا کیا ہے جس کی مہک میں سونگھتا ہوں اور اللہ نے اس کا رزق دیا ہے۔ ؎۱

اللہ تعالیٰ نے اس بری عادت کی مذمت کی ہے اور قرآن میں فرمایا ہے۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ۔

(سورہ نحل۔ آیہ ۵۸ - ۵۹)

جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی بشارت دی جاتی ہے تو شرم کے مارے اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے، غصہ اس پر چھا جاتا ہے۔ اس بری خبر کے باعث وہ لوگوں سے منہ چھپائے پھرتا ہے۔

؎۱ وسائل الشیعہ۔ ج ۱۵۔ ص ۱۰۲

بچے کا نام

ماں باپ کی حساس اور اہم ذمہ داریوں میں سے ایک بچے کے نام کا انتخاب ہے۔ نام رکھنے کو چھوٹی سی اور غیر اہم چیز نہیں سمجھنا چاہیے۔ لوگ ناموں اور خاندانوں سے اندازہ لگاتے ہیں اور ان کی خوبی اور خوبصورتی کو شخصیت کی پہچان شمار کرتے ہیں جس کسی کا بھی اپنا اور خاندانی نام خوبصورت ہوگا وہ ہمیشہ ہر جگہ سربلند ہوگا اور جس کسی کا نام بھی بُرا ہوگا شرمندہ ہوگا۔ بُرے نام کو اپنا عیب سمجھے گا اور احساس کمتری میں مبتلا رہے گا۔ بعض اوقات بے ادب لوگ اس کا مذاق بھی اُڑائیں گے اور یہ احساس کمتری وہ چاہے نہ چاہے اس کی روح پر بُرے آثار مرتب کرے گا۔ اس وجہ سے اسلام اچھے نام کا انتخاب ماں باپ کی ذمہ داری قرار دیتا ہے اور اسے ان کی اولین نیکی شمار کرتا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،

ہر باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اولاد کے لیے خوبصورت نام انتخاب کرے[1]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا؛

اولاد کے باپ پر تین حق ہیں۔ پہلا یہ کہ اس کا نام اچھا رکھے۔ دوسرا یہ کہ اُسے پڑھنا لکھنا سکھائے تیسرا یہ کہ اس کے لیے شریک حیات ڈھونڈے[2]

---

[1] مستدرک ج ۲ ص ۶۱۸

[2] بحار الانوار ج ۱۰۴ ص ۹۲

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا:

اوّل ما یبرّ الرّجل ولدہ ان یسمّیہ باسم حسن۔

باپ کی پہلی نیکی اولاد کے ساتھ یہ ہے کہ اس کے لیے پیارا سا نام انتخاب کرے[1]

دوسری طرف نام کا انتخاب بہت زیادہ معاشرتی اثر بھی رکھتا ہے۔ نام ہے کہ جو ماں باپ کے مقاصد، افکار اور آرزوؤں کا ترجمان ہوتا ہے اور انکی اولاد کو باقاعدہ مختلف گروہوں اور اہداف میں سے کسی کے ساتھ وابستہ اور ملحق کرتا ہے نام ہی سے سمجھدار ماں باپ کے افکار اور ارمانوں کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ ماں باپ کو اگر کسی خاص شاعر سے تعلق خاطر ہو گا تو وہ اپنے بچے کے لیے اسی کا نام انتخاب کریں گے۔ اگر وہ علم دوست ہوں گے تو علماء میں سے کسی کے نام سے استفادہ کریں گے۔ اگر دیندار ہوں گے تو انبیاء آئمہ اور بزرگانِ دین کے ناموں میں سے کوئی نام چنیں گے۔ اگر وہ ایثار دین کے راستے میں جانبازی اور ستمکاروں کے خلاف جہاد کو پسند کرتے ہوں گے تو محمد، علی، حسنؑ، حسینؑ ابو الفضلؑ عباس، حمزہ، جعفر، ابوذر، عمار اور سعید جیسے ناموں میں سے کوئی نام انتخاب کریں گے۔

اگر وہ کسی کھیل کو پسند کرتے ہوں گے تو معروف کھلاڑیوں میں سے کسی کا نام رکھیں گے۔

اگر انھیں کوئی گلوکار اچھا لگتا ہو گا تو اپنے بچے کا نام اسی کے نام پر رکھیں گے۔

اگر وہ ظلم و ستم سے خوش ہوں گے تو سکندر، تیمور، چنگیز جیسے ناموں میں سے کسی کا انتخاب کریں گے بہرحال باپ نام کے انتخاب سے اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو کسی خاص گروہ سے وابستہ کر لیتے ہیں۔ ناموں کی یہ وابستگی عمومی افکار پہ اثر انداز ہونے کے علاوہ زیادہ تر صاحب نام پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

استحسنوا اسماءکم فانکم تدعون بھا یوم القیامۃ قم یا فلان بن فلان الی نورک، وقم یا فلان بن فلان لا نور لک۔

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۵ ص ۱۲۲

اچھا نام رکھو کیونکہ قیامت کے روز تمہیں انہی ناموں سے پکارا جائے گا اور کہا جائے گا اے فلاں ابن فلاں اٹھ کھڑے ہو اور اپنے نور سے وابستہ ہو جاؤ اور اے فلاں بن فلاں اُٹھ کھڑے ہو کہ تمہارے لیے کوئی روشنی نہیں جو تمہاری راہنمائی کرے۔[1]

ایک شخص نے حضرت امام صادق علیہ السلام سے عرض کیا: ہم لوگ آپ کے اور آپ کے اجداد کے نام اپنے لیے انتخاب کرتے ہیں۔ کیا اس کام کا کوئی فائدہ ہے۔ آپ نے فرمایا:

ہاں! اللہ کی قسم! کیا دین اچھوں سے محبت اور بروں سے نفرت کے سوا بھی کچھ ہے۔[2]

دنیا میں لوگ اپنے مقاصد کی ترویج کے لئے اور شخصیتوں کو نمایاں کرنے کے لئے ہر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ شہروں، سڑکوں اور چوراہوں کے نام رکھنے تک سے استفادہ کرتے ہیں۔ ایک ذمہ دار اور آگاہ مسلمان بھی دین کی ترویج کے لیے کسی موقع پر یہاں تک کہ نام رکھنے کے موقع پر غفلت نہیں کرتا۔

ہاں! حسن، حسین، ابو الفضل، علی اکبر، حر، قاسم، حمزہ، جعفر، ابو ذر اور عمار جیسے ناموں کے انتخاب سے اور ان کی ترویج سے اسلام کے مردانِ مجاہد کی جانبازی اور فداکاری کو دلوں میں زندہ رکھا جا سکتا ہے فداکاری اور ظالموں کے خلاف جہاد کی روح ملت میں پھونکی جا سکتی ہے۔ اللہ کے عظیم رسولوں مثلاً ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمدؐ کا نام انتخاب کر کے خدا پرستوں اور اور قوانین الٰہی کے حامیوں کے ساتھ اپنی وابستگی کا اعلان کیا جا سکتا ہے، فداکار اور مجاہد شیعہ مثلاً ابوذر، میثم، عمار اور ایسے سینکڑوں دوسرے حقیقی تشیع کے مصادیق کے ناموں کے احیاء اور ترویج سے ملت کو شخصیت کا حقیقی مفہوم سکھایا جا سکتا ہے۔ اسلام کے عظیم

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۵ ص ۱۲۳

[2] مستدرک۔ ج ۲ ص ۶۱۸

علماء کے ناموں کا انتخاب کرکے ان کے علم ودانش کی قدر دانی اور ترویج کی جا سکتی ہے۔ ایک سمجھدار مسلمان اس امر پہ تیار نہیں ہو سکتا کہ وہ ظالموں یا اسلام دشمنوں میں سے کسی کا نام اپنے بچے کے لیے انتخاب کرے۔ وہ جانتا ہے کہ خود یہ نام رکھنا بھی ایک طرح سے ظلم کی ترویج ہے۔

امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں :

لقد احتظرت من الشیطان احتظارا شدیداً اِنّ الشیطان اذا سمع منادیًا ینادی یا محمد او یا علی ذاب کما یذوب الرصاص، حتی اذا سمع منادیا ینادی باسم عدو من اعدائنا اهتزّ و اختال۔

شیطان سے بچو! اور اس سے بہت خبردار رہو، کہ جب شیطان سنتا ہے کہ کسی کو محمد اور علی کہہ کے پکارا جا رہا ہے تو وہ یوں پگھل جاتا ہے جیسے سیسہ پگھل جاتا ہو اور جب وہ سنتا ہے کہ کسی کو ہمارے دشمنوں میں سے کسی کے نام سے پکارا جاتا ہے تو خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ [1]

پیغمبر اسلام علیہ السلام نے فرمایا:

من ولد له اربعة اولاد لم یسم احدهم باسمی فقد جفانی۔

جس کسی کے بھی چار بیٹے ہوں اور اس نے کسی ایک کا نام بھی میرے نام پہ نہیں رکھا اس نے مجھ پر ظلم کیا ہے۔ [2]

امام باقر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا:

خیرها اسماء الانبیاء

بہترین نام نبیوں کے نام ہیں۔ [3]

---

[1] وسائل الشیعہ۔ ج - ص ۱۲۷

[2] وسائل الشیعہ۔ ج - ص ۱۲۷

[3] وسائل الشیعہ۔ ج - ص ۱۲۴

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نام کے مسئلے پر اس قدر اہتمام کرتے تھے کہ اگر ان کے اصحاب یا شہروں کے ناموں میں سے کسی کا اچھا نہ لگتا تو فوراً بدل دیتے۔ عبدالشمس کو عبدالوہاب میں تبدیل کر دیا۔ عبدالعزیٰ (عزیٰ بت کا بندہ) کو آپ نے عبداللہ میں بدل دیا۔ عبدالحارث (شیر کا بندہ) کو عبدالرحمٰن میں اور عبدالکعبہ کو عبداللہ میں بدل دیا۔

صحت وصفائی

بچے کا لباس سال کے مختلف موسموں اور آب و ہوا کے اعتبار سے ایسا تیار کرنا چاہیے کہ نہ اُسے ٹھنڈ لگے اور نہ ہی گرمی کی شدت سے اس کا پسینہ بہتا رہے اور اسے تکلیف محسوس ہو۔ نرم اور سادہ سوتی کپڑے بچے کی صحت اور آرام کے لیے بہتر ہیں۔ تنگ اور چپکے ہوئے لباس بچے کی آزادی کو سلب کر لیتے ہیں اور ایسا ہونا اچھا نہیں ہے۔ ان کو تبدیل کرتے وقت بھی ماں اور بچے دونوں کو زحمت ہوتی ہے۔ اکثر لوگوں میں رواج ہے کہ بچے کو سخت کپڑوں میں پیک کر دیتے ہیں اور اُس کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیتے ہیں۔ ظاہراً ایسا کرنا اچھا نہیں ہے اور بچے کے جسم اور روح کے لیے ضرر رساں ہے۔ اس غیر انسانی عمل سے اس ننھی سی کمزور جان کی آزادی سلب کر لی جاتی ہے۔ اُسے اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ آزادی سے اپنے ہاتھ پاؤں مارے اور حرکت دے سکے اس طرح سے اُس کی فطری نشوونما اور حرکت میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

ایک مغربی مصنف لکھتا ہے:

جونہی بچہ ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے اور آزادی سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے اور اپنے ہاتھ پاؤں کو حرکت دیتا ہے تو فوراً اس کے ہاتھ پاؤں کو ایک نئی قید و بند میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ پہلے تو اسے پیک کر دیتے ہیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں کو دراز کر کے زمین پر سلا دیتے ہیں اور پھر اس کے جسم پر اتنے کپڑے اور لباس چڑھاتے ہیں اور کمر بند باندھتے ہیں کہ وہ حرکت تک نہیں

کر سکتا...... اس طرح سے بچے کی داخلی نشوونما کہ جو وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ ہوتی ہے اس خارجی رکاوٹ کی وجہ سے رُک جاتی ہے کیونکہ بچہ نشوونما اور پرورش کے لیے اپنے بدن کے اعضاء کو اچھی طرح سے حرکت نہیں دے پاتا...... جن ممالک میں اس طرح کی وحشیانہ دیکھ بھال کا معمول نہیں ہے اُس علاقے کے لوگ طاقت ور یا قوی، بلند قامت اور متناسب اعضاء کے حامل ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جن علاقوں میں بچوں کو کس باندھ دیا جاتا ہے۔ وہاں پر بہت سے لوگ لولے لنگڑے، ٹیڑے میڑھے، پست قامت اور عجیب وغریب ہوتے ہیں ...... کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس طرح کی پرورش اور ایسے وحشیانہ عمل اس کے اخلاق اور مزاج کی کیفیت پر نامطلوب اثر نہیں ڈالیں گے۔ سب سے پہلا احساس اُس میں درد اور قید وبند کا ہوتا ہے کیونکہ وہ ذرا بھی حرکت کرنا چاہتا ہے تو اسے رکاوٹ کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا اس کی حالت تو اس قیدی سے بھی بری ہوتی ہے جو قید بامشقت بھگت رہا ہوتا ہے۔ ایسے بچے ایسے ہی کوشش کرتے رہتے ہیں، پھر انہیں غصہ آتا ہے۔ پھر چیختے چلاتے ہیں...... اگر آپ کے بھی ہاتھ پاؤں باندھ دیئے جائیں تو آپ اس سے بھی زیادہ اور بلند تر چیخیں چلائیں گے[1]

بچہ بھی ایک انسان ہے اس میں بھی احساس اور شعور ہے وہ بھی آزادی اور راحت کا طلب گار ہے۔ اُسے بھی اگر کس باندھ دیا جائے اور اُس کی آزادی سلب کر لی جائے تو اسے تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن وہ اپنا دفاع نہیں کر سکتا اس کا ایک ہی ردعمل ہے گریہ وزاری اور داد وفریاد اور اس کے سوا اس کا کوئی چارہ ہی نہیں۔ یہ دباؤ، بے آرامی اور تکلیف تدریجاً بچے کے اعصاب اور ذہن پر اثر انداز ہوتی ہے اور اسے ایک تند مزاج اور چڑچڑا شخص بنا دیتی ہے بچے کے لباس کو صاف ستھرا اور پاکیزہ رکھیں جب بھی وہ پیشاب کرے تو اس کا لباس تبدیل کریں

---

[1] امیل ص ۳۸ - ۴۰

اس کے پاؤں کو دھوئیں اور زیتون کے تیل سے اس کی مالش کریں تاکہ وہ خشکی اور سوزش کا شکار نہ ہو۔ چند مرتبہ پیشاب کے بعد بچے کو نہلائیں اور اُسے پاک کریں اس طرح بچے کی صحت و سلامتی میں آپ اس کی مدد کر سکتے ہیں اور اُسے بچپنے کی کئی بیماریوں سے بچا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں بچہ نفیس و پاکیزہ ہوگا، آنکھوں کو بھلا لگے گا اور سب اس سے پیار کریں گے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اسلام دین پاکیزگی ہے، آپ بھی پاکیزہ رہیں کیونکہ فقط پاکیزہ لوگ ہی بہشت میں داخل ہوں گے"[1]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"بچوں کو چکناہٹ اور میل کچیل سے پاک کریں کیونکہ شیطان انہیں سونگھتا ہے پھر بچہ خواب میں ڈرتا ہے اور بے چین ہوتا ہے اور فرشتے ناراحت ہوتے ہیں"[2]

بیٹوں کا ختنہ کرنا ایک اسلامی رواج ہے اور واجب ہے۔ ختنہ بچے کی صحت و سلامتی کے لیے بھی مفید ہے ختنہ کر کے بچے کو میل کچیل اور آلہ تناسل اور اضافی گوشت کے درمیان پیدا ہونے والے موذی جراثیم سے بچایا جا سکتا ہے۔ ختنے کو زمانہ بلوغ تک مؤخر کیا جا سکتا ہے لیکن بہتر ہے کہ پیدائش کے پہلے پہلے دنوں میں ہی یہ انجام پا جائے۔ اسلام حکم دیتا ہے کہ ساتویں دن نومولود کا ختنہ کر دیا جائے۔

حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اختنوا اولادكم لسبعة ايام، فانه اطهر و اسرع لنبات اللحم، وان الارض لتكره بول الأغلف"

"ساتویں دن اپنے بچوں کا ختنہ کریں۔ یہ ان کے لیے بہتر بھی ہے اور پاکیزہ تر

---

[1] مجمع الزوائد ج ۵ ص ۱۳۲

[2] بحار الانوار ج ۱۰۴ ص ۹۵

بھی۔ نیز اُن کی سریع تر نشوونما اور پرورش کے لیے بھی مفید ہے اور یقیناً زمین اس انسان کے پیشاب سے کراہت کرتی ہے کہ جس کا ختنہ نہ ہوا ہو۔[1]

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"اختنوا اولادکم یوم السابع فانہ اطھر واسرع لنبات اللحم"

"نو مولود کا ساتویں دن ختنہ کریں تاکہ وہ پاک ہو جائے اور بہتر رشد و نمو کرے۔"[2]

عقیقہ کرنا بھی مستحبات مؤکدہ میں سے ہے۔ اسلام نے اس امر پر زور دیا ہے کہ ساتویں دن بچے کے بال کٹوائے جائیں اور اُس کے بالوں کے وزن کے برابر سونا یا چاندی صدقہ دیا جائے اور اُسی روز عقیقہ کے طور پر دنبہ ذبح کیا جائے اور اس کا گوشت فقراء میں تقسیم کیا جائے۔ یا انہیں دعوت کر کے کھلایا جائے۔ عقیقہ کرنا ایک اچھا صدقہ ہے اور بچہ کی جان کی سلامتی اور دفع بلا کے لئے مفید ہے۔

نو مولود نہایت نازک اور ناتواں ہوتا ہے۔ اُسے ماں باپ کی توجہ اور نگرانی کی بہت احتیاج ہوتی ہے۔ صحت و سلامتی یا رنج و بیماری کی بچپن میں ہی انسان میں بنیاد پڑ جاتی ہے اور اس کی ذمہ داری ماں باپ پر عائد ہوتی ہے جو ماں باپ اُس کے وجود میں آنے کا باعث بنے ہیں ان کا فریضہ ہے کہ اس کی حفاظت اور نگہداشت کے لیے کاوش کریں اور ایک سالم اور تندرست انسان پروان چڑھائیں۔ اگر ماں باپ کی سہل انگاری اور غفلت کی وجہ سے بچے کے جسم و روح کو کوئی نقصان پہنچا تو وہ مسئول ہیں اور ان سے مواخذہ کیا جائے گا۔ بچہ دسیوں بیماریوں میں گھرا ہوتا ہے، جن میں سے بہت سی بیماریوں کو لاحق ہونے سے روکا جا سکتا ہے مثلاً بچوں کا فالج، جسم پر چھالوں کا پیدا ہونا، خسرہ، چیچک، خناق (DIPHTERIE)، تشنج،

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۵ ص ۱۶۱

[2] وسائل الشیعہ ج ۱۵ ص ۱۶۵

اور کالی کھانسی وغیرہ جیسی بیماریوں سے متعلق ٹیکے لگوا کر ویکسینیشن کے ذریعے بچا جا سکتا ہے خوش قسمتی سے شفاخانوں اور طبی مراکز میں اس قسم کی بیماریوں کی روک تھام کا انتظام موجود ہے اور رجوع کرنے والوں کو اس مقصد کے لیے مفت ٹیکہ لگایا جاتا ہے۔ ماں باپ کے پاس اس بارے میں کوئی عذر موجود نہیں ہے۔ اگر وہ کوتاہی کریں اور ان کا عزیز بچہ فالج زدہ ہو جائے اور مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو جائے یا آخر عمر تک ناقص اور بیمار رہ جائے تو وہ خدا اور اپنے ضمیر کے سامنے جواب دہ ہوں گے بہر حال ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ اپنی اولاد کی صحت و سلامتی کی حفاظت کے لیے کوشش کریں اور توانا اور صحیح و سالم انسان پروان چڑھائیں۔

بچے کی نیند اور آزادی

چند ابتدائی ہفتے نومولود زیادہ وقت سویا رہتا ہے۔ شاید رات دن وہ بیس گھنٹے سوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس کی نیند کی مدت کمتر ہوتی جاتی ہے۔ نومولود کو نیند اور مکمل آرام کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ زیادہ شور وشین اور مزاحمت سے وہ بیزار اور متنفر ہوتا ہے وہ پرسکون ماحول کو پسند کرتا ہے تاکہ آرام سے سوسکے اور اس میں اُسے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ زیادہ چوما چاٹی اور ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں گردش اور دوسروں کو دکھاتے رہنے سے بچے کا آرام وا ستراحت تباہ ہو جاتا ہے۔ زیادہ غل غپاڑا اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی سمع خراش آوازیں بچے کے نازک اعصاب کو متاثر کرتی ہیں۔ بچے کی مزے کی نیند کو بے مقصد خراب نہیں کرنا چاہیے اور اُسے خواہ مخواہ اِدھر اُدھر نہیں لے جانا چاہیے ایسی حرکتیں بچے کے آرام کو برباد کردیتی ہیں اور اس کے اعصاب کو متاثر کرتی ہیں۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہے تو ممکن ہے بچے میں تند مزاجی، کج خلقی، چڑچڑاپن اور اضطراب پیدا ہو جائے۔

زیادہ شور وغل سے اور اِدھر اُدھر لے جائے جانے سے نومولود نفرت کرتا ہے۔ البتہ وہ ہلنے جلنے کا مخالف نہیں ہے۔ اسے اچھا لگتا ہے کہ ماں کی گود میں یا گہوارے میں اسے حرکت دی جائے۔ ہلنے جلنے سے وہ سکون محسوس کرتا ہے اور اس کا دل خوش ہوتا ہے۔ کیونکہ حرکت اس امر کی علامت ہے کہ کوئی اُس کے قریب موجود ہے اور اس کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ جب کہ خاموشی اور بے حرکتی تنہائی کی نشانی ہے علاوہ ازیں عالم جنین میں بچہ ماں کے گہوارۂ شکم میں حرکت کرتا رہا ہے اسی وجہ سے اگلے مرحلے میں بھی وہ

چاہتا ہے کہ ویسی ہی کیفیت جاری رہے۔ بچہ ماں کی پیاری اور میٹھی لوریوں سے بھی احساس راحت کرتا ہے۔

بچے کی زندگی کا پہلا سال اس کے پٹھوں اور اعضاء کی مشق کا سال ہے۔ بچہ پسند کرتا ہے کہ آزادانہ حرکت کرے اور اپنے ہاتھ پاؤں مارے نومولود کا لباس نرم اور کھلا ہونا چاہیے۔ بچے کو تہ در تہ کپڑوں میں کس باندھ دینے سے اس کی آزادی حرکت جاتی رہتی ہے اور اس سے اس کے اعصاب پر اثر پڑتا ہے۔ جب بچے کی آزادی چھین لی جائے اس کے پاس رونے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا لہذا وہ داد و فریاد کرتا رہتا ہے اور اعصاب کی یہی بے آرامی ممکن ہے تند مزاجی اور شدید غصیلے پن کا مقدمہ بن جائے۔

زندگی کا حساس ترین دور

زندگی کا حساس اور اہم ترین دور بچپن کا زمانہ ہے۔ ہر فرد کی آئندہ شخصیت کی بنیاد اسی زمانے میں پڑتی ہے اور ایک خاص شکل وصورت اختیار کرتی ہے کوئی چھوٹا سا انحراف یا سہل انگاری ممکن ہے بچے کی آئندہ کی شخصیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا دے۔ بالخصوص زندگی کے ابتدائی تین سالوں میں کہ جو بہت ہی حساس اور اہم دور ہوتا ہے۔ شاید سب لوگ یا اکثر لوگ بچے کی شیرخوارگی کے زمانے سے بالکل غافل ہوتے ہیں اور اس کی اہمیت کے بالکل قائل نہیں ہوتے کہتے ہیں :

> بچے خصوصاً نومولود کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی۔ نہ کوئی بات کر سکتا ہے اور نہ ہی سمجھ سکتا ہے اتنا بے بس ہوتا ہے کہ اپنے پیشاب پاخانے پر اس کا بس نہیں چلتا۔ اس میں تعلیم و تربیت کی کیا قابلیت ہوگی۔

یہ سمجھ کر بچپن کا زمانہ بالکل بے توجہی کے سپرد کر دیا جاتا ہے جس مسئلہ کے بارے میں بہت بڑا اشتباہ کیا جاتا ہے وہ یہی بچے کی ابتدائی زندگی ہے کہ جو اس کا انتہائی اہم اور حساس زمانہ ہوتا ہے۔ اسی بظاہر سادہ سے زمانے میں بچہ شکل اختیار کرتا ہے اور اس کی اخلاقی، معاشرتی اور دینی شخصیت کی بنیاد پڑتی ہے۔

اس ابتدائی تین سال کے عرصے میں بچہ سینکڑوں الفاظ یاد کرتا ہے ان کے معانی سے آشنا ہوتا ہے۔ اچھائی برائی، دوستی دشمنی، محبت نفرت، خوبصورتی و بدصورتی چھوٹے بڑے، مختلف رنگوں، مختلف ذائقوں اور اسی طرح کی بہت سی چیزوں کو خوب سمجھنے لگتا ہے۔

دیکھنے، سننے اور بولنے کا انداز سیکھتا ہے، سوچنے کے انداز سے آشنا ہوتا ہے۔ گھٹنوں کے بل چلنے، بیٹھنے، چلنے پھرنے، رونے ہنسنے جیسے دسیوں کام یاد کرتا ہے۔ چیزوں اور لوگوں کو پہچاننے لگتا ہے اور ان میں فرق کرنے لگتا ہے۔ دسیوں نئی نئی چیزیں سیکھتا ہے اور ان کا عادی ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان تین سال کی مدت میں ہزاروں اچھے بُرے واقعات بچے کی حساس اور لطیف روح پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کی آئندہ کی روش کا تعین کرتے ہیں۔

اس سب کے باوجود بہت ہی کم کوئی ایسا شخص ہوتا ہے کہ جسے اپنی زندگی کے ابتدائی تین سالوں میں سے کچھ یاد ہو اس دوران کے تمام واقعات پر فراموشی اور نسیان کا پردہ چھا جاتا ہے لیکن بچے کی طبیعت پر اثر باقی رہ جاتا ہے اور اس کی آئندہ کی زندگی ایک حد تک واضح ہو جاتی ہے۔ بہت ساری نفسیاتی بیماریاں، خوف، اضطراب، غصہ اور نا امیدیاں اسی زمانے کے واقعات سے جنم لیتی ہیں۔

ایک ماہر نفسیات لکھتے ہیں:

> اگر بچے کی شخصیت زندگی کے ابتدائی سالوں میں مضبوط نہ ہو سکی تو اس میں آئندہ کی ذمہ داریوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہو گی اور وہ مختلف نفسیاتی خرابیوں کا شکار ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے عموماً یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ بہت سی بنیادی نفسیاتی پریشانیوں کا سرچشمہ زندگی کے ابتدائی تین چار سال ہی ہوتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ جب بھی کوئی ماہر نفسیات کسی اعصابی بیماری کے نفسیاتی اسباب کا تجزیہ و تحلیل کرتا ہے تو یہ بات سمجھتا ہے کہ اس شخص کی ابتدائی زندگی میں ایسے عوامل موجود تھے جو اب مشکلات سے اس کے فرار کرنے میں غیر معمولی طور پر مؤثر ہیں۔[۱]

ڈاکٹر جلالی لکھتے ہیں:

---

[۱] روان شناسی کودک و بالغ، ص ۱۰۶

بچے کے معاشرتی چال چلن کی بنیاد زندگی کے پہلے سال ہی میں پڑ جاتی ہے۔
...... کی طرف میلان یا عدم میلان اسی زمانے میں ظاہر ہو جاتا ہے۔[1]

اسی بنا پر ذمہ دار اور سمجھدار ماں باپ اس حساس اور اہم دور کو عدم توجہی کا شکار نہیں ہونے دیتے اور بچے کی تربیت کو بعد کے زمانے پر ملتوی نہیں کر دیتے بلکہ تعلیم و تربیت آغاز ولادت ہی سے کر دیتے ہیں۔

بعض دانشور کہتے ہیں:

بچے کی تربیت ولادت ہی سے شروع ہو جاتی ہے بڑے یا بچے ان سے جو برتاؤ کرتے ہیں اور جیسی توجہ انہیں دیتے ہیں وہی ان کی پہلی تربیت قرار پاتی ہے۔ اسی طرح وہ مناظر جنہیں بچہ دیکھتا ہے اور وہ آوازیں جنہیں وہ سنتا ہے، یونہی تمام وہ تاثیرات جو حواس کے ذریعے سے اس کے اعصاب اور ذہن پر مرتب ہوتی ہیں اس کی طرز تربیت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ بہت سی معلومات اور تجربات جو بچے کی عادات کی تشکیل اور اس کے مستقبل کے اخلاق کی تعمیر میں اثر انداز ہوتے ہیں وہ ابتدائی زندگی ہی سے متعلق ہوتے ہیں۔ ابتدائے ولادت سے بڑے جو سلوک بچوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں یہ ان کی معلومات اور تجربات میں حتمی طور پر مؤثر ہوتا ہے اور تربیت و تعلیم کے عوامل میں سے شمار ہوتا ہے۔[2]

رسل رقم طراز ہے:

تربیت اخلاق کے لیے صحیح اور مناسب موقع لحظہ تولد ہے کیونکہ یہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ جب مایوسی کے بغیر تربیت کا عمل شروع کیا جا سکتا ہے۔ اگر تربیت اس دور کے بعد شروع کی گئی تو پھر مخالف عادات کے ساتھ بھی نبرد آزمائی کرنا پڑے گی۔[3]

---

[1] روان شناسی کودک، ص ۲۰۲

[2] علم النفس التربوی ج ۱ ص ۱۹

[3] در تربیت، ص ۷۹

حضرت علی علیہ السلام نے اپنے بیٹے امام حسن علیہ السلام سے فرمایا:

انما قلب الحدیث کالارض الخالیۃ ما القی فیھا من شیء قبلتہ، فبادرتک بالادب قبل ان یقسو قلبک ویشتغل لبک۔

بچے کا دل خالی زمین کی مانند ہوتا ہے جو چیز بھی اس میں ڈالی جائے اسے قبول کر لیتا ہے۔ اسی لیے اس سے پہلے کہ تمہارا دل سخت اور مشغول ہو جائے میں نے تمہیں مودب بنانے کے لیے قدم اٹھایا[1]

---

[1] وسائل الشیعہ ج ۱۵ ص ۱۹۷

نومولود اور اخلاقی تربیت

جب بچہ دنیا میں آتا ہے تو بہت کمزور ہوتا ہے۔ عقل بالقوت رکھتا ہے مگر کچھ چیز سمجھتا نہیں، فکر اور سوچ بچار نہیں کرتا، آنکھ سے دیکھتا ہے لیکن کسی چیز کو پہچانتا نہیں۔ رنگوں اور شکلوں کو مشخص نہیں کر پاتا، دوری اور نزدیکی، بزرگی اور بچپن کو نہیں سمجھتا۔ آوازیں سنتا ہے لیکن ان کے معانی اور خصوصیات اس کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اور یہی حالت اس کے تمام حواس کی ہے مگر وہ سمجھنے اور کمال تک پہنچنے کی قوت و استعداد رکھتا ہے تدریجاً تجربوں سے گزرتا ہے اور چیزوں کو سمجھنے لگتا ہے۔ اللہ قرآن میں فرماتا ہے:

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس عالم میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور تمہیں کان، آنکھیں اور دل عطا کیا شاید کہ تم شکر گزار ہو جاؤ۔

سورہ نحل۔ آیہ ۷۸

بچے کی زیادہ تر مصروفیات یہ ہیں کہ وہ کھاتا ہے، سوتا ہے، ہاتھ پاؤں مارتا ہے روتا ہے اور پیشاب کرتا ہے، چند ہفتوں تک وہ ان کاموں کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا۔ نومولود کے ابتدائی کام اگرچہ بہت سادہ سے اور چند ایک ہیں لیکن انہیں کے ذریعے سے بچہ دوسرے لوگوں سے ارتباط پیدا کرتا ہے، تجربے کرتا ہے، عادتیں اپناتا ہے اور علم حاصل

کرتا ہے۔ یہی رابطے اور تجربے ہیں کہ جن سے بچے کی آئندہ کی اخلاقی اور معاشرتی شخصیت کی بنیاد پڑتی ہے اور وہ تشکیل پاتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اَلْاَیّامُ تُوْضِحُ السَّرَائِرَ الْکَامِنَۃ

جوں جوں دن گزرتے ہیں بھید کھلتے ہیں۔[1]

بچہ ایک کمزور معاشرتی فرد ہے کہ جو دوسروں کی مدد کے بغیر نہ زندہ رہ سکتا ہے اور نہ زندگی بسر کر سکتا ہے اگر دوسرے اس کی مدد کو نہ لپکیں اور اس کی احتیاجات کو پورا نہ کریں تو وہ مر جائے گا نومولود کی جسمانی صحت اور پرورش جن کے ذمے ہوتی ہے اُس کی اخلاقی، اجتماعی یہاں تک کہ دینی تربیت اور رُشد بھی انہیں سے وابستہ ہے

سمجھدار اور احساس ذمہ داری کرنے والے ماں باپ اپنے صحیح اور سوچے سمجھے طرز عمل سے نومولود کی ضروریات کو پورا کر سکتے ہیں اور اس کے جسم و روح کی پرورش کے لیے بہترین ماحول فراہم کر سکتے ہیں اور اس کی حساس اور بے آلائش روح میں پاکیزہ اخلاق اور نیک عادات پیدا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک نادان تربیت کرنے والا اپنے غلط طرز عمل اور اشتباہ سے ایک نومولود کے پاک اور بے آلائش نفس میں بُرے اخلاق اور ناپسندیدہ عادات پیدا کر سکتا ہے۔

نومولود کو بھوک لگتی ہے اور اسے غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ اپنی ضرورت کا احساس کرتا ہے اور وہ ایک بڑی قوت کی طرف توجہ کرتا ہے کہ جو اُس کی ضروریات کو برطرف کر سکتی ہو۔ اسی لیے وہ روتا ہے شور مچاتا ہے تاکہ اس کی فریاد کو پہنچا جائے اور اس کی ضرورتوں کو پورا کیا جائے اگر بچے کی داخلی خواہشات کی طرف پوری توجہ کی جائے اور ایک صحیح پروگرام ترتیب دیا جائے، اُسے معین مواقع پہ اور ضروری مقدار میں دودھ دیا جائے تو وہ آرام محسوس کرتا ہے مطمئن ہو کے سوتا ہے اور معین اوقات پر جب اُسے بھوک لگتی ہے

---

[1] غرر الحکم ص ۴۷

تو بیدار ہوتا ہے پھر دودھ پیتا ہے اور پھر سو جاتا ہے۔ ایسے بچے کے اعصاب آرام و راحت سے رہتے ہیں۔ اسے اضطراب اور بے چینی نہیں ہوتی، اسے زندگی میں اچھے اخلاق، صبر اور نظم و ضبط کی عادت پڑ جاتی ہے اس کی حساس روح میں دوسروں پر اعتماد اور حسن ظن کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔ نومولود زندگی کے اس مرحلے میں کہ جب وہ کسی کو نہیں پہچانتا فطری طور پر دو امور کی طرف توجہ رکھتا ہے۔ ایک اپنی ناتوانی اور نیازمندی کا اسے پورا احساس ہوتا ہے اور دوسری طرف ایک بڑی اور مطلق قوت کی طرف توجہ رکھتا ہے کہ جو تمام احتیاجات کے لئے ملجا و پناہ گاہ ہے اسی سبب سے روتا ہے اور اس برتر قوت کو مدد کے لیے پکارتا ہے کہ جسے وہ پہچانتا نہیں اور وہ غیبی قوت سب اہل جہان کو پیدا کرنے والی ہے بچہ اپنے ضعف و ناتوانی کی وجہ سے اپنے آپ کو ایک بے نیاز طاقت سے وابستہ اور متعلق سمجھتا ہے۔ اگر یہ احساسِ تعلق آرام کے ساتھ بخوبی بندھا رہے تو بچے کے دل میں ایمان اور روحانی سکون کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔

"رونے پر بچوں کو نہ مارنا (بلکہ ان کی ضروریات کو پورا کرنا) کیوں کہ چار ماہ تک بچے کا رونا پروردگار عالم کے وجود اور اس کی وحدانیت پر گواہی ہوتا ہے"[1]

چار ماہ پورے ہونے سے پہلے نومولود ابھی ایک معاشرتی وجود نہیں بنا ہوتا کسی کو نہیں پہچانتا۔ حتی اپنی ماں اور دوسروں میں فرق نہیں کر پاتا اور ماؤں کے بقول وہ دوری نہیں کرتا یہی چار ماہ ہیں کہ بچہ بس ایک ہی ذات کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن جو بچہ ماں کی غفلت اور سستی کی وجہ سے صحیح اور منظم توجہ اور غذا سے محروم ہو جاتا ہے ناچار گاہ بگاہ روتا ہے اور شور کرتا ہے تاکہ کوئی اس کی مدد کو پہنچے۔ ایسے بچے کے

---

[1] بحار الانوار جلد ۱۰۴ ص ۱۰۳

اعصاب اور ذہن ہمیشہ مضطرب اور دگرگوں رہتے ہیں اور اسے آرام نہیں ملتا۔ آہستہ آہستہ وہ چڑچڑا اور تند خو ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر بے اعتمادی اور پریشانی کی حس پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ایک نامنظم اور ڈھیٹ وجود بن جاتا ہے۔

نومولود اور دینی تربیت

یہ صحیح ہے کہ نومولود الفاظ اور جملے نہیں سمجھتا، مناظر اور شکلوں کی خصوصیات کو پہچان نہیں سکتا۔ لیکن آوازوں کو سنتا ہے اور اس کے اعصاب اور ذہن اس سے متاثر ہوتے ہیں اسی طرح سے مناظر اور شکلوں کو دیکھتا ہے اور اس کے اعصاب اس سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دیکھی جانے والی اور سنی جانے والی چیزیں نومولود پہ اثر نہیں کرتیں اور وہ ان کے بارے میں بالکل لاتعلق ہوتا ہے۔ نومولود اگرچہ جملوں کے معانی نہیں سمجھتا لیکن یہ جملے اسکی حساس اور ظریف روح پر نقش پیدا کرتے ہیں بچہ رفتہ رفتہ ان جملوں سے آشنا ہو جاتا ہے اور یہی آشنائی ممکن ہے اس کے آئندہ کے لیے مؤثر ہو۔ جس لفظ سے ہم زیادہ متاثر ہوتے ہیں اس کے معنی کو بہتر سمجھتے ہیں۔ ناآشنا افراد کی نسبت آشنا افراد کو ہم زیادہ پسند کرتے ہیں ایک بچہ ہے کہ جو دینی ماحول میں پرورش پاتا ہے، سینکڑوں مرتبہ اس نے تلاوت قرآن کی دلربا آواز سنی ہے، اللہ کا خوبصورت لفظ اس کے کانوں سے ٹکرایا ہے اور اس نے اپنی آنکھوں سے بارہا ماں باپ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ دوسری طرف ایک نومولود ہے کہ اس نے بُرے اور بے دین ماحول میں پرورش پائی ہے، اس کے کانوں نے غلیظ اور گندے گانے سُنے ہیں اور اس کی آنکھیں فحش مناظر دیکھنے کی عادی ہو گئی ہیں یہ دونوں بچے ایک جیسے نہیں ہیں۔

سمجھدار اور ذمہ دار ماں باپ اپنے بچوں کی تربیت کے لیے کسی موقع کو ضائع نہیں کرتے یہاں تک کہ اچھی آوازیں اور اچھے مناظر سے انہیں مانوس کرنے سے بھی غفلت

نہیں کرتے۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس حساس تربیتی نقطے کو نظر انداز نہیں کیا اور اپنے پیروکاروں کو حکم دیا ہے کہ

"جونہی بچہ دنیا میں آئے اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہیں۔"

حضرت علی علیہ السلام نے رسول اللہ صلی علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"جس کے ہاں بھی بچہ ہو اُسے چاہیے کہ اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہے تاکہ وہ شرِ شیطان سے محفوظ رہے۔ آپ نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے بارے میں بھی اسی حکم پر عمل کرنے کے لیے کہا۔ علاوہ ازیں حکم دیا کہ ان کے کانوں میں سورہ حمد، آیۃ الکرسی، سورہ حشر کی آخری آیات، سورہ اخلاص، سورہ والناس اور سورہ والفلق پڑھی جائیں۔[1]

بعض احادیث میں آیا ہے:

خود رسول اللہ نے امام حسنؑ اور امام حسینؑ کے کان میں اذان واقامت کہی۔

ہاں!

رسول اسلام جانتے تھے کہ نومولود اذان، اقامت اور قرآنی الفاظ کے معانی نہیں سمجھتا لیکن یہی الفاظ بچے کے ظریف اور لطیف اعصاب پر جو اثر مرتب کرتے ہیں آپؐ نے اسے نظر انداز نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس نکتے کی طرف توجہ تھی کہ یہ جملے بچے کی روح اور نفسیات پر نقش مرتب کرتے ہیں اور اسے ان سے مانوس کرتے ہیں۔ اور الفاظ سے یہ مانوسیت بے اثر نہیں رہے گی۔ علاوہ ازیں ممکن ہے کہ اس تاکیدی حکم کے پیچھے رسولؐ کے پیش نظر کوئی اور بات ہو شاید وہ چاہتے ہوں کہ ماں باپ کو متوجہ کریں کہ بچے کی تعلیم و

---

[1] مستدرک ج ۲ ص ۶۱۹

تربیت کے بارے میں سہل انگاری درست نہیں ہے اور اس مقصد کے لیے ہر ذریعے اور ہر موقع سے فائدہ اُٹھانا چاہیے جب ایک باشعور مربی نومولود کے کان میں اذان اور اقامت کہتا ہے تو گویا اس کے مستقبل کے لئے واضح طور پر اعلان کرتا ہے اور اپنے پیارے بچے کو خدا پرستوں کے گروہ سے ملحق کر دیتا ہے۔

بچے پر ہونے والے اثر کا تعلق صرف سماعت سے متعلقہ نہیں ہے بلکہ مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جو چیز بھی بچے کے حواس، ذہن اور اعصاب پر اثر انداز ہوتی ہے اس کی آئندہ کی زندگی سے لاتعلق نہیں ہوتی مثلاً جو نومولود کوئی بے حیائی کا کام دیکھتا ہے اگرچہ اسے سمجھ نہیں پاتا لیکن اس کی روح اور نفسیات پر اس بُرے کام کا اثر ہوتا ہے اور یہی ایک چھوٹا کام ممکن ہے اس کے انحراف کی بنیاد بن جائے۔ اسی لیے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔

"گہوارہ میں موجود بچہ اگر دیکھ رہا ہو تو مرد کو نہیں چاہیے کہ اپنی بیوی سے مباشرت کرے" [1]

---

[1] مستدرک ج ۲ ص ۵۴۶

احساسِ وابستگی

نومولود بہت کمزور سا وجود ہے جو دوسروں کی مدد کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے نہ پرورش پا سکتا ہے نومولود ایسا محتاج وجود ہے جس کی ضروریات دوسرے پوری کرتے ہیں۔ جب وہ رحمِ مادر میں تھا تو اُسے نرم و گرم جگہ میسر تھی۔ وہاں اس کی غذا اور حرارت کی احتیاج ماں کے ذریعے پوری ہو رہی تھی۔ وہ چین سے ایک گوشے میں پڑا تھا اور اپنی ضروریات کے لیے بالکل بے فکر تھا۔ اب جب کہ وہ دنیا میں آیا ہے تو احساسِ نیاز کرتا ہے۔ بچے کا پہلا پہلا احساس شاید سردی کے بارے میں ہوتا ہے اور اس کے بعد بھوک کے بارے میں۔ اسے پہلی بار احساس ہوتا ہے کہ حرارت اور غذا کے لیے وہ دوسرے کا محتاج ہے۔ اس مرحلے میں وہ کسی کو نہیں پہچانتا۔ اپنی ضروریات کو فطرتاً سمجھتا ہے اور ایک انجانی قدرت مطلقہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اپنے تئیں اس قدرتِ مطلقہ سے منسلک سمجھتا ہے۔ اسے انتظار ہوتا ہے وہ قدرت اس کی ضروریات پورا کرے گی۔ بچہ زندگی کی ابتدا ہی میں کسی سے وابستگی کا احساس کرتا ہے اور یہ احساس زندگی کے تمام مراحل میں اس کے ساتھ رہتا ہے۔ بھوک یا پیاس لگے تو دوسروں کو متوجہ کرنے کے لیے روتا ہے۔ ماں کے سینے سے چمٹ جاتا ہے اور اس کی محبتوں اور لوریوں سے سکون محسوس کرتا ہے۔ اگر اُسے کوئی تکلیف ہو یا کسی خطرے کا احساس کرے تو ماں کے دامن میں پناہ لیتا ہے۔

یہی وابستگی اور احساسِ ضرورت ہے جو بعد میں دوسرے لوگوں کی تقلید کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی وابستگی ہے۔ بچہ اپنے اخلاق اور طرزِ عمل کو اپنے

اردگرد والوں کے اخلاق اور طرزِ عمل کے مطابق ڈھالتا ہے۔ یہی احساس تعلق ہے جو بعدازاں کھیلوں اور دوسرے سے مل جل کر کام کرنے اور دوست بنانے میں ظاہر ہوتا ہے۔ بیوی بچوں سے الفت و محبت کا سرچشمہ بھی یہی احساس ہے اجتماعی زندگی کی طرف میلان، باہمی تعاون اور مل جل کر کام کرنے کا مزاج بھی اسی احساس سے تشکیل پاتا ہے۔ احساسِ وابستگی کو کوئی معمولی سی چیز نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ یہ بچے کی اخلاقی اور سماجی تربیت اور اس کی تکمیل شخصیت کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اگر اس احساسِ وابستگی و تعلق کی صحیح طور پر راہنمائی کی جائے تو بچہ آرام و سکون محسوس کرتا ہے۔ وہ پُر اعتماد اور خوش مزاج ہو جاتا ہے۔ اچھی امید اور توکل کی کیفیت اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسروں کے بارے میں اس میں حسنِ ظن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح معاشرتی زندگی کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ دوسروں کو اچھا سمجھتا ہے اور ان سے تعاون کی امید رکھتا ہے۔ جب معاشرے کے بارے میں اس کی رائے اچھی ہو گی تو اس سے تعاون بھی کرے گا اور اس کے لیے ایثار بھی کرے گا۔ معاشرے کے لوگ بھی جب اسے اپنا خیر خواہ اور خدمت گزار سمجھیں گے تو وہ بھی اس سے اظہارِ محبت کریں گے۔

اس کے برعکس اگر یہ گراں بہا احساس کچلا جائے اور اس سے صحیح طور پر استفادہ نہ کیا جائے تو خدا نے جو صحیح راستہ بچے کے لیے مقرر کیا ہے اس کی اجتماعی زندگی اس سے بھٹک جائے گی۔ ماہرین نفسیات کا نظریہ ہے کہ بہت سے مواقع پر خوف، اضطراب، بے اعتمادی، بدگمانی، شرمندگی، گوشہ نشینی، افسردگی اور پریشانی یہاں تک کہ خودکشی اور جرائم کی بنیاد بچپن میں پیش آنے والے واقعات ہوتے ہیں۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ بچے کے احساس وابستگی کو صحیح طرح سے مطمئن کریں تو ہمیشہ اس کے مددگار رہیں۔ جب اسے بھوک لگے تو غذا دیں اور اس کے لیے آرام و راحت کا سامان فراہم کریں۔ اگر اسے درد ہو یا کوئی اور تکلیف پیش آئے تو فوراً اس کی داد رسی کریں۔ اس کی نیند اور خوراک کو منظم رکھیں۔ اس طرح سے کہ اُسے بالکل پریشانی نہ ہو اور وہ آرام کا احساس کرے۔

نومولود کو مار پیٹ نہ کریں۔ نومولود کچھ نہیں پہچانتا۔ اُسے صرف اپنی ضرورت کا احساس

ہوتا ہے اور ایک انجانی قدرت پر بھروسہ کرتا ہے۔ وہ رونے کی زبان سے اس کی پناہ حاصل کرتا ہے اور اپنی احتیاج کا اظہار کرتا ہے۔ مار پیٹ کے ذریعے اسے مایوس اور بدظن نہ کریں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"بچوں کو رونے پر مارنا نہ چاہیئے کیونکہ چار ماہ تک اپنے اس رونے کے ذریعے وہ اللہ اور اس کی توحید کی گواہی دیتے ہیں۔" [1]

ہر حال میں بچے کے مددگار رہیں اگر وہ کوئی کام انجام دینا چاہتا ہے اور آپ اس کی مدد نہیں کر سکتے تو بھی اس سے نوازش و محبت سے پیش آئیں۔ اگر بچہ پریشان ہو اور وہ ناراحتی محسوس کرتا ہو تو اس پریشانی کے اسباب ختم کریں اور اس کو مطمئن کریں اسے ہرگز ڈانٹ ڈپٹ نہ کریں اور یہ نہ کہیں کہ میں تمہیں یہیں چھوڑ کر جا رہی ہوں کیونکہ یہی ڈانٹ ڈپٹ ممکن ہے اس کی روح پر برا اثر کرے اور اسے پریشان کردے۔ بچہ چاہتا ہے کہ وہ ماں باپ اور دوسروں کو محبوب ہو۔ اگر ماں باپ اس سے محبت نہ کریں تو وہ اس پر سخت پریشان ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ کوشش کرتا ہے کہ ان کا پیار اور محبت ہمیشہ باقی رہے۔ بعض ماں باپ بچے کے اس جذبے سے استفادہ کرتے ہیں اور بچے کو ڈانٹتے ہیں کہ اگر تو نے یہ کام نہ کیا تو ہم تم سے پیار نہیں کریں گے لیکن آپ کو چاہیے کہ اس حربے کو استعمال نہ کریں۔ کیونکہ اس طرح کی ڈانٹ ممکن ہے تدریجاً بچے کی روح پر برے اثرات مرتب کرے اور اس سے اس کا اعتماد اور آرام جاتا رہے اور یہ بچے کے ضعیف اعصاب اور داخلی اضطراب کا سبب بن جائے۔ اگر وہ رو رہا ہو یا شور کر رہا ہو تو وہ یہ نہیں چاہ رہا ہوتا کہ آپ کو بے آرام کرے بلکہ وہ آپ کی توجہ مبذول کرنا چاہ رہا ہوتا ہے تاکہ آپ اس کی بات سنیں۔ آپ صبر اور سمجھداری کے ساتھ اس کی بے آرامی کی وجوہ سمجھیں اور اس بے آرامی کو دور کریں۔ تاکہ اسے آرام ملے۔ اگر آپ اسے رونے پر ڈانٹیں گے یا ماریں گے تو ممکن ہے وہ خاموش ہو جائے۔ لیکن کیسے خاموش؟ ایک اضطراب آمیز

---

[1] بحار الانوار۔ جلد ۱۰۴ صفحہ ۱۰۳

مایوسانہ خاموشی کہ جو بہت خطرناک ہے جو ممکن ہے اس کے مستقبل کو دگرگوں کردے۔ ماں باپ کی وجودگی سے بچہ ہمیشہ خوش رہتا ہے اور ان کی جدائی سے وحشت کھاتا ہے۔ آپ کبھی اپنی موت کے بارے میں اس سے بات نہ کریں کیونکہ یہ اس کی پریشانی اور وحشت کا سبب ہوگی۔ اگر آپ بیمار ہوجائیں تو موت کا ذکر نہ کریں۔ بلکہ اپنے بچوں کو پرامید رکھیں اور ان کا حوصلہ بڑھائیں اگر آپ ایک عرصے کے لیے بچوں سے دور ہونے پر مجبور ہوں تو پہلے انہیں اس پر آمادہ کریں۔ ان کا دل بڑھائیں پھر سفر اختیار کریں اور اس کے بعد بھی ہمیشہ ان سے رابطہ برقرار رکھیں اور نامہ و پیام کے ذریعے سے ان کی ڈھارس بندھاتے رہیں۔

اگر آپ کا بچہ بیمار ہوجائے تو دوا کھلانے کے لیے اسے موت سے اور اچھا نہ ہونے سے نہ ڈرائیں۔ بلکہ ایسے مواقع پر تشویق کی راہ اختیار کریں اور اسے صحیح ہوجانے کی امید دلائیں۔ یہاں تک کہ اسے اگر کوئی خطرناک بیماری ہو تو اپنی پریشانی اور اضطراب کو اس سے چھپائے رکھیں۔ مختصر یہ کہ پوری عمر اپنے بچوں سے ایسا سلوک رکھیں کہ وہ آپ کو اپنا بہترین غمگسار اور غمخوار سمجھیں۔

البتہ اس بات کا خیال رہے کہ بچے سے اظہار محبت ضروری حد تک اور ضروری مقامات پر ہونا چاہیے۔ اس طرح سے کہ وہ لاڈ پیار سے بگڑ نہ جائے اور خود اعتمادی سے محروم نہ ہو جائے۔ جہاں بچہ واقعی کوئی کام نہ کرسکتا ہو اس کی مدد کرنا چاہیے۔ لیکن اگر وہ ایک کام خود کرسکتا ہے اور اسے مدد کی ضرورت نہیں ہے بلکہ وہ دوسروں پر رعب جمانے کے لیے شور کر رہا ہو تو اس کی طرف اعتناء نہیں کرنا چاہیے۔

رسل لکھتا ہے:

اگر بچہ کسی وجہ اور واضح علت کے بغیر روئے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے اور وہ جتنا چلا سکے اسے چلانے دیں۔ ایسے مواقع پر اگر کوئی اور روش اپنائی گئی تو وہ جلد ہی ایک جابر حاکم کی صورت اختیار کرے گا

ایسے مواقع کہ جہاں ضرورت ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے وہاں بھی افراط سے کام نہیں لینا چاہیے بلکہ حسب ضرورت طرز عمل اپنانا چاہیے اور زیادہ ہی اظہار محبت نہیں کرنا چاہیے[1]

---

[1] در تربیت، ص۷۹

جب بچّہ باہر کی دنیا کو دیکھنے لگتا ہے

بچہ ایک چھوٹا سا انسان ہوتا ہے اور انسان مدنی بالطبع ہے۔ مدد اور تعاون کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور نہ زندگی گزار سکتا ہے۔ دوسروں کی طرف توجہ رکھتا ہے ان سے استفادہ کرتا ہے اور انہیں فائدہ پہنچاتا ہے۔ لیکن نومولود اپنی زندگی کے ابتدائی مہینوں میں کسی کو نہیں پہچانتا اور دوسروں کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ یعنی اجتماعی مزاج ابھی اس میں ظاہر نہیں ہوا ہوتا۔ جب تقریباً چار ماہ کا ہو جاتا ہے تو آہستہ آہستہ مدنی بالطبع ہونے کے آثار اس میں ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اس وقت وہ اپنے سے خارجی دنیا اور اپنے اردگرد کے موجودات کی طرف توجہ کرتا ہے وہ ماں کی حرکات و سکنات کو دیکھتا رہتا ہے۔ ماں کی حرکات پر اپنا ردعمل ظاہر کرتا ہے مسکراہٹ کے جواب میں مسکراتا ہے اور اس کی ابروؤں کے جواب میں اپنی ابروؤں کو حرکت دیتا ہے۔ بچوں کے کھیل کو حیرت سے دیکھتا ہے اٹھکیلیاں کرتا ہے اور مسکراتا ہے دوسروں کے جذبات کو محسوس کرتا ہے غصے اور تبسم میں فرق محسوس کرتا ہے۔ ڈانٹ اور محبت کا مختلف جواب دیتا ہے۔ ڈانٹ اور غصے پر اپنے تئیں پیچھے کھینچ لیتا ہے۔

خوش و خرم چہرے اور محبت آمیز آواز ہو تو ہمک ہمک کر قریب آتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے بٹھا دیا جائے تاکہ دنیا کو اپنے سامنے دیکھے۔

جب بچہ اس مرحلے میں پہنچ جائے تو ماں باپ کو توجہ رکھنا چاہیئے کہ بچے میں اجتماعی احساسات پیدا ہو چکے ہیں اور وہ اب خاندان کا ایک باقاعدہ حصہ بن گیا ہے۔ دوسروں کی طرف توجہ رکھتا ہے اور ان کے جذبات کو کسی حد تک محسوس کرتا ہے۔ اب نہیں چاہیے کہ اسے بے شعور

بےدر لاتعلق سمجھا جائے اور اس سے لاتعلق رہا جائے۔ ان چار ماہ کی مدت میں اس نے تجربے کیے ہیں اور چیزوں کو یاد کیا ہے۔ وہ اب خارجی دنیا کو دیکھنے والا اور اجتماعی وجود رکھنے والا انسان ہے۔ یہ احساس اگرچہ بہت سادہ اور باریک سا ہے۔ لیکن یہ اس کی آئندہ کی مفصل اجتماعی زندگی کا اُفق ہے۔ اگر ماں باپ اپنے بچے کے اس نئے احساس کو پہچانیں اور سوچ سمجھ کر عقلی بنیادوں پر اس کی تکمیل کی کوشش کریں تو وہ ایک اجتماعی شعور رکھنے والا مفید انسان پروان چڑھا سکتے ہیں لیکن خارجی دنیا کا یہ احساس آہستہ آہستہ دب جاتا ہے۔ اور بچہ داخلی دنیا کی ہولناک وادی کی طرف لوٹ جاتا ہے اور یہ بذات خود نقصان دہ صفات میں سے ہے۔ اسی صفت کی وجہ سے انسان گوشہ نشینی پسند کرنے لگتا ہے اور خود بین ہوجاتا ہے۔ معاشرے اور معاشرتی کاموں سے گریزاں ہوجاتا ہے دوسروں کے بارے میں بدگمان ہوجاتا ہے اور احساس کمتری کا شکار ہوجاتا ہے۔ تعاون اور ہمکاری سے ڈرتا ہے اور خوف کھاتا ہے۔

اس موقع پر ماں باپ کے سر پر نئی ذمہ داریاں آجاتی ہیں۔ انہیں چاہیے کہ بچے کو باشعور سمجھیں کہ جو اُن کے جذبات کو محسوس کرتا ہے اور ان کے کردار سے اثر قبول کرتا ہے۔ بچے کو بھول نہیں جانا چاہیے اور ہمیشہ اُس کی طرف توجہ رکھنا چاہیے۔ اس سے مسکراتے ہونٹوں اور اور خوش و خرم چہرے سے ملاقات کرنا چاہیے۔ اس سے محبت آمیز انداز سے بات کرنا چاہیے۔ پیار بھرے انداز سے بوسہ لے کر اُس سے اظہار محبت کرنا چاہیے۔ ایک مہربان ماں اپنے سر اور گردن کی حرکت سے، اپنے چشم و ابرو کے اشارے سے، اپنی میٹھی مسکراہٹ سے اور اپنی محبت آمیز گنگناہٹ سے بچے کی حس اجتماعی کو تقویت پہنچا سکتی ہے اور اُسے خارجی دنیا کی طرف متوجہ کرسکتی ہے۔ کھیلنے کی اچھی اچھی اور مناسب چیزوں کے ذریعے اُسے خارجی دنیا کی طرف متوجہ کیا جاسکتا ہے۔

بچے کی اندرونی خواہشات اگر ٹھیک طریقے سے پوری کردی جائیں تو وہ آرام اور سکون محسوس کرتا ہے، دوسروں کے بارے میں خوش بین ہوجاتا ہے۔ لوگوں کو خیر خواہ، مہربان اور ہمدرد سمجھتا ہے۔ جب معاشرہ اُس سے اچھا سلوک کرتا ہے اور اس کی اندرونی خواہشات کا مثبت جواب دیتا ہے تو بچہ بھی اس سے خوش بین اور مانوس ہوجاتا ہے۔ اس طرح کا

طرز فکر بچے کی روح اور جسم پر اچھے اثرات مرتب کرتا ہے اور اس کی آئندہ زندگی کے لیے اچھی بنیاد بنتا ہے اچھے ماں اور باپ بچے کو مارتے نہیں، ترش روئی سے پیش نہیں آتے اور اس کی زندگی کو تلخ نہیں بناتے کیونکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کا احمقانہ رویہ بچے پر روحانی اور نفسیاتی اعتبار سے برے اثرات مرتب کرتا ہے اور اس کے جذبات اور پاک احساسات کو مجروح کر دیتا ہے اور اس کی شکستگی کا باعث بنتا ہے۔ اسی غیر عاقلانہ طرزِ عمل کا نتیجہ ہی ہوتا ہے کہ بچہ ڈرپوک، احساسِ کمتری کا شکار، گوشہ نشین، بدبین اور دل گرفتہ ہو جاتا ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اپنی اولاد کا احترام کرو اور ان کی اچھی تربیت کرو تاکہ اللہ تمہیں بخش دے[1]

---

[1] مکارم الاخلاق ص ۲۵۵

محبّت

انسان محبت کا پیاسا ہے۔ محبت دلوں کو زندگی بخشتی ہے۔ جو اپنے آپ کو پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ دوسرے اس سے محبت کریں، محبوبیت کا یہ احساس اس کے دل کو شاد کر دیتا ہے۔ جسے یہ معلوم ہو کہ اُسے کوئی بھی پسند نہیں کرتا وہ اس پر آشوب زندگی میں اپنے آپ کو تنہا اور بے کس سمجھتا ہے۔ اس وجہ سے وہ ہمیشہ افسردہ اور پژمردہ رہتا ہے۔ بچہ بھی ایک چھوٹا سا انسان ہے اور اسے بڑوں کی نسبت محبت کی زیادہ ضرورت ہے۔ جیسے اسے غذا کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح اسے پیار اور محبت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ بچہ یہ نہیں سمجھتا کہ محل میں زندگی گزار رہا ہے یا جھونپڑی میں۔ البتہ یہ خوب سمجھتا ہے کہ دوسرے اس سے محبت کرتے ہیں یا نہیں۔ اس احساس محبت سے وہ آرام و سکون کے ساتھ اپنی نشو و نما کے راستے پر گامزن ہو سکتا ہے اور انسانیت کی بلند صفات حاصل کر سکتا ہے۔ اچھے اخلاق کا سرچشمہ محبت ہے۔ محبت کے پرتو میں بچے کے جذبات اور احساسات کو اچھے طریقے سے پروان چڑھایا جا سکتا ہے اور اسے ایک اچھا انسان بنایا جا سکتا ہے۔

جس بچے کو بھرپور محبت ملی ہو اس کی روح شاد اور دل پُر نشاط ہوتا ہے۔ وہ احساس محرومی کا شکار ہو کر بُرا ردعمل ظاہر نہیں کرتا۔ خوش بین، خوش مزاج اور پُر اعتماد ہوتا ہے۔ اس فطری نشو و نما کی وجہ سے وہ نفسیاتی مشکلات کا شکار نہیں ہوتا۔ خیر خواہ اور انسان دوست بن جاتا ہے۔ کیونکہ وہ محبت کے میٹھے چشمے سے سیراب ہوا ہوتا ہے لہذا چاہتا ہے کہ دوسروں کو بھی اس سے سیراب کرے۔ وہ لوگوں سے ایسا سلوک کرتا ہے جیسا اس سے کیا جاتا ہے۔

جو بچہ پیار محبت کے ماحول میں پرورش پاتا ہے وہ دورانِ بلوغت پیش آنے والی مشکلات اور جسمانی و نفسیاتی تبدیلیوں کا بہتر طور پر مقابلہ کر سکتا ہے۔

جس لڑکی کو ماں باپ سے محبت ملی ہو اور اس کا گھر یلو ماحول محبت سے معمور ہو وہ جوانی میں بے کسی اور محرومی کا احساس نہیں کرتی۔ وہ کسی خود غرض لڑکے کے چند محبت آمیز جملے سُن کر اپنے تئیں اس کے سپرد کر کے اپنا مستقبل تباہ نہیں کر دیتی۔ جس نوجوان نے پیار اور محبت کے ماحول میں پرورش پائی ہو وہ احساس محرومی کا شکار نہیں ہوتا کہ اسے بُرائیوں، منشیات اور شراب کے مراکز میں پناہ کی ضرورت پڑے۔

نفسیاتی نکتہ نظر سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ وہ بچے جنہیں خوب محبت ملی ہو ان بچوں کے مقابلے میں زیادہ ہوشمند اور صحیح و سالم ہوتے ہیں جو پرورش گاہوں میں پلے ہوں۔ اگرچہ پرورش گاہوں میں پلنے والے بچے غذا اور حفظانِ صحت کے اعتبار سے اچھے ہوں۔

مگر جس نے جذبات سے عاری سرد ماحول میں پرورش پائی ہو اور ماں باپ کی مہر و محبت نہ دیکھی ہو اس شخص کی کیفیت اطمینان بخش اور فطری نہیں ہو گی۔ جس شخص نے محبت کا ذائقہ نہ چکھا ہو وہ اسے دوسروں پر کیسے نثار کر سکتا ہے۔ ایسے محروم انسان سے انسان دوستی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

جو بچہ ماں باپ کی محبت سے محروم رہا ہو یا صحیح طریقے سے اُس سے بہرہ مند نہ ہوا ہو وہ اپنے اندر احساس محرومی و کمتری کرتا ہے اور اس میں ہر طرح کے انحراف کی گنجائش ہوتی ہے۔ تند خوئی، غصہ، ڈھٹائی، بدبینی، جھوٹ، حساسیت، نا امیدی، افسردگی، گوشہ نشینی، ناہم آہنگی کی زیادہ تر وجہ محبت سے محرومی ہوتی ہے۔

جو محبت سے محروم رہا ہو ہو سکتا ہے وہ چوری اور قتل میں ملوث ہو جائے تاکہ وہ اس معاشرے سے انتقام لے جو اُسے پسند نہیں کرتا یہاں تک کہ ممکن ہے وہ خودکشی کر لے تاکہ وہ وحشت اور تنہائی سے نجات حاصل کرے۔ بہت سے چور اور مجرم ایسی ہی محرومیت کا شکار اور دلگرفتہ ہوتے ہیں۔ آپ اخبارات اور رسائل کر دیکھ سکتے ہیں اور ایسے لوگوں کا حال پڑھ سکتے ہیں اور اس سے عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔

انجمن ملی حمایت بچگان کے شعبہ نفسیات کے سربراہ ڈاکٹر حسن احدی نے پانچ سو مجرموں پر ایک تحقیق کی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسے افراد نے پہلا جرم ۱۲ سے ۱۳ سال کی عمر کے دوران کیا ہے اور اس کی وجہ خاندان میں محبت کی کمی سے مربوط ہے .....

انجمن ملی حمایت بچگان کے نفسیاتی دیکھ بھال کے شعبے کے سربراہ اور معروف ماہر نفسیات و عمرانیات کہتے ہیں:

"بہت سارے نفسیاتی مسائل کی بنیاد بچپن میں پڑی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ سمجھدار ترین بچے کو جو مسئلہ پریشان کرتا ہے وہ اس کے جذبات کی تسکین کا معاملہ ہے۔" [1]

..... اپنے خط میں لکھتا ہے:

ایک چھوٹے سے قصبے میں، ایک غریب سے گھرانے میں میں نے آنکھ کھولی۔ میرے ماں باپ کے لیے میری اور میری دو بہنوں کی پرورش مشکل تھی۔ میری دادی مجھے اپنے گھر لے گئی۔ ان کی حالت ہم سے بہتر تھی۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ میرے لیے اچھے اچھے کپڑے اور دیگر ضروری چیزیں مہیا کرتی تھی۔ لیکن یہ رنگارنگ دنیا میری اس تشنگی کو دور نہ کر سکی جو ماں باپ سے دوری کی وجہ سے محسوس ہوتی تھی مجھے یوں لگتا جیسے مجھ سے کچھ کھو گیا ہو۔ کبھی کبھی دوسروں کی نظروں سے اوجھل میں پہروں روتا رہتا۔ میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ ایک مرتبہ میرا باپ مجھے ملنے آیا۔ اس نے مجھے اپنے گھر جانے کے لیے کہا۔ میں خوش ہو کر چلنے کو تیار ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا سالہا سال کا غم پل بھر میں ختم ہو گیا ہے۔ میں ہر ماں باپ کو یہ نصیحت کرتا ہوں کہ حالات کچھ بھی ہوں اپنے بچوں کو اپنے آپ سے جدا نہ کریں۔ انہیں اس امر کی طرف متوجہ رہنا چاہیے کہ ماں باپ سے دوری اور اُن کی محبت سے

---

[1] روزنامہ کیہان، شمارہ ۲۴م ۱۰۰

محرومی بچوں کے لیے نہایت سنگین اور تکلیف دہ ہے اس کی جگہ کوئی چیز بھی پُر نہیں کر سکتی۔

...... اپنے ایک خط میں لکھتا ہے:

میں ماں باپ کے پیار سے محروم تھا۔ اس لیے میں ایک دل گرفتہ اور حاسد انسان ہوں۔ ڈرپوک بھی ہوں اور غصیلا بھی۔ بچپن میں ہی اسکول سے بھاگ جایا کرتا تھا۔ چھٹی جماعت تک مشکل سے پڑھ پایا ہوں۔

دین مقدس اسلام کہ جس کی تربیتی مسائل کی جانب پوری توجہ ہے، اس نے محبت کے بارے میں بہت تاکید کی ہے۔ قرآن اور حدیث میں اس ضمن میں بہت کچھ موجود ہے۔ نمونے کے طور پر چند مثالیں پیش خدمت ہیں:

امام صادق علیہ السّلام نے فرمایا:

انسان کو اپنی اولاد سے جو شدید محبت ہوتی ہے اس کے باعث اللہ اپنے اس بندے کو مشمول رحمت قرار دے گا[1]

خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے فرمایا:

بچوں سے محبت بہترین عمل ہے کیونکہ ان کی خلقت کی بنیاد خدا پرستی اور توحید ہے۔ اگر وہ بچپن میں ہی مر جائیں تو بہشت میں داخل ہوں گے[2]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

بچوں سے پیار کرو اور ان پر مہربانی کرو[3]

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اپنے بچوں کو خوب چومو کیونکہ ہر بوسے کے بدلے میں اللہ جنّت میں تمہارا ایک درجہ بڑھا دے گا[4]

---

[1] وسائل، ج ۱۵، ص ۹۸

[2] مستدرک، ج ۲، ص ۶۱۵

[3] بحار، ج ۱۰۴، ص ۹۲

[4] بحار، ج ۱۰۴، ص ۹۲

ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا۔

میں نے آج تک کسی بچے کا بوسہ نہیں لیا۔

جب وہ شخص چلا گیا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا:

میری نظر میں یہ شخص دوزخی ہے[1]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

جو بچوں پر شفقت نہ کرے اور بڑوں کا احترام نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔[2]

حضرت علی علیہ السلام نے وصیت کرتے وقت فرمایا:

بچوں پر مہربانی کرو اور بڑوں کا احترام کرو[3]

---

[1] بحار، ج ۱۰۴، ص ۹۹

[2] بحار، ج ۷۵، ص ۱۳۷

[3] بحار، ج ۷۵، ص ۱۳۶

اظہار محبّت

اولاد کی محبت ایک فطری امر ہے۔ شاید بہت کم ماں باپ ایسے ملیں جو اپنی اولاد کو دل سے عزیز نہ رکھتے ہوں۔ البتہ نری یہ دلی محبت بچے کی خواہشات کی تکمیل کے لیے کافی نہیں ہے۔ بچہ اس محبت کا ضرورت مند ہے جو ماں باپ کے طرزِ عمل سے ظاہر ہو۔ بچے سے پیار کیا جائے، اُس کا بوسہ لیا جائے، اُسے گود میں اُٹھایا جائے، اس سے مسکرا کر پیش آیا جائے یہاں تک کہ ماں باپ جب اسے پیار بھری لوریاں سُناتے ہیں تو وہ احساسِ محبت کرتا ہے۔ بچے کا دل چاہتا ہے کہ کبھی ماں باپ سے کھیلے اور اٹھکیلیاں کرے۔ اسے وہ محبت کی ایک علامت سمجھتا ہے۔ ان کے غصے، جھگڑے اور سختی کو بے مہری کی دلیل سمجھتا ہے۔ جب ماں باپ بچے کی طرف دیکھتے ہیں اور اس سے بات کرتے ہیں تو وہ اندازہ لگا لیتا ہے کہ اس سے پیار کرتے ہیں یا نہیں۔

بعض ماں باپ ایسے بھی ہیں کہ بچہ چھوٹا ہو تو اس سے اظہار محبّت کرتے ہیں۔ لیکن جب بڑا ہو جائے تو اظہار محبت تدریجاً کم کر دیتے ہیں اور جب وہ نوجوان اور جوان ہو جاتا ہے تو اسے بالکل ترک کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں اب بڑا ہو گیا ہے اور اظہار محبت سے بگڑ جائے گا۔ اور ویسے بھی بڑا ہو کر کسی محبت اور نوازش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ بیٹا تمام عمر محبت کا محتاج رہتا ہے۔ ماں باپ کی محبت سے خوش ہوتا ہے اور ان کی بے مہری پر افسردہ ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر نوجوانی اور جوانی کی عمر کہ جو نفسیاتی اعتبار سے ایک ہیجانی دور ہوتا ہے اس میں اسے ہر زمانے سے زیادہ ماں باپ کی ہمدردی، مہربانی

اور دلجوئی کی احتیاج ہوتی ہے۔ یہ بے مہریوں ہی کا نتیجہ ہے کہ بہت سے جوان خودکشی کر لیتے ہیں۔ یا اپنے گھر، شہر اور ملک سے بھاگ جاتے ہیں۔ اس مقام پر غیر مناسب نہ ہوگا کہ ایک سولہ سالہ لڑکی کی ڈائری سے چند یادداشتیں آپ کی توجہ کے لیے پیش کی جائیں۔ لڑکی کا نام نازنین ہے۔ لکھتی ہے۔

واقعاً جب میں اپنی امی اور ابو کے بارے سوچتی ہوں تو ہنستی ہوں اگرچہ ان کی کیفیت نہ صرف یہ کہ ہنسنے کے لائق نہیں بلکہ بہت ہی غم انگیز ہے۔ ماں تو اپنی ہی دنیا میں اور اپنی زبان چلانے میں اور نہ جانے اپنے ہی کاموں میں سرگرم رہتی۔ اس کی کل خواہش یہی ہے کہ خالہ وزری جان اور حمیدہ بیگم کے ساتھ بیٹھی رہے اور گھنٹوں باتیں کرتی رہے جب وہ ان سے باتیں کر رہی ہو تو اگر میں یا میرے بھائی بہنوں کو اس سے کوئی کام پڑ جائے تو گویا اس کی گھڑیاں بہت تلخ ہو جاتی ہیں۔ اسے معلوم نہیں کہ جب وہ عورتوں کے ساتھ بیٹھی دوسروں کی غیبت کر رہی ہوتی ہے۔ کبھی کسی کے جوتے کی بات ہے اور کبھی کسی کی گڑیا کی۔ اس وقت میرے دل کی حالت ایک ایسے بے آشیاں پرندے کی سی ہوتی ہے کہ جو سرگرداں اور نالاں ہو اور در و دیوار سے ٹکرا رہا ہو تا کہ اسے بھی بات کرنے کے لیے کوئی ساتھی مل جائے۔ اس سے اپنا درد بیان کرے اور کچھ تسلی پائے۔ کوئی ایسا ساتھی ہو کہ جو غلطیوں اور کوتاہیوں پر کبھی برا بھلا نہ کہے اور بے عزتی نہ کرے۔ امی اور ابو تو آپس میں تو تکرار کرتے رہتے ہیں یا اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں۔ یا پھر گھر میں نہیں ہوتے۔ میں بھی صبح سے شام تک مدرسے میں ہوں اور بہت دن گزر گئے کہ میں نے ابو کو نہیں دیکھا کہ انہیں سلام کروں۔ میری ادبیات کی استاد ایک ماہر نفسیات ہے آج اس نے کلاس میں بیٹی کی زندگی پر باپ کے اثر پر بات کی۔ اس کی باتیں کیسے میرے دل میں بیٹھ گئیں۔ ہم سب کے دل میں بیٹھ گئیں۔ اس نے سچ کہا آج جب کہ میں سب لڑکیوں کی نظروں میں بڑی ہو گئی ہوں ہر زمانے سے زیادہ احساس کرتی ہوں کہ مجھے اپنے باپ کی راہنمائی کی ضرورت ہے

ایک فہمیدہ اور مہربان شخص کی توانائی کی احتیاج ہے۔

میں سچ کہتی ہوں،

مجھے اپنے باپ کی عمدہ نوازشات کی چند سال پہلے کی نسبت زیادہ ضرورت ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ کبھی وہ مجھے اپنے زانو پر بٹھا لے اور مجھے کہانی سنائے۔ مجھے اجازت دے کہ میں ہر چیز کے بارے میں اس سے سوال کروں۔ مجھے اجازت دے کہ میرے دل کی گہرائیوں میں اس کے بارے میں جو احساس ہے اور ارادہ ہے اس کا اظہار کروں لیکن ہائے افسوس! کہ وہ کس قدر سرد اور ترش رو انسان ہے۔ اصلاً اُسے اس کا خیال بھی نہیں آتا کہ میں اس کی سولہ سالہ بیٹی چھ سال کی عمر سے زیادہ اس کی دلگرم اور خوبصورت مہربانیوں کی احتیاج مند ہوں۔ میرے دل میں کتنی باتیں ہیں جو میں اس سے کہنا چاہتی ہوں۔ میرے ایسے غم ہیں کہ ایک دانا شخص بہتر سمجھ سکتا ہے لیکن وہ مجھ سے اور ہم سب سے یوں دور ہے جیسے ہم اُس کی زندگی میں کچھ بھی نہیں گھر میں اگر کوئی مہمان نہ ہو تو پھر وہ کتاب پڑھتا ہے۔ اخبار کا مطالعہ کرتا ہے یا سر درد اور دل درد لے کر بیٹھ جاتا ہے اور پیار محبت کی کوئی بات نہیں کرتا۔ یہ باپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں کہ جب وہ خاندان کے لیے نان و نفقہ فراہم کر دیں تو اس کے بعد ان کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ یہ کیوں نہیں سمجھنا چاہتے کہ بیٹی اور بیٹا جب بڑے ہو جاتے ہیں تو بالکل اسی طرح جیسے انہیں غذا کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے انہیں زیادہ معقول اور بیشتر محبت اور توجہ کی بھی نیاز ہوتی ہے۔ ماں باپ کیوں یہ سمجھتے ہیں کہ اگر انہوں نے اپنی ۱۶ سالہ بیٹی سے کبھی محبت کا اظہار کیا یا کوئی پیار بھرا کلمہ کہہ دیا یا اس سے پند و نصیحت کے بغیر کوئی دوستانہ بات کر دی تو ماں باپ کی شخصیت اور حیثیت مجروح ہو گی۔ میرے دل میں بہت غصہ ہے۔ میں بہت کمی کا احساس کرتی ہوں۔ اگرچہ میرے خوبصورت گھر میں میرے لیے اچھا کمرہ ہے اچھے اسکول میں جاتی ہوں۔ میری وضع قطع اور لباس اچھا ہے ان سب چیزوں کے لیے میرے ابو پیسہ بھی دیتے ہیں اور آرام سے خرچ بھی کرتے ہیں۔ زحمت بھی اٹھاتے

ہیں۔ لیکن وہ کام جس پر کچھ خرچ نہیں ہوتا اور بہت ہی کم زحمت اٹھانا پڑتی ہے وہ نہیں کرتے۔ وہ ہماری طرف توجہ نہیں کرتے[1]

بچے کی تربیت کے لیے بہترین جگہ، بالخصوص زندگی کے ابتدائی دور میں گھر کا ماحول ہوتا ہے۔ اس میں بچہ اپنے ماں باپ کی پوری توجہ، نوازش اور محبت سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ ماں باپ کو یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ حتی المقدور اپنے بچوں کو مراکز پرورش کے سپرد نہ کریں کیونکہ ہو سکتا ہے پرورش گاہ غذا اور حفظانِ صحت کے اعتبار سے گھر کی نسبت بہتر ہو لیکن بچے کے لیے ایک سرد اور بے مہر ماحول ہے۔ پرورش گاہ اُس بچے کے لیے ایک زندان اور صحت افزا مقام پر جلا وطنی کے مانند ہے کہ جو ماں باپ کی توجہ اور محبت کا ضرورت مند ہے۔ اچھی آب و ہوا اور اچھی غذا روحانی مسرت اور مہر و محبت کی جگہ نہیں لے سکتی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

جب تم کسی کو پسند کرتے ہو تو اپنی محبت کا اظہار بھی کرو اظہار محبت سے صلح و صفائی وجود میں آتی ہے وہ تمہیں ایک دوسرے کے نزدیک کر دیتی ہے[2]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبح سویرے اپنی اولاد اور نواسوں سے پیار کیا کرتے تھے[3]

---

[1] روزنامہ اطلاعات، شمارہ ۱۳۱۳، ۱۴ خرداد ماہ ۱۳۵۸ھ

[2] مستدرک، ج ۲، ص ۶۷

[3] بحار، ج ۱۰۴، ص ۹۹

محبّت۔ کام نکالنے کا ذریعہ نہیں

چونکہ بچے کو ماں باپ کی محبت اور پیار کی ضرورت ہے، بعض ماں باپ بچے سے اس احساس سے استفادہ کرتے ہیں اور اسے کام نکالنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس سے کہتے ہیں یہ کام کرو تا کہ امی تجھ سے پیار کرے اور اگر تم نے فلاں کام کیا تو ابو تم سے پیار نہیں کریں گے۔ البتہ شک نہیں ہے کہ اس طریقے سے بچے پر اثر انداز ہوا جا سکتا ہے اور اس کے کاموں کو ایک حد تک کنڑول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اسی راستے کو اختیار کیئے رہنا بے ضرر نہیں ہے۔ کیونکہ اس ذریعہ سے آہستہ آہستہ بچہ میں عادت پیدا ہو جائے گی کہ وہ ماں اور باپ اور دوسرے لوگوں کی محبت حاصل کرنے کے لیے کام کرے نہ اس لئے کہ وہ کام واقعی اسکے اور معاشرے کے مفاد میں ہے وہ کاموں کی اچھائی اور بُرائی کا معیار دوسروں کو دوست بنانے یا نہ بنانے میں سمجھنے لگے گا جب کہ چاہیئے یہ کہ اچھائی اور بُرائی کا معیار انفرادی اور اجتماعی مفاد اور بھلائی اور رضائے الٰہی کا حصول ہو نہ کہ لوگوں کی خواہش اور ایسا نہیں ہے کہ سب ماں باپ بچے اور معاشرے کے حقیقی مفادات کو بخوبی پہچان سکیں ایسے ماں باپ بھی ہیں کہ اپنے مفادات اور آرام کو حقیقی فائدے پر ترجیح دیتے ہیں اس ذریعہ سے یہ بھی ممکن ہے کہ بچہ چاپلوس، منافق اور فریب کار بن جائے کیونکہ اس کا مقصد دوسروں کی خوشنودی اور توجہ حاصل کرنا بن جائے گا اگرچہ وہ منافقت اور فریب کاری ہی کے ذریعے کیوں نہ ہو۔ لہٰذا ایک سمجھدار مربی محبت کو مطلب نکالنے اور بچے پر اثر انداز ہونے کا وسیلہ قرار نہیں دیتا۔

محبت ۔ جو تربیت میں حائل نہ ہو

بعض ماں باپ اپنی اولاد سے حد سے زیادہ محبت رکھتے ہیں اس لیے اس کے لئے جو چیزیں ضرر رساں ہیں قطعاً نہیں سمجھتے اور اگر کبھی وہ اس میں عیب دیکھیں یا کوئی دوسرا اس کی طرف متوجہ کرے تو چونکہ یہ نہیں چاہتے کہ بچے کو ناراض کریں لہٰذا وہ اس عیب کو ان دیکھا کر دیتے ہیں اور اس کی اصلاح کی کوشش نہیں کرتے ہیں آپ ایسے بے ادب بچوں کو دیکھتے ہوں گے جو دوسرے بچوں کو اذیت دیتے ہیں، لوگوں کو تنگ کرتے ہیں، لوگوں کی در و دیوار کو خراب کر دیتے ہیں، شیشے توڑ دیتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں، لوگوں کے مال کو نقصان پہنچاتے ہیں اور اسی طرح کی دوسری حرکتیں کرتے ہیں لیکن ان کے نادان ماں باپ نہ فقط یہ کہ ان کو تنبیہ نہیں کرتے بلکہ ایک احمقانہ ہنسی سے ان کا بے جا دفاع کرتے ہیں اور اس طرح سے ایسے کاموں میں ان کی تشویق کا باعث بنتے ہیں یہ بے وقوف ماں باپ اپنی بے جا محبت سے دوستی کے لباس میں اپنے بچوں کے ساتھ بہت بڑی خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں اور یہ ظلم عظیم اللہ کے نزدیک بے مواخذہ نہیں ہوگا۔ بچوں سے محبت کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی تربیت سے غافل ہو جائیں اور انہیں ہر کام کرنے کی کھلی چھٹی دے دیں۔ اظہار محبت تربیت کا وسیلہ ہے اسے تربیت میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتے۔ بہترین ماں باپ وہ ہیں جو بچے کی محبت کو اور تربیت کے مسئلہ کو الگ الگ کر کے دیکھیں اپنے بچوں سے خوب محبت کریں لیکن حقیقت بین نظروں سے ان کی خوبیوں اور خامیوں پر نظر رکھیں اور نہایت سمجھداری سے ان کی اصلاح کی کوشش کریں بچے کو بھی یہ بات سمجھنی چاہیئے کہ وہ برے کام کرنے

ہیں آزاد نہیں اور اس پر اس کی باز پرس کی جائے گی اور اس کو ہمیشہ خوف اور امید کے عالم میں زندگی گزارنی چاہیئے ماں باپ کی محبت سے اس کو دلگرم اور پر امید ہونا چاہیئے اور برے کاموں پر ان کی ناراضی اور غصے کا اسے خوف ہونا چاہیئے جن ماں باپ کو اپنے بچے سے محبت ہے ان کو یہ جاننا چاہیئے کہ ہمیشہ یہ بچہ ہی نہیں رہیگا اور نہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہیگا بلکہ وہ بڑا ہو جائے گا اور ناچار معاشرے میں زندگی گزارے گا لوگوں سے معاشرت کرے گا اگر اسے زندگی اور معاشرت کے آداب نہ آئے اور اس نے دوسروں کے حقوق کا احترام کرنا نہ سیکھا تو لوگ اس سے نفرت کریں گے اور اس طرح سے وہ لوگوں کی توجہ اور محبت حاصل نہیں کر سکے گا کہ جو زندگی کی خوشی اور راحت کے لیے ضروری ہے لوگ ماں باپ کی طرح نہیں ہوتے کہ اولاد کے عیوب کو نظر انداز کر دیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

سب سے برا باپ وہ ہے کہ جو اولاد سے محبت اور احسان کرنے میں حد سے تجاوز کرے[1]

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

جسے ادب سکھا دیا گیا اس کی برائیاں کم ہو گئیں[2]

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

میرے ابا جان نے ایک شخص کو دیکھا کہ جو اپنے بیٹے کے ساتھ جا رہا تھا۔ وہ بے ادب بیٹا اپنے باپ کے ہاتھ کا سہارا لیے ہوئے تھا۔ میرے والد زین العابدینؑ اس بے ادب بیٹے پر اتنے ناراض ہوئے کہ ساری عمر اس سے بات نہ کی[3]

---

[1] تاریخ یعقوبی، ج ۲، ص ۳۲۰

[2] غرر الحکم ج ۲ ص ۶۴۵

[3] بحار جلد ۷۴، ص ۶۴

بگڑا ہوا بچّہ

یہ صحیح ہے کہ بچے کو محبت و نوازش کی ضرورت ہوتی ہے لیکن محبت میں افراط صحیح نہیں ہے۔ محبت غذا کے مانند ہے اگر ضروری مقدار میں اپنے مقام پر صرف ہو تو مفید ہے لیکن ضروری مقدار سے زیادہ اور غیر مناسب مقام پر صرف ہو تو نہ صرف یہ کہ سود مند نہیں ہے بلکہ کتنی ایک نقصانات کی حامل بھی ہے۔ زیادہ لاڈ پیار نہ صرف بچے کے لیے مفید نہیں ہے بلکہ تربیت کے نقطہ نظر سے ایک بہت بڑی خیانت و اشتباہ ہے۔ بچہ کوئی کھیل کا سامان نہیں ہے نہ ماں باپ کے دل بہلانے کا ذریعہ ہے وہ ایک چھوٹا سا انسان ہے کہ جس کی خود اس کے لیے اور اس کے مستقبل کے لیے تعمیر و تربیت کی جاتی ہے اور یہ بہت بڑی ذمہ داری ماں باپ کے کندھے پر رکھی گئی ہے۔ بچہ ہمیشہ چھوٹا نہیں رہتا بلکہ بڑا بھی ہو جاتا ہے اسے معاشرے میں زندگی بسر کرنا ہے اور زندگی بسر کرنا کوئی آسان کام نہیں بلکہ اس میں اونچ نیچ، کامیابی و ناکامی، عروج و زوال راحت و مصیبت اور خوشی اور غم موجود ہوتا ہے۔ ایک سمجھدار مربی صحیح اور عاقلانہ طرز تفکر کے ساتھ زندگی کے حوادث کو مدّ نظر رکھتے ہوئے اپنے بچے کی اس طرح سے تربیت کرتا ہے کہ وہ زندگی کے نشیب و فراز سے گزرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ ماں باپ کو یہ بات معلوم ہونا چاہیے کہ جیسے بچے کی تربیت کے لیے اصولی طور پہ محبت ضروری ہے اسی طرح محبت میں زیادتی برے نتائج کی حامل ہے۔ جن بچوں کو حد سے زیادہ لاڈ پیار کیا جائے وہ بگڑ جاتے ہیں اور ان کے ناز نخرے بہت بڑھ جاتے ہیں۔ اس بری صفت کا نتیجہ خطرناک نکلتا ہے۔ مثلاً:

ا۔ جب بچہ یہ محسوس کرے گا کہ اس کے ماں باپ اسے بے انتہا چاہتے ہیں، پرستش کی حد تک اس سے محبت کرتے ہیں اور اس کی مرضی کے مطابق اس سے سلوک کرتے ہیں تو اس سے اس کی خواہشات کا دائرہ بہت وسیع ہو جائے گا۔ وہ چاہے گا کہ فقط فرمان صادر کرے اور ماں باپ بلا چون و چرا اس پر عمل کریں کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔ ایسے بچے میں دن بدن استبداد اور قدرت طلبی بڑھتی جائے گی۔ یہاں تک کہ وہ ایک آمر حکمران کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایسا شخص جب معاشرے میں آتا ہے تو لوگوں سے بھی یہ توقع رکھتا ہے کہ اس سے اس کے ماں باپ کی طرح محبت کریں اور اس کی خواہشات پر اسی طرح عمل پیرا ہوں جیسے اس کے ماں باپ ہوتے ہیں لیکن لوگ خود غرض شخص سے محبت کرتے ہیں اور نہ اس کی خواہشات کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اسی بناء پر معاشرے سے اس کا دل اچاٹ ہو جاتا ہے۔ وہ شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا ہے۔ احساس کمتری کے باعث تنہائی پسند اور گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔ وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ شکست و ناکامی کے ساتھ زندگی گزارے یا پھر خودکشی کرکے اپنے آپ کو اس سے نجات دے لے۔ بگڑے ہوئے اور ناز پرور لوگ ازدواجی زندگی میں بھی عموماً کامیاب نہیں ہوتے۔ ایسا شخص اپنی بیوی سے بھی یہ توقع رکھے گا کہ اس کی ماں سے بھی بڑھ کر اس سے اظہار محبت کرے، اس کے فرامین کی پوری طرح اطاعت کرے اور بلا چون و چرا ان پر عمل کرے۔ لیکن افسوس کہ عملی زندگی میں صورت حال مختلف ہے بہت سی بیویاں اپنے شوہر کے استبداد اور حکم کے سامنے تسلیم محض کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس لیے گھریلو لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک بگڑی ہوئی بیٹی بھی جب اپنے سسرال میں جاتی ہے تو اس کی بھی اپنے شوہر سے یہی توقع ہوتی ہے کہ وہ اس سے اس کے ماں باپ سے زیادہ محبت کرے اور اس کی ہر خواہش کو بلا حیل و حجت قبول کرلے۔ عموماً مرد بھی ایک بلند پرواز اور ایسی بگڑی ہوئی عورت کی تمام خواہشات پوری نہیں کر سکتے۔ لہٰذا گھر میں لڑائی جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے مرد اور عورتیں دیکھنے میں آجاتے ہیں جو اپنے بڑھاپے میں بھی اس بات پر تیار نہیں ہیں کہ اس بگڑے پن اور بچگانہ عادت سے دست بردار ہو کر بڑے ہو جائیں۔ ایسے لوگ گویا اس پر مصر ہیں کہ ہمیشہ بچے ہی رہیں۔

۱۔ ناز و نعم میں پلنے والے بچے عموماً ضعیف و ناتواں رُوح اور رنجیدہ نفسیات کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ دوسروں کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور خود اعتمادی سے عاری ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب مشکلات پیش آتی ہیں تو راہ فرار ڈھونڈتے ہیں۔ ان میں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ بڑے کاموں میں ہاتھ ڈالیں۔ زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے وہ اللہ پر اور اپنی ذات پر اعتماد کرنے کے بجائے دوسروں کی مدد کی طرف دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

۲۔ لاڈ پیار سے بگڑے ہوئے اور ناز پروردہ افراد عموماً خود پسند اور اپنے آپ میں مگن ہوتے ہیں۔ چونکہ ان کی حد سے زیادہ تعریف کی جاتی ہے اس لیے وہ اپنے تئیں ایک بہت بڑی شخصیت سمجھنے لگتے ہیں جب کہ حقیقت یوں نہیں ہوتی۔ وہ اپنی برائیاں نہیں دیکھتے بلکہ عیب کو کمال سمجھتے ہیں اور غرور بھی ایک بہت بڑا اخلاقی عیب اور ایک خطرناک نفسیاتی بیماری ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

خود پسندی بدترین چیز ہے۔[۱]

امام علی علیہ السلام نے یہ بھی فرمایا:

جو شخص بھی خود پسند ہو اور بس اپنے میں مگن ہو اس کے عیب اور برائیاں اس پر واضح ہو جائیں گی۔[۲]

ایسا شخص لوگوں سے یہ توقع رکھتا ہے کہ اس کی جھوٹی شخصیت کی تعریف کریں۔ اس وجہ سے کاسہ لیس اور چاپلوس قسم کے لوگ اس کے گرد جمع ہو جائیں گے۔ لیکن سچ گو اور تنقید کرنے والوں کی اس کے ہاں کوئی جگہ نہ ہو گی۔ خود پسند لوگ نہ صرف یہ کہ دوسروں کی محبت اور دوستی کو جذب نہیں کر سکتے بلکہ ہمیشہ دوسروں کے نزدیک قابل نفرت قرار پاتے ہیں۔

۱۔ غرر الحکم، ص ۴۲۶

۲۔ غرر الحکم، ص ۶۸۵

حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا:

جو شخص بھی خود پسند ہوگا اور بس اپنی ذات میں مگن ہوگا وہ بہت زیادہ مشکلوں میں پھنس جائے گا۔[1]

۴۔ جن بچوں سے حد سے بڑھ کر محبت اور نوازش کی جاتی ہے اور ماں باپ ان کی ہر بات مانتے چلے جاتے ہیں وہ رفتہ رفتہ ماں باپ پر بالکل مسلط ہو جاتے ہیں۔ جب بڑے ہو جاتے ہیں تو بھی اقتدار طلبی سے باز نہیں آتے اور ماں باپ سے بہت زیادہ توقعات رکھتے ہیں۔ اگر ماں باپ ان کی خواہشوں کے مقابلے میں آئیں تو وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ غصہ، جھگڑا، اور ناز نخرا کرتے ہیں اور عادتیں بگاڑنے والے ماں باپ سے ہرجانہ وصول کرتے ہیں۔ چونکہ انہیں اپنے لاڈلے پن کا احساس ہوتا ہے اس لیے آخر عمر تک ماں باپ سے جھوٹ بولتے ہیں اور ہرجانہ وصول کرتے ہیں۔

۵۔ محبت میں افراط بعض اوقات اس مقام پر جا پہنچتی ہے کہ اُسے خوش رکھنے کے لیے حقیقی مصلحتوں اور تعلیم و تربیت پر اس کی رضامندی کو ترجیح دینا پڑتی ہے۔ اس کے عیبوں کو نہیں دیکھا جاتا یا نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور اس کی اصلاح کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کسی بھی کام سے دریغ نہیں کیا جاتا اگرچہ وہ غیر شرعی ہی کیوں نہ ہو اور اس طرح سے ماں باپ اپنے عزیز بچے کے ساتھ عظیم ترین خیانتوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

بدترین باپ وہ ہے کہ جو اپنے بچے سے احسان اور مہر و محبت میں افراط اور حد سے تجاوز کرے۔[2]

بچے کو ہمیشہ خوف و رجا کی کیفیت میں زندگی بسر کرنا چاہیے۔ اسے یہ اطمینان ہونا

---

[1] غرر الحکم، ص ۶۵۹

[2] تاریخ یعقوبی، جلد ۲، ص ۳۲۰

چاہیے کہ وہ واقعاً ماں باپ کا محبوب ہے اور جہاں بھی ضروری ہوا وہ اس کی مدد کو دوڑیں گے اور دوسری طرف اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ جہاں بھی اس نے کوئی غلط کام انجام دیا ماں باپ اُس کا مؤاخذہ کریں گے۔

ڈاکٹر جلالی لکھتے ہیں!

بچے سے پیار ایک ضروری چیز ہے۔ لیکن بچے کا یہ چاہنا صحیح نہیں ہے کہ ماں باپ سارا وقت اسی کو دے دیں اور ہمیشہ اُسی کے چاؤ چوچلے کرتے۔[۱]

ڈاکٹر جلالی ہی لکھتے ہیں:

اگر بچہ ایسے ماحول میں زندگی گزارتا ہو کہ جہاں اُسے بہت لاڈ سے رکھا جاتا ہو۔ ہمیشہ دوسرے اس کی حمایت کرتے ہوں۔ اس کے بُرے اور ناپسندیدہ کاموں کو معاف کر دیا جاتا ہو اور مشقت طلب دنیا میں رہنے کے لیے اسے تیار نہ کیا جاتا ہو وہ معاشرے میں ہمیشہ بہت ساری مشکلات اور رکاوٹوں کا سامنا کرے گا۔ بچے کو آغاز تولد سے ہی یہ سکھایا جانا چاہیے کہ زندگی گزارنے والا وہ اکیلا نہیں ہے بلکہ وہ ایک معاشرے کا حصہ ہے اور اس کی خواہشوں کو دوسروں کی خواہشات سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔[۲]

اگر بچہ بے مقصد ہی روئے یا غصہ کرے یا سر کو دیوار سے مارے اور اس طرح سے ماں باپ پر کامیابی حاصل کرنا چاہے اور اپنی غلط سلط خواہشات کو منوانا چاہے تو اس کی طرف اعتناء نہیں کرنا چاہیے۔ اُسے چھوڑ دیں تاکہ وہ سمجھ لے کہ اس کے رونے دھونے سے دنیا کا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ کچھ صبر کریں وہ خود ہی ٹھیک ہو

---

[۱] روانشناسی کودک ص ۲۶۱

[۲] روانشناسی کودک ص ۳۵۲

جائے گا۔

اگر آپ کا بچہ زمین پر گر جائے تو ضروری نہیں کہ اسے اٹھائیں اور اُسے تسلی دیں یا زمین کو بُرا بھلا کہیں۔ رہنے دیں تاکہ وہ خود اٹھے پھر اسے نصیحت کریں کہ محتاط رہے زمین پر نہ گرے۔ اگر اس کا سر دیوار سے ٹکرا جائے تو چومنا اور پیار کرنا ضروری نہیں ہے ایسے امور کی پرواہ نہ کریں۔ کچھ ذرا ٹھیک ہو جائے تو پھر اُسے نصیحت کریں۔ جب آپ کا بچہ بیمار ہو جائے تو اس کے علاج کی کوشش کریں۔ اس کے لیے دوا اور غذا مہیا کریں۔ اس کی دیکھ بھال میں دریغ نہ کریں اس کی بیماری کو ایک معمولی واقعہ قرار دیں اور اپنے روزمرہ کے کام انجام دیتے رہیں۔ آپ کی نیند، کھانا اور کام معمول کے مطابق انجام پانا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ اپنے کام اور معمولات زندگی کو چھوڑ بیٹھیں اور غمزدہ وہ کے ساتھ روتی آنکھوں کے ساتھ اس کے بستر کے کنارے بیٹھ جائیں اور وقت بے وقت اس کے بخار میں تپتے ہوئے چہرے کو چومتے رہیں۔ یہ کام بچے کے معالجے پہ کوئی اثر نہیں ڈالتے البتہ اسے بگاڑ ضرور دیتے ہیں کیوں کہ وہ خوب احساس کرتا ہے کہ اس کی بیماری ایک غیر معمولی واقعہ ہے جس نے ماں باپ کی زندگی کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔

..... اپنے خط میں لکھتی ہے،

دو بیٹیوں کے بعد میرے ماں باپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا مجھے اپنی ماں کا شور شرابہ اور جشن و سرور بھولتا نہیں، میرے ماں باپ نے اس قدر اسے لاڈ پیار کیا کہ دو سال کی عمر میں وہ مجھے اور میری بہن کو خوب مارتا اور کاٹتا تھا اور ہمیں جرأت نہ تھی کہ اپنا دفاع کریں۔ جو کچھ وہ چاہتا بلا چون و چرا مہیا کر دیا جاتا۔ بچوں کو اذیت کرتا۔ اس کے مدرسہ جانے کے لیے اس پہ بہت زیادہ عنایات کی جاتیں۔ لیکن وہ کوئی کام کرنے پر آمادہ نہ ہوتا۔ استاد کی بات پر کان نہ دھرتا لہٰذا وہ سلسلہ تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور ترقی نہ کر سکا۔ اب جب کہ بڑا ہو گیا ہے بالکل ان پڑھ

ہے۔ تنہائی پسند، کم گو اور اپنے آپ میں کھویا رہتا ہے۔ کسی کام کے کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ بے مقصد ہی ادھر اُدھر غصہ کرتا اور جھگڑتا رہتا ہے۔ اپنی بہنوں سے اسے کوئی محبت نہیں۔ اس کا انجام کار معلوم نہیں ہے۔

ہاں ! ہمارا پیارا بھائی ماں باپ کی غلط تربیت اور حد سے زیادہ محبت میں افراط کی بھینٹ چڑھ گیا ہے۔

انگوٹھا چوسنا

بچے کی ایک عام عادت انگوٹھا چوسنا ہے۔ عموماً بچے اپنی پیدائش سے تین ماہ بعد انگوٹھا چوسنے لگتے ہیں اور کچھ عرصہ یہ سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ اس کام کے فطری عامل اور اصلی بنیاد کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ بچہ اپنی عمر کے ابتدائی ایام میں دودھ کے ذریعے سیراب ہوتا ہے اور دودھ چوس کر ہی پیتا ہے۔ اسے جب بھی بھوک لگتی ہے اور کچھ ناراحتی سی محسوس کرتا ہے تو ماں کے پستان یا چوسنی کو چوستا ہے اور دودھ پی کر اپنی ناراحتی دور کرتا ہے۔ اس مدت میں اسے اس عمل کے تکرار سے یہ تجربہ ہوتا ہے کہ چوسنے کے ذریعے ناراحتی دور ہوتی ہے اور آرام سا ملتا ہے۔ تدریجاً وہ چوسنے کا عادی ہو جاتا ہے اور اس عمل سے کیف حاصل کرتا ہے۔ ان ایام میں جب کہ بچے کے معاشرتی احساسات کسی حد تک بیدار ہو چکے ہوتے ہیں اور وہ خارجی دنیا کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے، اس کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس لذت بخش عمل یعنی چوسنے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے اس مقصد کے لیے بہترین اور آسان ترین چیز اس کے پاس انگوٹھا چوسنا ہی ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ اپنا انگوٹھا چوستا ہے اور رفتہ رفتہ اس کا عادی ہو جاتا ہے اور اسے جب بھی موقع ملے ہر طرح کی ناراحتی دور کرنے کے لئے اس لذت بخش مشغولیت سے استفادہ کرتا ہے۔ بہت سے ماں باپ انگوٹھا چوسنے کو ایک بری عادت سمجھتے ہیں اور اس پر اپنی ناپسندگی کا اظہار کرتے ہیں اور ناراض ہو کر اس کا چارۂ کار سوچتے ہیں۔ یہاں پر اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ اگرچہ دانتوں کے بعض ڈاکٹر اس عادت کو نقصان دہ سمجھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ انگوٹھا چوسنے سے

اور منہ کی طبیعی و فطری حالت بگڑ جاتی ہے لیکن ان کے مقابلے میں دانتوں کے بہت سے ڈاکٹروں اور ماہرینِ نفسیات نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ انگوٹھا چُوسنے سے کوئی مسئلہ پیش نہیں آتا۔

ایک ماہر لکھتے ہیں:

بہت سے معالجینِ نفسیات اور ماہرینِ نفسیات اور اسی طرح بچوں کے امور کے بہت سے ماہرین کا نظریہ ہے کہ اصولاً یہ عمل کوئی نقصان دہ عادت نہیں ہے اور بہت سے مقامات پر یہ عمل بچے کے منہ میں کسی قسم کی تبدیلی کا باعث نہیں بنتا۔ ان کا خاص طور پر یہ نظریہ ہے کہ یہ عادت جیسا کہ عموماً دیکھنے میں بھی آیا ہے مستقل دانت نکلنے پر ختم ہو جاتی ہے لہٰذا یہ بچے کے لیے کسی نقصان کا باعث نہیں بنتی[1]

البتہ ممکن ہے کبھی یہ عادت بچے کی صحت و سلامتی کو نقصان پہنچائے کیوں کہ بچے کی انگلی عموماً گندی اور کثیف ہوتی ہے اور ایسی کثیف انگلی چُوسنے سے اکثر نقصان کا امکان ہوتا ہے۔ زیادہ تر ماں باپ اس عادت کو پسند نہیں کرتے اور شرم کا احساس کرتے ہیں۔

بہرحال ظاہراً یہ موضوع کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا اور بچہ جب چار پانچ سال کا ہو جاتا ہے تو خود بخود یا ماں باپ کے ذریعے یہ عادت ختم ہو جاتی ہے البتہ ماں باپ کو اگر یہ عادت پسند نہیں تو بہتر ہے کہ اس کے وقوع سے پہلے ہی اس کا علاج کریں کیونکہ کسی عادت کو پیدا ہونے سے روکنا ترکِ عادت کی نسبت بہت آسان ہے۔

جب وہ دیکھیں کہ بچہ اپنی انگلی چُوسنا چاہتا ہے تو اس کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کریں اگر وہ سیر نہیں ہوا تو اسے دودھ اور پلائیں اگر اسے جلد بھوک لگ جاتی ہو تو غذائی وقفے کے دوران میں اسے کوئی سادہ سی غذا مثلاً بسکٹ اور پھلوں کا رس دے سکتے ہیں۔ اگر اس کی وجہ احساسِ تنہائی یا کوئی تکلیف ہے تو اس کی طرف زیادہ توجہ کرنا چاہیے اور

---

[1] روان شناسی کودک — رفتارِ کودکان — از تولد تا دہ سالگی، ص ۱۶۲

اس سے اظہار محبت کریں۔ ایسی چیزیں ہو سکتا ہے اس عادت کی پیدائش کا سبب ہوں۔ اگر سبب دور کر دیا جائے تو زیادہ امکان یہی ہے کہ بچے میں ایسی عادت پیدا نہیں ہوگی۔ لیکن اگر عادت پیدا ہوگئی تو پھر اس کا علاج مشکل ہے۔ اگر اسے کھیلنے کی مناسب چیزیں دے دی جائیں یا اس کے ساتھ کوئی کھیلنے والا ل جائے تو شاید تدریجاً یہ عادت ترک ہو جائے۔ شاید اس کا بہترین علاج اُسے چوسنی دے دینا ہو۔ لیکن اس میں خرابی یہ ہے کہ اُسے چوسنی کی عادت پڑ جائے گی۔ اگر ایسے کاموں کے ذریعے سے اس عادت کو روک سکیں تو کیا ہی بہتر۔ لیکن اگر کامیاب نہ ہوں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس پر سختی شروع کر دی جائے مثلاً اس کے ہاتھ باندھ دیے جائیں، اسے مارا جائے۔ اس سے تلخی کی جائے، اُسے ڈانٹ ڈپٹ یا ملامت و سرزنش کی جائے کیوں کہ ایسے کام اس کے علاوہ کہ عموماً بے فائدہ ہوتے ہیں بچے کی روح اور نفسیات پر بھی بُرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ بہتر ہے کہ صبر کریں اور کسی مناسب موقع کا انتظار کریں زیادہ تر یہ عادت چار یا پانچ سال کی عمر میں خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔

خوف

خوف سب میں پائی جانے والی ایک صفت ہے۔ تھوڑا یا زیادہ سب لوگوں میں ہوتا ہے اجمالی طور پہ خوف انسان کی حفاظت کے لیے ضروری ہے اور اس طرح سے ہونا کوئی بری چیز بھی نہیں ہے۔ جس میں بالکل ہی خوف نہ ہو وہ انسان معمول کے مطابق نہیں ہے بلکہ بیمار اور ناقص ہے، یہ خوف ہے جس کی وجہ سے انسان خطرناک حوادث سے بھاگتا ہے اور اپنے آپ کو موت سے بچاتا ہے۔ لہذا خوف اللہ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے کہ جو خالق کائنات نے انسان کے وجود میں ودیعت کی ہیں اور اس میں مصلحتیں اور حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ لیکن یہ عظیم نعمت دیگر تمام نعمتوں کی طرح اس صورت میں مفید ہو گی کہ جب انسان اس سے صحیح طور پہ استفادہ کرے۔ اگر وہ اپنے صحیح مقام کے برخلاف استعمال ہوئی تو نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہے بلکہ ممکن ہے برے نتائج کی حامل بھی ہو۔ خوف کے مواقع کو مجموعی طور پہ ۲ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا۔ خیالی، بے موقع اور غیر عقلی خوف

دوسرا۔ معقول، درست اور بجا خوف۔

غیر عاقلانہ خوف

پہلی قسم کا غیر عاقلانہ خوف عموماً زیادہ ہوتا ہے۔ جیسے جن اور بھوت سے ڈرنا تاریکی سے خوف کھانا، بے ضرر حیوانات سے ڈرنا، بلی، چوہے، لال بیگ، مینڈک، اونٹ، گھوڑے

اور دیگر ایسے جانوروں سے ڈرنا۔ چور سے ڈرنا، مردے، قبرستان، قبر اور کفن سے ڈرنا، ڈاکٹر، ٹیکے اور دوا سے خوف کھانا، دانتوں کے ڈاکٹر سے ڈرنا، ریل گاڑی کی آواز یا بادل کے گرجنے اور بجلی کے کڑکنے سے خوف کھانا، اکیلے سونے سے ڈرنا، امتحان دینے اور سبق سنانے سے ڈرنا، بیماری سے خوف کھانا، موت سے ڈرنا اور ایسے ہی دیگر دسیوں قسم کے خوف کہ جو بالکل بے موقع ہیں اور ان کی بالکل کوئی عقلی بنیاد نہیں ہے۔ ایسے خوف کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے ایسے ہی خوف ہوتے ہیں کہ جو بچے کو دائمی رنج و عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ سکھ کی نیند سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور نیند میں وحشت ناک قسم کے خواب دیکھتا ہے اور چیختا چلاتا ہے۔ بے جا خوف و اضطراب ایک نفسیاتی بیماری ہے جو بچے کی آئندہ زندگی پر بھی بُرے اثرات مرتب کرے گی۔ ڈرپوک آدمی میں جرأت نہیں ہوتی کہ وہ کوئی بڑا قدم اٹھائے ہمیشہ اضطراب کے عالم میں رہے گا اور اس کے دل میں ہمیشہ گرہ سی رہے گی، ملنے جلنے سے کترائے گا، پریشان اور افسردہ رہے گا۔ اجتماع سے بھاگے گا اور اپنی ذات میں گم ہو جائے گا۔ اکثر نفسیاتی بیماریاں ایسے ہی بے جا خوف سے وجود میں آتی ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

خوف بھی ایک مصیبت ہے۔[۱]

لہذا ایک اچھا مربی اس امر سے لاتعلق نہیں رہ سکتا بلکہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے بچے کے بے جا خوف کو دور کرے اس موقع پر مربی حضرات کی خدمت میں ہم چند گزارشات پیش کرتے ہیں۔

۱۔ خوف کو دور کرنے سے کہیں آسان ہے کہ اسے پہلے سے روکا جائے۔ کوشش کریں کہ خوف کے علل اور عوامل حتی المقدور پیدا ہی نہ ہوں تا کہ آپ کا بچہ ڈرپوک نہ بنے۔ ماہرین نفسیات کا نظریہ ہے کہ ریل گاڑی کی آواز، بادل اور بجلی کی صدا، خطرے کے آلارم کی آواز اور بچے کے سرہانے شور مچانا بچوں کے لیے خوف کے ابتدائی عوامل

---

[۱] غرر الحکم ص ۸

میں سے ہیں۔ جہاں تک ہو سکے کوشش کریں کہ بچے اس طرح کی چیزوں سے بچیں اگرچہ نومولود کیوں نہ ہوں ان کے سرہانے شور نہ مچائیں ان کی طرف غصے سے نہ دیکھیں۔

۲۔ ڈر متعدی بیماریوں میں ہے۔ بچہ ذاتی طور پر ڈرپوک نہیں ہوتا ماں باپ اور اردگرد والے لوگ اگر ڈرپوک ہوں تو بچہ ڈرپوک بن جاتا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچے ڈرپوک نہ ہوں تو پہلے اپنے ڈر کا علاج کریں اور غیر عقلی عوامل پہ اظہار خوف اور جزع و فزع نہ کریں تاکہ بچے بھی ڈرپوک نہ ہوں۔

۳۔ پولیس اور جرائم سے متعلقہ فلموں کو دیکھنا، ٹیلویژن کے بعض پروگراموں کو دیکھنا، ریڈیو کی ہیجان آور داستانوں کا سننا، ہیجان انگیز قصوں اور داستانوں کا پڑھنا اور سننا، یہاں تک کہ مجلوں اور روزناموں میں چھپنے والے بعض واقعات کا پڑھنا بچے کے لیے مضر رساں ہے۔ بچے کے نازک اور ظریف اعصاب پہ ان کا اثر ہوتا ہے اور ان سے بچے کے دل میں ایک خوف، پریشانی اور گرہ سی پیدا ہو جاتی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے بچے کو ان چیزوں سے دور رکھیں۔ جن اور پری کے بارے میں بات تک نہ کریں۔ اگر انہوں نے کسی اور سے سن لیا ہو تو انہیں سمجھائیں کہ جن اگر موجود بھی ہو جیسا کہ قرآن کریم نے ان کے وجود کے بارے میں تصریح بھی کی ہے تو وہ بھی انسانوں کی طرح سے ہیں اور زندگی گزارتے ہیں اور انسان کے لیے ان کا کوئی نقصان نہیں اور ان سے خوف کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

۴۔ بچے کی تربیت کے لیے اسے ڈرانے اور سختی سے پرہیز کریں۔ بچوں کو بھوت، دیو، لولو، وغیرہ سے نہ ڈرائیں۔ ایسے خوف ہو سکتا ہے کہ وقتی طور پہ بچے پر اثر ڈالیں لیکن یقیناً ان سے بچے میں برے اثرات باقی رہ جائیں گے کہ جن کا نقصان فائدے سے زیادہ ہے۔ اس طرح سے آپ بچے کو ڈرپوک اور کمزور بنا دیں گے بچوں کو تنبیہ کے لیے تاریک اور دہشت آور جگہوں پر بند نہ کریں۔ بچوں کو کتے بلی سے نہ ڈرائیں۔ بعض بیوقوف ماؤں کی غلط عادت ہے کہ بچے کو چپ کروانے کے لیے

دروازے اور دیوار کے پیچھے سے میاؤں میاؤں کرتی ہیں اور دروازے اور دیوار پر ہاتھ مارتی ہیں اور اس طرح سے اُسے ڈراتی ہیں تاکہ وہ چپ کر جائے۔ ان نادان ماؤں کو خبر نہیں کہ وہ اس غلط عادت سے کتنے بڑے جرم کی مرتکب ہوتی ہیں اور بچے کی حساس روح کو پریشان کر دیتی ہیں اور اس کی آئندہ نفسیاتی زندگی کو تباہ کر دیتی ہیں۔

..... اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے :

ہماری دادی اماں ہمیں شرارتوں سے روکنے کے لیے دوسرے کمرے میں چلی جاتیں اور ایک خاص آواز نکال کر کہتی، میں دیو ہوں، میں آگیا ہوں کہ تمہیں کھا جاؤں۔ ہم ڈر جاتے اور چپ کر جاتے اور سمجھتے کہ یہ حقیقت ہے۔ اسی وجہ سے میں ایک ڈرپوک شخص ہوں اور اکیلا گھر سے باہر نہیں رہ سکتا۔ اب جب کہ بڑا ہوگیا ہوں وہی خوف ایک اضطراب اور دل گرفتگی کی صورت اختیار کر چکا ہے۔

..... اپنے ایک خط میں لکھتی ہے۔

میں پانچ سال کی تھی اپنی خالہ زاد کے ساتھ کھیل رہی تھی اچانک ہم نے ایک وحشت ناک ہیولا دیکھا! بڑا سا سر، وحشت آنکھیں، بڑے بڑے دانت، کھلا سیاہ لباس اور بڑے بڑے کالے جوتے۔ وہ صحن کے درمیان میں تھا۔ عجیب آواز نکالتے ہوئے وہ چاہتا تھا کہ ہمیں کھا جائے۔ ہم نے چیخ ماری اور تاریک دالان کی طرف بھاگ گئیں۔ میں خوف سے یوں دیوار سے جا چمٹی کہ میری انگلیاں زخمی ہوگئیں۔ خوف کے مارے میں بے ہوش ہوگئی اور پھر مجھے کچھ پتہ نہ چلا۔ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور مجھے مرنے سے بچایا۔ اس غیر انسانی فعل نے مجھ پر ایسا اثر کیا کہ ایک عرصے تک میں کونوں کھدروں میں چھپتی اور ذرا سی آواز بھی مجھے خوف و وحشت میں مبتلا کر دیتی اور میری چیخ نکل جاتی۔ اب جب کہ میں بڑی ہوگئی ہوں تو میں ضعف اعصاب اور سوزش قلب میں مبتلا ہوگئی ہوں۔ ہمیشہ غم زدہ رہتی ہوں اور عجیب و غریب خیالات آتے ہیں۔ کام اور زندگی میں میرا دل نہیں لگتا نہ کسی سے میل ملاقات ہے اور نہ کہیں آتی جاتی ہوں۔

بے چین اور مضطرب سی رہتی ہوں ۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ ہماری پھوپھی زاد نے
اپنے سر پر ایک بڑا سا دیگچہ رکھ کے وہ ڈراؤنی بھوت کی شکل بنائی تھی تا کہ ہمیں
ڈرائے اور وہ ہے میری بیماری اور اعصاب کی کمزوری کی ذمہ دار۔

۵۔ اگر آپ کا بچہ آپ کی سہل انگاری اور عدمِ توجہ یا دوسرے اسباب کے باعث ڈرپوک بن گیا ہو تو اس کے ڈر کو غیر اہم چیز نہ سمجھیں۔ کوشش کریں کہ جتنی جلدی ہو سکے اس کی روح کو آرام پہنچائیں اور اس کا خوف دُور کریں۔ اگر بچے کو اپنے بعض کاموں کے حقیقی اسباب کا علم ہو گیا تو اس کا کچھ خوف خود بخود جاتا رہے گا لیکن خوف کا علاج بچے کو جھاڑ پھٹکار پلانا اس کا مذاق اڑانا اور دوسروں کے سامنے شرمندہ کرنا نہیں ہے۔ ایسا کام نہ فقط یہ کہ بچے کا خوف دور نہیں کرے گا بلکہ اس کی حساس روح کو آزردہ تر کر دے گا۔ خوف میں اس کا کوئی گناہ نہیں ہے۔ وہ ڈرنا نہیں چاہتا۔ آپ خود اور دوسرے عوامل اس کے خوف کا سبب بنے ہیں۔ اسے کیوں قصوروار ٹھہراتے ہیں۔ صبر، بردباری سمجھداری اور تحقیق و جستجو کے ساتھ اس کے خوف کے علل و اسباب معلوم کریں پھر ان کے لیے چارۂ کار سوچیں۔ اگر وہ جن اور بھوت سے ڈرتا ہے تو اسے پیار محبت سے سمجھائیں کہ بھوت، لولو اور دیو وغیرہ کا وجود جھوٹ ہے اور ایسی چیزوں کا اصلاً وجود ہی نہیں ہے ۔ اُسے مطمئن کریں کہ جن کا انسان سے کوئی کام نہیں۔ کوشش کریں کہ ان چیزوں کا اس کے سامنے اصلاً ذکر ہی نہ کیا جائے تا کہ رفتہ رفتہ ان کا خیال بچے کے ذہن سے محو ہو جائے۔ اگر وہ بے ضرر حیوانات سے ڈرے تو ان کا بے ضرر ہونا اس کے سامنے عملی طور پر ثابت کریں۔ اُن حیوانات کے قریب جائیں اور انہیں چھوئیں اور ہاتھ میں پکڑیں تا کہ بچہ تدریجاً ان سے مانوس ہو جائے اور اس کا خوف دور ہو جائے ۔ اگر وہ اندھیرے سے ڈرتا ہے تو اُسے کم روشنی کا عادی کریں تا کہ رفتہ رفتہ اس کا خوف جاتا رہے اور وہ تاریکی کا بھی عادی ہو جائے۔ جب آپ خود بچے کے پاس موجود ہوں تو کچھ دیر کے لیے چراغ گل کر دیں۔ پھر تدریجاً اس مدت کو بڑھائیں۔ جب آپ کسی کمرے میں بچے سے کچھ فاصلے پر ہوں تو یہی عمل دھرائیں۔ صبر اور حوصلے سے اس عمل کا تکرار کریں یہاں تک کہ بچے کا خوف دُور ہو جائے اور وہ تاریکی میں رہنے کا عادی ہو جائے۔

اس امر کی طرف بہر حال متوجہ رہیں کہ ڈرانے دھمکانے، مار پیٹ اور سختی سے کام نہ لیں کیونکہ اس طرز عمل سے آپ بچے کا خوف دور نہیں کر سکتے۔ بلکہ ممکن ہے یہ بُرے اعمال کا پیش خیمہ بنے۔ بچے کو اس امر پر مجبور کرنا کہ وہ جن چیزوں سے ڈرتا ہے ان کے سامنے جائے، اس کے اضطراب اور پریشانی میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ اس طریقے سے اس کے اعصاب پر بہت دباؤ پڑتا ہے۔ اگر بچہ ڈاکٹر اور ٹیکے سے ڈرتا ہے تو اسے پیار اور محبت کی زبان میں سمجھائیں کہ وہ بیمار ہے اور اگر وہ تندرست ہونا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ دوا کھائے اور ٹیکہ لگوائے۔ اُسے دکھائیں کہ دوسرے لوگ بھی ٹیکہ لگواتے ہیں اور روتے دھوتے نہیں تاکہ وہ آہستہ آہستہ ڈاکٹر اور ٹیکے سے مانوس ہو جائے اور اس کا خوف زائل ہو جائے۔ اگر کوئی مجبوری نہ ہو تو اسے زبردستی ٹیکہ نہ لگایا جائے کیونکہ ممکن ہے اس کے بُرے اثرات مرتب ہوں۔ کبھی ضرورت کا تقاضا ہوتا ہے کہ بچہ ہسپتال میں داخل ہو جائے لیکن اکثر بچے ہسپتال میں داخل ہونے اور ماں باپ کی جُدائی سے ڈرتے ہیں۔ اس بناء پر کبھی وہ ماں باپ کے لیے بڑی مشکل پیدا کر دیتا ہے۔ اگر اسے سختی سے ہسپتال میں داخلے پر مجبور کیا جائے تو مسلماً اس سے روحانی اور نفسیاتی طور پر اس پر بُرے اثرات مرتب ہوں گے۔ اگر ماں باپ یہ سمجھیں کہ ہسپتال میں داخل نہ کروانا اس کی صحت و سلامتی کے لیے نقصان دہ ہے، یہاں تک کہ اس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے تو والدین کے لیے ضروری ہے کہ بچے کو پہلے ہی سے ہسپتال کے ماحول سے مانوس کریں۔ جب کبھی وہ کسی مریض کی عیادت کے لیے جائیں تو اپنے بچے کو بھی ساتھ لے جائیں اور وہاں کچھ دیر ٹھہریں اور اسے یہ بات اچھی طرح سمجھائیں کہ ہسپتال ایک اچھی اور آرام دہ جگہ ہے جہاں پر ڈاکٹر اور مہربان نرسیں موجود ہیں اور یہ لوگ مریض کا علاج کرتے ہیں اُسے بتائیں کہ خطرناک بیماریوں کا علاج ہسپتال ہی میں ممکن ہے۔ بچے کو تدریجاً ہسپتال کے ماحول سے مانوس کیا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر بچے کو ہسپتال میں داخل کرنا پڑ جائے تو وہ اس کے لیے آمادہ ہوگا۔ بہتر ہے کہ پہلے اس بات کی یاد دہانی کروا دی جائے کہ تم بیمار ہو، تندرست ہو جاؤ گے لیکن اس کے لیے تمہیں کچھ عرصہ ہسپتال میں رہنا ہوگا۔ وہاں پر نرسیں اور مہربان ڈاکٹر موجود ہیں جو تمہاری تندرستی کے لیے کوشش کریں گے۔ ہم بھی تمہیں ملنے

آتے رہیں گے۔ لیکن آپ اس امر کی طرف متوجہ رہیں کہ بچے سے جھوٹ نہ بولیں۔ جب آپ کو جانا ہے تو اس سے یہ نہ کہیں کہ یہاں سو جاؤ، ہم تمہارے پاس ہی ہیں۔ اس سے یہ نہ کہیں کہ ڈرو مت تمہیں دوا نہیں دی جائے گی اور ٹیکہ نہیں لگایا جائے گا۔ اس سے یہ نہ کہیں کہ ہسپتال میں تمہارا وقت خوب گزرے گا کیونکہ یہ تمام باتیں خلافِ حقیقت ہیں۔ ان سے بچے کا اعتماد جاتا رہتا ہے بلکہ اس سے یہ کہیں کہ تم بیمار ہو اور تمہارے علاج کے لیے ہسپتال میں داخلے کے سوا چارہ نہیں ہے۔ ہسپتال میں داخلے کے بعد جہاں تک ممکن ہو سکے اس کی عیادت کے لیے جائیں۔ اس کے پاس ٹھہریں اور اس کے لیے خوشی اور آرام و راحت کا باعث بنیں۔

معقول خوف

معقول خوف کے معاملے میں مربی کو چاہیے کہ ایک معتدل اور عاقلانہ روش اختیار کرے۔ بچے کے سامنے خطرناک موضوعات چھیڑے اور اسے ان سے بچنے کی تدابیر بتلائے۔ نیز اسے بے احتیاطی کے بُرے نتائج سے ڈرائے۔ اسے گیس، ماچس اور برقی اشیاء کے استعمال کا درست طریقہ سمجھائے۔ اسے ممکنہ خطرات کے بارے میں آگاہ کرے۔ اسے سڑک پار کرنے کا صحیح طریقہ بتائے۔ گاڑیوں کی آمد و رفت کے ممکنہ خطرات اس سے بیان کرے اور بچے کو اس بات پر ابھارے کہ وہ اجتماعی قوانین، خصوصاً ٹریفک قوانین کی پابندی کرے اور اسے قانون کی خلاف ورزی کے ممکنہ بُرے نتائج سے ڈرائے۔ مجموعی طور پر احتمالی خطرات کی اس کے سامنے وضاحت کرے اور ان سے اسے ڈرائے اور ان سے بچنے کا طریقہ اسے سمجھائے لیکن اس امر میں مبالغے سے کام نہ لے، مبالغہ آرائی سے ایسا کام نہ کرے کہ بچہ وحشت و اضطراب میں گھر جائے، ڈرپوک اور وسواسی بن جائے اور یوں سمجھنے لگے کہ اس کے بچنے کا کوئی راستہ نہیں۔ کوشش یہ کرنا چاہیے کہ اس میں توکل علی اللہ اور امید بر خدا کا جذبہ بیدار ہو۔

خوف کا ایک صحیح مقام موت کا ڈر ہے البتہ موت سے خوف اگر حد سے تجاوز کر جائے تو یہ بھی ایک نفسیاتی بیماری بن جاتا ہے۔ یہ بیماری انسان سے روحانی آرام و سکون چھین لیتی ہے اور اس کی عملی صلاحیتوں کو ناکارہ کر دیتی ہے لہٰذا اس کے لیے بھی حفاظتی تدابیر ضروری ہیں۔

کچھ عرصے تک بچہ اصلاً موت کا مفہوم ہی نہیں سمجھتا۔ بہتر یہ ہے کہ مربی حضرات اس بارے میں بات نہ کریں لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بچہ اپنے کسی واقف کار یا رشتے دار کے مرنے سے موت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ممکن ہے ایسے موقع پر وہ ماں باپ سے موت کے بارے میں سوالات پوچھے۔ اگر اس وقت بچہ رشد و تمیز کے سن کو پہنچ چکا ہو تو ماں باپ اسے اس قضیے کی حقیقت بتا دیں۔ اس سے کہیں کہ موت کوئی خاص چیز نہیں ہے۔ انسان مرنے کی وجہ سے اس جہان سے دوسرے جہان میں منتقل ہو جاتا ہے، اسے جہانِ آخرت کہتے ہیں۔ اس جہان میں انسان کو اچھے کاموں کا ثواب ملے گا اور برے کاموں پر اسے عذاب ملے گا، سب نے مرجانا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

"تمام لوگ مر جائیں گے"

موت اہم چیز نہیں ہے بلکہ اہم یہ ہے کہ انسان برے کام نہ کرے اور اچھے کام کرے تاکہ مرنے کے بعد وہ آرام سے رہے۔

موت کی یاد حد سے تجاوز نہیں کرنی چاہیے اور اسے وسواس کے مقام تک نہیں پہنچنا چاہیے۔ ایسا ہونا نقصان دہ ہے جب کہ اسی یاد سے بچے کی تعلیم و تربیت کے لیے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

خوف کا ایک مثبت مقام خوفِ خدا یا خوفِ قیامت ہے۔ یہ خوف بھی اگر ایک نفسیاتی بیماری کی صورت میں نہ ہو تو نہ فقط یہ کہ برا نہیں ہے بلکہ انسان کی دنیاوی اور اخروی سعادت کے لیے بہت مفید ہے۔ خوفِ الٰہی اور عذابِ آخرت کا خوف انسان کو نیک کاموں پر ابھارتا ہے اور برے کاموں سے روکتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں لوگوں سے فرماتا ہے:

فلا تخافوهم وخافونِ ان کنتم مومنین

اگر تم اہل ایمان ہو تو دوسروں سے نہ ڈرو صرف مجھ سے ڈرو۔ (آل عمران ۱۷۵)

نیز قرآن قیامت کی مشکلات اور عذاب کو لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے۔ لہذا ایک عقل مند، سمجھ دار اور متدین مربی کوشش کرتا ہے کہ خوفِ الٰہی، گناہ سے خوف اور خوفِ قیامت کا بیج بچے کی حساس روح میں اس کے بچپن ہی میں بو دے تاکہ رفتہ رفتہ وہ نشوونما پالے

اور بڑا ہو کر اس کا نیک ثمرہ ظاہر ہو۔

البتہ اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ ایک بہترین مربی کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ ہمیشہ دوزخ اور عذاب کا ذکر کرتا رہے اور اللہ کو سخت، جابر شخص کی حیثیت سے متعارف کروائے بلکہ اس کی رحمت، مہربانی، شفقت اور لطف کی صفت کا زیادہ تذکرہ کرے۔ اس کے ذریعے سے اللہ کو محبوب کے طور پر منوائے اور لوگوں کو گناہ کے عذاب اور اللہ کی عظمت سے اس طریقے سے ڈرائے کہ وہ ہمیشہ خوف و رجا کی حالت میں رہیں۔

کھیل کود

جیسے سانس لینا بچے کے لیے ضروری ہے ایسے ہی کھیل کود اس کے لیے ایک فطری امر ہے۔ پرائمری و مڈل میں بچے کی سب سے بڑی سرگرمی اور مشغولیت کھیل ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ کم ہو جاتی ہے اور پھر ضروری کام اُس کی جگہ لے لیتے ہیں۔ کھیل کے لیے بچے کے پاس دلیل نہیں ہے۔ البتہ وہ ایسا نہیں کر سکتا کہ کھیلے نہ۔ بچہ ایک موجود زندہ ہے اور ہر موجود زندہ کو چاہیے وہ فعّال رہے۔ کھیل بھی بچے کے لیے ایک قسم کی فعالیت اور کام ہے۔ بچے کا نہ کھیلنا اس کی بیماری اور ناتوانی کی علامت ہے۔ اسلام نے بھی بچے کی فطری ضرورت کی طرف توجہ دیتے ہوئے حکم دیا ہے کہ اُسے آزاد چھوڑا جائے تاکہ وہ کھیلے۔

حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا:

بچے کو سات سال تک آزاد چھوڑ دیں تاکہ وہ کھیلے [۱]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مرتبہ بچوں کے پاس سے گزرے کہ جو مٹی سے کھیل رہے تھے۔ آپؐ کے بعض اصحاب نے انہیں کھیلنے سے منع کیا۔

رسول اللہ نے فرمایا:

انہیں کھیلنے دو مٹی بچوں کی چراگاہ ہے [۲]

---

[۱] وسائل ج ۱۵ ص ۱۹۳

[۲] مجمع الزوائد ج ۸ ص ۱۵۹

کھیل بچے کے لیے ایک فطری ورزش ہے۔ اس سے اس کے پٹھے مضبوط ہوتے ہیں۔ اس کی فہم اور عقلی قوتوں کو کام میں لاتی ہے اور اسے مزید طاقت عطا کرتی ہے۔ بچے کے اجتماعی جذبات اور احساسات کو بیدار کرتی ہے۔ اسے معاشرتی زندگی گزارنے اور ذمہ داریوں کو قبول کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔

ماہرین نفسیات کھیل کے اصلی محرک کے بارے میں اختلاف نظر رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے جو تحقیقات کی ہیں وہ ہمارے کام کی ہرگز نہیں ہیں ہمارے لیے جو اہم ہے وہ یہ ہے کہ اس فطری امر سے بچے کی تعلیم و تربیت کے لیے استفادہ کریں اور اس کی آئندہ کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے اسے کام میں لائیں۔ ایک ذمہ دار مربی کو نہیں چاہیے کہ وہ کھیل کو بس ایک مشغولیت شمار کرے اور اس حساس اور پر اہمیت عرصے کو بے وقعت سمجھے۔ بچہ کھیل کے دوران خارجی دنیا سے آشنا ہوتا ہے۔ حقائق سمجھنے لگتا ہے۔ کام کرنے کا انداز سیکھتا ہے۔ خطرات سے بچنا اور ایک دوسرے کے ساتھ ہم دست ہونے، مشق کرنے اور مہارت حاصل کرنے کا انداز سیکھتا ہے۔ اجتماعی کھیل میں وہ دوسروں کے حقوق کا خیال رکھنا اور اجتماعی قوانین کی پابندی کرنا سیکھتا ہے۔

ولیم اسٹرن لکھتے ہیں:

کھیل صلاحیتوں کے رشد و نمو کا ایک فطری ذریعہ ہے یا آئندہ کے اعمال کے لیے ایک ابتدائی مشق کے مانند ہے [1]

الیکسی میکسیم وتیچ گورکی لکھتے ہیں:

کھیل بچوں کے لیے جہان ادراک کی طرف راستہ ہے۔ وہ راستہ کہ جس پہ وہ زندگی گزارتے ہیں، وہ راستہ کہ جس پہ بدل کے انہیں جانا ہے۔ کھیلنے والا بچہ اچھلنے کودنے کی ضرورت پوری کرتا ہے چیزوں کے خواص سے آشنا ہوتا ہے۔ کھیل بچے کو آداب معاشرت سیکھنے میں مدد دیتا ہے۔ بچے نے

---

[1] روانشناسی کودک تالیف دکتر جلالی ص ۲۳۱

جو کچھ دیکھا ہوتا ہے اور جو کچھ وہ جانتا ہے اُسے کھیل میں ظاہر کرتا ہے۔ کھیل اس کے احساس کو مزید گہرا کر دیتا ہے اور اس کے تصورات کو واضح تر بنا دیتا ہے۔ بچے گھر بناتے ہیں۔ کارخانہ تعمیر کرتے ہیں۔ قطب شمالی کی طرف جاتے ہیں۔ فضا میں پرواز کرتے ہیں، سرحدوں کی حفاظت کرتے ہیں اور گاڑی چلاتے ہیں۔

آنٹن سیمونووچ ماکارنکو جو روس کے معروف ماہر امور پرورش میں کہتے ہیں:

کھیل میں بچہ جیسا ہوتا ہے، بڑا ہو کر کام میں بھی ویسا ہی ہوگا۔ کیونکہ ہر کھیل میں ہر چیز سے پہلے فکر و عمل کی کوشش کارفرما ہوتی ہے۔ اچھا کھیل اچھے کام کے مانند ہے۔ جو کھیل آشکار ہوتا ہے اس میں بچے کے احساسات اور آرزوئیں ظاہر ہوتی ہیں۔ کھیلنے والے بچے کو غور سے دیکھیں۔ اُسے دیکھیں کہ جو پروگرام اس نے اپنے لیے بنایا ہے اُس پر کیسے حقیقت پسندی سے عمل کرتا ہے۔ کھیل میں بچے کے احساسات حقیقی اور اصلی ہوتے ہیں۔ بڑوں کو ان سے کبھی بھی بے اعتنا نہیں رہنا چاہیے[1]

ولیم میکڈوگل رقم طراز ہیں:

قبل اس کے کہ فطرت میدانِ عمل میں داخل ہو، کھیل کسی شخص کے فطری میلان کا مظہر ہوتا ہے[2]

لہٰذا بچہ اگرچہ کھیل میں ظاہراً کوئی اہم مرسوم کام انجام نہیں دے رہا ہوتا لیکن اس کے باوجود کھیل کام سے کوئی نمایاں فرق بھی نہیں رکھتا۔ اسی کھیل کے دوران میں بچے کے فطری اور ذاتی میلانات ظاہر ہوتے ہیں اسی میں اس کا اجتماعی وانفرادی کردار صحت پذیر ہوتا ہے اور اس کے مستقبل کو روشن کرتا ہے۔

---

[1] روان شناسی تجربی کودک ص ۱۳۰

[2] روان شناسی کودک از ڈاکٹر جلالی ص ۳۴۲

بچے کے سرپرستوں کو چند قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

بعض ایسے ہیں جو کھیل کو بچے کا عیب اور بے ادبی کی علامت سمجھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ حتی المقدور بچے کو کھیل سے باز رکھیں تاکہ وہ آرام سے ایک گوشے میں بیٹھا رہے۔

کچھ ایسے بھی ہیں جو بچوں کے کھیل کے مخالف نہیں ہیں اور وہ بچے کو کھیلنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتے ہیں اور اس کے کھیل میں کوئی دخل بھی نہیں رکھتے۔ کہتے ہیں کہ بچہ خود ہی اچھی طرح جانتا ہے کہ کیسے اور کس چیز سے کھیلا جائے۔

تیسری قسم ایسے سرپرستوں کی ہے جو بچوں کے کھیل کے لیے مشغولیت کے علاوہ کوئی ہدف نہیں سمجھتے۔ وہ کھیل کے مقصد کی طرف توجہ کیے بغیر بچوں کے لیے کھیل کا سامان خریدتے ہیں کھیل کا اچھا بُرا سامان خرید کر بچوں کے ہاتھوں میں تھما دیتے ہیں اور اپنے گھر کو کھیل کے سامان کی دوکان بنا دیتے ہیں لیکن بچوں کے کھیل میں کوئی دخل اندازی نہیں کرتے۔ بچہ اپنی مرضی سے کھیلتا ہے، بگاڑتا ہے اور پھینک دیتا ہے۔ ہنستا ہے اور خوش ہوتا ہے اور اپنے خوبصورت کھلونوں کی بناء پر دوسروں پر فخر کرتا ہے۔

چوتھی قسم ایسے سرپرستوں کی ہے جو نہ صرف بچے کو کھیل کی اجازت دیتے ہیں بلکہ ان کے کھیل پر پوری نظر بھی رکھتے ہیں۔ اور اگر کوئی مشکل پیش آجائے تو وضاحت کرتے ہیں اور اس مشکل کو حل کرتے ہیں۔ بچے کو موقع نہیں دیتے کہ مشکلات میں اپنی فکر و عقل کو استعمال کرے اور اپنی صلاحیت سے مشکلات کو حل کرے۔ اس طرح سے بچے میں خود صلاحیت پیدا نہیں ہوتی اور اس کی قوت ارادی پروان نہیں چڑھتی بلکہ وہ تمام تر ماں باپ پر انحصار کرتا ہے کہ وہ فوراً اس کی مدد کو لپکیں۔

ان چاروں میں سے کوئی طریقہ بھی پسندیدہ اور سودمند نہیں ہے کہ جسے بچے کی تعلیم و تربیت کے لیے مفید اور بے نقص قرار دیا جائے۔ ہر ایک میں ایک یا زیادہ نقص موجود ہیں۔

بہترین روش کہ جو ایک ذمہ دار اور آگاہ مربی اختیار کر سکتا ہے یہ ہے کہ

اولاً: بچے کو کاملاً آزاد چھوڑ دے تاکہ وہ اپنے میلان کے مطابق کھیلے۔

ثانیاً اس کے کھیلنے کے لیے ضروری چیزیں فراہم کرے۔

ثانیاً: کھیل کے لیے ایسی چیزوں کا انتخاب کرے کہ جن سے بچے کی فکری اور دماغی صلاحیتوں کو تقویت پہنچے۔ اور دوسری طرف اس میں کوئی فنی پہلو بھی موجود ہونا چاہیے جو بچے کو مفید کاموں کے لیے تشویق کرے اور اسے اجتماعی اور معاشرتی امور اور کاموں کی انجام دہی پر آمادہ کرے کھیلوں کی زیادہ تر چیزیں وقت اور پیسے کے ضیاع کے علاوہ کچھ ثمر نہیں رکھتیں۔

مثلاً اگر آپ اس کے لیے بجلی سے چلنے والی کار یا ریل گاڑی خریدیں یا کوئی اور چیز خریدیں تو آپ کا بچہ صرف ایک تماشہ گر بن جائے گا۔ سارا دن اسی میں گم رہے گا۔ اسے دیکھے گا۔ ہنسے گا۔ نہ اس میں کوئی اس کی فکر استعمال ہوگی۔ نہ کوئی ایسی چیز یاد کر سکے گا جو آئندہ زندگی میں اس کے کام آسکے۔

کھیلنے کے لیے بہترین چیزیں کھیل کا وہ سامان ہے جو فنی پہلو رکھتا ہو اور نامکمل ہو جسے بچے مکمل کریں مثلاً کسی عمارت کے مختلف حصے اور ٹکڑے ہوں۔ نامکمل تصویریں، سلائی اور کڑھائی کا سامان، بجلی کی لائن بچھانے اور دیگر میکانیاتی کام۔ اسی طرح بڑھئی اور دیگر فنون سے متعلقہ چیزیں۔ زراعت اور درخت لگانے میں درکار اشیاء ٹریکٹر، اور کھیتی باڑی کی مشینیں۔ دھاگا بننے اور کپڑے بننے کی مشینیں ڈرائنگ اور مصوری و نقاشی کی اشیاء۔ الگ الگ الف، ب، اسی طرح سکھلانے اور بنانے کی چیزیں اور مجموعی طور پر کھیل کا وہ سستا سامان کہ جو بچے کے کام آسکے اور وہ اسے بناتا رہے۔ بگاڑے پھر بنائے اور اس طرح سے اپنے تجربے اور پہچان کو بڑھاتا رہے۔ کھیل کا ایسا سامان بچے کی دماغی صلاحیت کو تقویت پہنچاتا ہے اور اسے مفید اجتماعی کاموں کی طرف راغب کرتا ہے اور اُسے تعمیری اور پیداواری سرگرمیوں کے لیے ابھارتا ہے۔ نہ کہ اسے ایک تماشائی اور صارف اور خرچ کرنے والا بنا دیتا ہے۔

اس کے بعد بچہ کو راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے تو ایک اچھا مربی بچوں کے کھیل کو نظر انداز نہیں کر سکتا اور اس پر نظر رکھتا ہے۔ کھیل کی نگرانی بذات خود ایک طرح کی تعلیم و تربیت ہے۔

ایک آگاہ اور ذمہ دار مربی کھیل کا مفید سامان بچے کے سپرد کرنے کے بعد اُسے آزاد چھوڑ دیتا ہے تاکہ وہ کھیلے اور اُس میں اپنی فکر کو استعمال کرے لیکن بالواسطہ وہ کھیل کی نگرانی

کرتا ہے اور جہاں ضروری ہو اس کی مدد کرتا ہے۔

مثلاً اگر اس کے لیے کوئی گاڑی یا ریل گاڑی خریدتا ہے تو اس سے پوچھے کہ کار اور ریل گاڑی کس کام آتی ہے۔ بچہ سوچنے کے بعد جواب دیتا ہے مسافروں اور سامان کو لے جانے کے لیے۔ پھر وہ مزید اس میں دخالت نہیں کرتا۔ بچہ خود سوچنے لگتا ہے کہ اس پہ سامان اور مسافر سوار کرے اور اگر اس کام میں کوئی کمی ہو اور کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو وہ خود اُسے مہیا کرے گا۔ اگر گاڑی میں یا کسی اور کھلونے میں کوئی فنی خرابی پیدا ہو جائے تو نہ آپ خود اس خرابی کو دور کریں اور نہ اس کے لیے کوئی اور کھلونا خریدیں۔ بلکہ خود بچے کو تشویق کریں کہ وہ اس کی خرابی کو دور کرے اور مجموعی طور پہ اس کے مسائل حل کرنے میں بلاواسطہ دخالت نہ کریں۔ بلکہ اس سلسلے میں خود بچے سے کام لیں اور اس کی راہنمائی کریں تاکہ اس میں اپنے آپ پہ اعتماد پیدا ہو اور اس کا ذوق اور ہنر ظاہر ہونے لگے۔ اگر آپ اپنی بیٹی کے لیے گڑیا خریدیں تو اسے بالکل کامل صورت میں نہ خریدیں بلکہ اس کی تکمیل کرنے کے لیے خود بیٹی سے کہیں۔ اگر آپ بیٹی سے پوچھیں کہ اس گڑیا کے لیے کیا چیز ضروری ہے تو وہ سوچنے کے بعد جواب دے گی کہ اسے لباس کی ضرورت ہے۔ پھر آپ اُسے کپڑا دے سکتے ہیں تاکہ وہ اس کے لیے لباس تیار کرے۔ آپ کی راہنمائی میں وہ اپنی گڑیا کے لیے لباس تیار کرے گی۔ اُسے پہنائے گی۔ اس کے کپڑے دھوئے گی گڑیا کے لیے کھانا تیار کرے گی۔ اس کا منہ دھوئے گی۔ اسے نہلائے گی۔ اُسے سلا دے گی۔ پھر اسے جگائے گی پھر اسے مہمان کے طور پہ لے جائے گی۔ پھر اس کو بات کرنا اور ادب آداب سکھائے گی . . . . . اس طرح سے بیٹی گڑیا سے کھیلے گی۔ لیکن ایک سودمند مفید اور تعمیری کھیل۔

اس وقت آپ یہ دیکھیں گے آپ کی بیٹی نے جو کچھ دیکھا یا سُنا ہے وہ اپنی گڑیا پر آزمائے گی بچہ ایک مقلد ہے۔ بہت سے کام اپنے ماں باپ، بھائی بہنوں اور دوسرے لوگوں کی تقلید میں انجام دیتا ہے۔ کھلونے اس وقت مفید ہیں جب بچہ اُن سے کھیلے اور کام اور ہنر سیکھے۔ نہ یہ کہ انہیں حفاظت سے رکھے اور ان کی حرکات کو کافی سمجھے اور دوسرے بچوں پر فخر کرے۔ کھلونوں کے لیے ایک مخصوص جگہ ہونا چاہیے جہاں بچہ کھیل کے بعد انہیں رکھ سکے۔

اس جگہ کی صفائی اور تنظیم و ترتیب بچے کے ذمے ہونی چاہیے۔

کھلونے بہت زیادہ نہیں ہونے چاہئیں کہ بچہ اُن میں الجھا رہے اور یہ نہ سمجھ سکے کہ اسے کس کے ساتھ کھیلنا ہے بلکہ ضروری مقدار پر اکتفا کرنا چاہیے۔ ضروری نہیں کہ کھلونے بہت خوبصورت اور مہنگے ہوں۔ خود بچہ کاغذ، گتے، ڈبے، ٹکڑوں وغیرہ کے ذریعے کھلونے بنا سکتا ہے یا جو کھلونے اس نے خریدے ہیں انہیں مکمل کر سکتا ہے۔

مجموعی طور پر کھیل کو چند قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ انفرادی کھیل کہ جس میں بچہ خود اکیلا ہی کھیل سکتا ہے۔

۲۔ اجتماعی کھیل کہ جو دوسروں سے مل کر کھیلا جاتا ہے۔

۳۔ فکری کھیل کہ جو فہم و ادراک کو تقویت پہنچاتا ہے۔

۴۔ ورزشی کھیل کہ جو جسم اور پٹھوں کو مضبوط کرتا ہے۔

۵۔ حملے اور دفاع کا کھیل کہ جس میں کھلاڑی حملہ اور دفاع کے بارے میں سیکھتا ہے۔

۶۔ ایک دوسرے سے تعاون کر کے کھیلا جانے والا کھیل کہ جس میں دوسروں سے تعاون کی روح کو تقویت پہنچائی جا سکتی ہے۔

ابتدا میں بچہ انفرادی کھیل کھیلتا ہے۔ اس مرحلے میں بچے کو آزاد چھوڑ دینا چاہیے تاکہ وہ کھلونے سے کھیلتا رہے۔ لیکن مربّی کی ذمہ داری ہے کہ اُس کے کھیل پر نظر رکھے اس کے لیے کھلونوں کا انتخاب کرے اس کی دماغی قوت کو کام میں لائے اور اس کی سوجھ بوجھ میں اضافہ کرے۔ دوسری طرف، مربی یہ بھی دیکھے کہ بچے کا کھیل فنّی اور پیداواری پہلو بھی رکھتا ہو تاکہ اسے مفید اجتماعی کاموں کا عادی بنایا جا سکے۔ کبھی بچہ یہ چاہ رہا ہوتا ہے کہ اپنا کوئی کھلونا توڑ بگاڑ دے اور پھر اسے دوبارہ ٹھیک کرے۔ اسے اس کام میں آزادی دینا چاہیے کیوں کہ وہ تجربہ کرنا چاہتا ہے اور اس کے فنّی پہلو کو سیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر اُسے کوئی مشکل درپیش آجائے تو مربّی کو چاہیے کہ اس کی راہنمائی کرے۔

کچھ عرصے بعد بچہ کسی حد تک اجتماعی مزاج کا حامل ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر اُسے اجتماعی اور گروہی کھیل پسند ہوتے ہیں۔ جب مربّی دیکھے کہ بچہ معاشرے کی طرف متوجہ

ہے اور اجتماعی کھیل کھیلنے کا آرزومند ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اس کی حوصلہ افزائی کرے تاکہ بچے کا یہ اجتماعی جذبہ دن بدن ترقی کرتا جائے۔ اس مرحلے پر بھی مربی کے لیے ضروری ہے کہ وہ بچے کے کھیل پر نظر رکھے اور اسے مفید اجتماعی کھیلوں کی طرف راہنمائی کرے۔ زیادہ مروّج کھیلیں فٹ بال، والی بال اور باسکٹ بال ہیں۔[1] اکثر بچے اسکول میں اور اسکول سے باہر اپنے فارغ اوقات انہی کھیلوں میں گزارتے ہیں۔ یہ کھیلیں اگرچہ پٹھوں کی ورزش اور مضبوطی کے لیے سودمند ہیں لیکن یہ امر باعث افسوس ہے کہ ان کھیلوں میں ایک بہت بڑا نقص بھی ہے وہ یہ کہ حملہ آور ہونے کی کھیلیں ہیں اور ایسی کھیلیں بچے میں جنگجوئی اور تشدد پسندی کا مزاج پیدا کر دیتی ہیں۔ ان کھیلوں میں حصہ لینے والے بچوں کی پوری توجہ اس جانب مبذول ہوتی ہے کہ اپنے ساتھیوں یعنی دوسرے انسانوں پر کس طرح برتری حاصل کی جائے اور انہیں کیسے مغلوب اور شکست خوردہ کیا جائے اور یہ انسان کے لیے ایک بری صفت ہے۔ ان کھیلوں میں اگرچہ تعاون بھی ہوتا ہے لیکن یہ تعاون بھی دوسرے انسانوں پر غلبہ حاصل کرنے کی نیت سے ہوتا ہے۔ ان کھیلوں سے بھی بدتر کشتی اور باکسنگ ہے۔ جو کہ ابتدائی انسان کے وحشی پن کی ایک کامل یادگار ہے۔ کاش اس طرح کے کھیل بالکل رائج نہ ہوتے اور ان کی جگہ ایسے کھیل مرسوم ہوتے جن میں اجتماعی تعاون کی روح کارفرما ہوتی اور بچوں میں انسان دوستی کے جذبے کو تقویت ملتی اور وہ فائدہ مند پیداواری سرگرمیوں کی طرف متوجہ ہوتے۔ رسل اس ضمن میں تحریر کرتے ہیں:

> آج کی انسانیت پہلے کی نسبت بہت زیادہ فکری پرورش اور باہمی تعاون کی محتاج ہے کہ جس کا سب سے بڑا دشمن مادہ پرستی ہے۔
> انسان رقابت آمیز اعمال اور مزاحمت و حسد کا محتاج نہیں ہے کیونکہ یہ تو وہ چیزیں ہیں کہ جو کبھی انسان پر غالب آجاتی ہیں اور کبھی وہ ان پر غالب آجاتا ہے۔[2]

---

[1] ایران میں یہی کھیل زیادہ رائج ہیں (مترجم)

[2] در تربیت ص ۱۲۱

باعثِ افسوس ہے کہ سرپرست حضرات نہ فقط یہ کہ اس امر کے بارے میں نہیں سوچتے بلکہ دانستہ یا نادانستہ ایسے کھیلوں کی بہت زیادہ ترویج کر رہے ہیں اور بچوں اور نوجوانوں کو حد سے زیادہ ان میں مصروف کر رہے ہیں۔ اے کاش! اسکولوں اور کالجوں کے سمجھدار اور ذمہ دار سرپرست اس بارے میں کوئی چارۂ کار سوچتے اور ہمدرد ماہرین کے ذریعے فائدہ مند اجتماعی کھیلوں کو رواج دیتے جو ایسے مذکورہ کھیلوں کی جگہ لے سکتے۔

اس سلسلۂ بحث کے آخر پر اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ بچے کو اگرچہ کھیل کی ضرورت ہے اور یہ اس کے لیے ضروری ہے لیکن کھیل کے اوقات محدود ہونے چاہئیں۔ ایک سمجھدار اور باشعور مربی بچے کے کھیل کے اوقات اس طرح سے مرتب کرتا ہے کہ بچہ خود بخود اجتماعی اور سودمند پیداواری سرگرمیوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ یوں زندگی کے دوسرے مرحلے میں کھیل کو چھوڑ کر حقیقی اور سودمند کام انجام دینے لگتا ہے۔ ایسا مربی اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ بچے کا مزاج ہی کھیل کود کا بن جائے اور اس کا کمال یہی کھیل کود بن جائے اور وہ اس بات پر فخر کرنے لگے کہ میں بہترین کھلاڑی ہوں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

جو کھیل کا رسیا ہو گا کامیاب نہ ہو سکے گا۔[1]

رسل اس کے متعلق لکھتا ہے:

یہ نظریہ کہ کسی انسان کی شخصیت کا معیار کھیل میں اُس کا سابقہ ہے، ہمارے سماجی عجز و تنزل کی علامت ہے کہ ہم یہ بات نہیں سمجھ سکے کہ ایک جدید اور پیچیدہ دنیا میں رہنے کے لیے معرفت اور تفکر کی ضرورت ہے۔[2]

اجتماعی کھیلوں کی ایک مشکل یہ ہے کہ ان سے بچوں میں کدورت اور لڑائی جھگڑا پیدا ہو جاتا ہے۔ اکٹھے کھیلنے والے بچے کبھی ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے بھی ہیں۔

---

[1] غرر الحکم، ص ۸۵۴

[2] در تربیت ص ۱۴۲

ایسے موقع پر سرپرست حضرات کی ذمہ داری ہے کہ فوراً دخالت کریں اور ان میں صلح و محبت پیدا کر کے انہیں کھیل میں مشغول کر دیں یہ کام اتنا مشکل بھی نہیں ہے کیونکہ ابھی تک عناد اور دشمنی بچوں کے دل میں جڑ پیدا نہیں کر چکی ہوتی۔ اس لیے وہ بہت جلد ایک دوسرے سے پھر گھل مل جاتے ہیں۔

بدقسمتی سے بعض اوقات بچوں کا جھگڑا بڑوں میں سرایت کر جاتا ہے اور وہ کہ جو عقل مند ہیں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ماں باپ بغیر تحقیق کے اور کوئی بات سمجھے بغیر اپنے بچے کا دفاع شروع کر دیتے ہیں اور یہ امر کبھی لڑائی جھگڑے مار پیٹ یہاں تک کہ کبھی تھانے تک جا پہنچتا ہے۔ جب کہ ایسا کرنے سے بچوں کی غلط تربیت ہوتی ہے اور یہ بچے پہ بہت بڑا ظلم ہے جو بچہ ایسے واقعے کو دیکھتا ہے سوچتا ہے کہ حق و حقیقت کی کوئی اہمیت نہیں اور کسی کو حق سے سروکار نہیں اور ہر ماں باپ تعصب کی بنا پر اپنے بچے کا دفاع کر رہے ہیں۔ اس طرح کا بچہ بے جا تعصب اور حق کشی کا عملی سبق اپنے ماں باپ سے لیتا ہے اور کل کے معاشرے میں اس سے کام لیتا ہے۔

خودنمائی

خودنمائی اور اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کا احساس ہر ایک میں تھوڑا بہت موجود ہے۔ ہر انسان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جاذب نظر اور اہم کام انجام دے کر اپنی شخصیت و اہمیت دوسروں پر ثابت کر سکے تاکہ دوسرے اسے سراہیں، اس کی قدر پہچانیں اور اس کے وجود کو غنیمت شمار کریں۔ تقریباً ایک سال کی عمر کے بعد اس فطری خواہش کی علامتیں بچے میں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ بچہ کوشش کرتا ہے کہ محفل میں ایک سے دوسری جگہ جاتا رہے اور اپنی حرکات سے دوسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروائے۔ جس کام سے اس کے ماں باپ اور دوسرے لوگ خوش ہوں اور وہ ہنسیں ان کا تکرار کرتا ہے، انہیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور اپنی کامیابی پر فخر کرتا ہے۔ کبھی اشارے اور کبھی تصریح کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ دیکھیں میں کتنا اہم کام انجام دے رہا ہوں۔

خودنمائی کی خواہش فی نفسہ کوئی بری صفت نہیں ہے۔ یہی درونی احساس انسان کو کوشش اور جدوجہد کے لیے ابھارتا ہے تاکہ وہ سبق پڑھ کر بہترین نمبر حاصل کرے یا بہترین مقرر بن جائے یا اچھا خطیب قرار پائے یا ماہر مصور ہو جائے یا ایک زبردست شاعر بن جائے یا ایک اچھا مصنف بن جائے یا ایک اچھا صناع یا موجد ہو جائے۔

اس صفت کا اصل وجود برا نہیں لیکن اہم بات اس سے استفادہ ہے۔ اگر اس خواہش کی درست راہنمائی کی جائے اسے صحیح طریقے سے سیراب کیا جائے تو یہ بہترین نتائج کی حامل ہوتی ہے۔ ابتدائی طور پر بچہ اچھے اور برے میں تمیز نہیں کر سکتا۔ ہر کام کی اچھائی

یا بُرائی کا معیار اس کے لیے یہ ہے کہ اس کے والدین اسے پسند کرتے ہیں یا ناپسند۔ ایک اچھا مربی کہ جس کی اس نکتے پر توجہ ہو وہ تحسین وتشویق کے ذریعے بچے کی خود نمائی کی خواہش کی تقویت کرتا ہے۔ اس کے اچھے اور مفید کاموں پر اظہار مسرت کرتا ہے اور اس طرح سے اُس میں اچھے اخلاق و آداب کی بنیاد رکھتا ہے اگر اُس سے کوئی غلط اور خلاف ادب کام دیکھتا ہے تو نہ صرف یہ کہ اظہار مسرت نہیں کرتا بلکہ اپنی ناراضی اور ناپسندیدگی کا اظہار بھی کرتا ہے اور اس طرح سے اُس عمل کی بُرائی بچے کو سمجھاتا ہے۔ اس کی طرف سے تحسین و تعریف سوچی سمجھی اور حقیقت کے مطابق ہوتے ہیں اور اس بارے میں وہ تھوڑی سی بھی سہل انگاری اور غفلت نہیں کرتا۔ اور اس طریقے سے وہ بچے کو اچھائیوں کی طرف جذب کرتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔

البتہ بعض نادان ماں باپ اس بارے میں افراط سے کام لیتے ہیں۔ بچے کے ہر کام پر اگرچہ وہ غلط اور بے ادبی پر مبنی کیوں نہ ہو اظہار مسرت کرتے ہیں اور اس طرح سے اس میں ناپسندیدہ اخلاق و آداب کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اس کی خوبیوں کے بارے میں مبالغہ کرتے ہیں۔ ہر جگہ اور ہر کسی کے سامنے اس کی تعریف کرتے ہیں۔ اس کی ہنر نمائیوں کو دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ایسا بچہ ممکن ہے تکبر اور خود پسندی میں مبتلا ہو جائے اور پھر آہستہ آہستہ ایک خود غرض اور جاہ طلب شخص بن جائے اور اپنے لیے ایک جھوٹی شخصیت گھڑے اور لوگوں سے خواہش کرے کہ اس کے ماں باپ کی طرح اس کی موہوم اور خیالی شخصیت کی تعریف و توصیف کریں اور اگر وہ اس بارے میں کامیاب نہ ہوا تو ممکن ہے اس میں ایک نفسیاتی عقدہ پیدا ہو جائے اور وہ لوگوں کو قدر ناشناس سمجھنے لگ جائے۔ یہاں تک ممکن ہے کہ اپنی خیالی شخصیت کے لیے اور لوگوں کی ناقدری کا بدلہ لینے کے لیے وہ کوئی غلط یا خطرناک اقدام کرے۔ وہ چاہے گا کہ اپنی شکست خوردہ خواہشات کو پورا کرے اور دوسروں کی توجہ اپنی شخصیت کی طرف مبذول کرے چاہے اس کے لیے کچھ بھی ہو جائے۔

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ ماں باپ کو چاہیے کہ بچے کے اس سال

سے استفادہ کریں اور تدریجاً اس کی تربیت اور تکامل کی کوشش کریں اور اس کی ایک بلند اور بہتر راستے کی طرف راہنمائی کریں۔ ماں باپ کی رضا اور خوشنودی کی جگہ آہستہ آہستہ اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی اس میں خُو پیدا کریں۔ آہستہ آہستہ اس طرح کے جملے کہنے کی بجائے کہ مجھے یہ کام پسند نہیں یا فلاں کام ابو کو پسند نہیں یہ کہیں کہ اللہ کو یہ کام پسند نہیں اور وہ اس کام پر راضی نہیں۔

تقلید

تقلید کی سرشت انسانی فطرت میں موجود قوی ترین جبلتوں میں سے ہے۔ یہ بھی ایک سود مند اور تعمیری سرشت ہے۔ اسی طبیعت کی بدولت بچہ بہت سی رسوم زندگی آداب معاشرت، کھانا کھانا، لباس پہننا، طرزِ تکلم اور الفاظ اور جملوں کی ادائیگی کا طریقہ ماں باپ اور دوسروں سے سیکھتا ہے انسان ایک مقلِد ہے اور اپنی پوری زندگی میں دوسروں کی تھوڑی یا زیادہ تقلید کرتا ہے لیکن ایک سے پانچ چھ سال کی عمر کے دوران اس میں یہ سرشت زیادہ نمایاں ہوتی ہے، بچہ ایک عرصے تک چیزوں کے حقیقی مصالح اور مفاسد سے ہرگز آگاہ نہیں ہوتا وہ اپنے کاموں کے لیے ایک عاقلانہ اور درست حد کا تعین نہیں کر سکتا اس مدت میں اس کی تمام تر توجہ ماں باپ اور اردگرد کے دوسرے لوگوں کی طرف ہوتی ہے ان کے اعمال اور حرکات کو دیکھتا ہے اور ان کی تقلید کرتا ہے۔

لفظ پانی ماں باپ سے سنتا ہے تقلید کرتے ہوئے وہی لفظ اپنی زبان سے ادا کرتا ہے۔ پھر اس کے معنیٰ کی طرف توجہ کرتا ہے پھر اسے اس کے موقع پہ استعمال کرتا ہے۔ ایک بچی دیکھتی ہے کہ ماں صفائی کرتی ہے اور کپڑے دھوتی ہے وہ بھی بالکل ایسے ہی کام انجام دیتی ہے۔ دیکھتی ہے کہ ماں آگ میں ہاتھ نہیں ڈالتی وہ بھی اس سے بچتی ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ وہ پھلوں کو دھوتی ہے ان کے چھلکے اتارتی ہے اور پھر کھاتی ہے وہ بھی یہی عادت اپنا لیتی ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ امی ابو اور اس کے بہن بھائی گھر کے امور میں منظم ہیں اور ہر چیز کو اس کی مخصوص جگہ پر رکھتے ہیں وہ بھی اپنی زندگی میں اس نظم کے بارے ان کی تقلید کرتی ہے

وہ دیکھتی ہے کہ اس کے ماں باپ ادب سے بات کرتے ہیں وہ بھی مؤدب ہو جاتی ہے وہ دیکھتی ہے کہ گھر کے چلانے میں ماں باپ اور بہن بھائی ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں وہ بھی اس تعاون میں اپنا حصہ ادا کرتی ہے۔ جب وہ دیکھتی ہے کہ سڑک عبور کرتے ہوئے اس کے ماں باپ اس جگہ سے عبور کرتے ہیں جہاں لائنیں لگی ہوئی ہیں وہ بھی یہی کام انجام دیتی ہے اور رفتہ رفتہ اُسے اس کی عادت پڑ جاتی ہے جب بیٹا دیکھتا ہے کہ اس کا باپ باغبانی کرتا ہے یا لکڑی کا کام کرتا ہے یا تعمیر کا کام کرتا ہے ——— ——— وہ بھی شروع شروع میں وہی کام کھیل کی طرح انجام دیتا ہے اور یہی کھیل ممکن ہے اس کی زندگی کے آئندہ پیشے کے طور پر مؤثر ہو۔

بچے کی تعلیم و تربیت اور اس کی تعمیر میں تقلید کا اثر وعظ و نصیحت سے زیادہ ہوتا ہے۔ تقلید خود بخود انجام پاتی ہے اور اس کے لیے کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کہ دیکھا امی کیا کر رہی ہے بلکہ کہے بغیر ہی وہ امی اور ابو کے کام کی طرف پوری توجہ دیتا ہے۔ ایک متکبر، بداخلاق بے ادب اور بدزبان باپ اپنے بچے کے لیے سرمشق قرار پائے گا۔ اور ایک ہٹ دھرم، گستاخ، بے ادب اور بدزبان ماں اپنے ننھے بچے کو ایسی ہی بُری صفات سے پُر کر دے گی۔

ایک جھوٹا، بزدل اور خیانت کار مربّی ایک سچا، شجاع اور امانت دار بچہ پروان نہیں چڑھا سکتا۔ بچے آپ کی وعظ و نصیحت اور گفتگو پر کوئی توجہ نہیں کرتے۔ وہ آپ کے اعمال اور کردار کی طرف پوری توجہ کرتے ہیں اور اُس کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ لہذا تقلید کی سرشت کو اہم تربیتی عوامل میں سے شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس مقام پر ماں باپ اور تمام تربیت کرنے والے ایک بہت ہی بھاری ذمہ داری کے حامل ہیں وہ اپنے کاموں کے بارے میں بے توجہ نہیں رہ سکتے وہ اپنے اچھے اعمال و اخلاق سے اپنے بچوں کے لیے بہترین نمونہ بن سکتے ہیں۔ اگر ماں باپ بُرے ہوں گے تو وہ وعظ و نصیحت سے بچوں کی نیکی اور بھلائی کی طرف ہدایت نہیں کر سکتے۔ لہذا جن ماں باپ کو اپنے بچوں سے محبت ہے انہیں چاہیے کوشش کریں کہ پہلے اپنے آپ کی اور گھر کے ماحول کی اصلاح کریں اور اپنے بچوں کے لیے بہترین

نمونہ عمل بنیں۔ خود ایسا عمل کریں جیسا وہ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد عمل کرے۔ تقلید سے روکنا بہت مشکل ہے آپ کوشش کریں کہ اپنی اولاد کے لیے بہترین نمونہ عمل بنیں۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

اگر آپ دوسروں کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اپنی اصلاح کریں یہ بہت بڑی برائی ہے کہ آپ دوسروں کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور خود فاسد رہیں [1]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوذرؓ سے فرمایا:

اللہ تعالیٰ ماں باپ کی نیکی اور پرہیزگاری کی وجہ سے ان کی اولاد اور پھر ان کی اولاد کو صالح اور نیک تر بنا دے گا [2]

ایک ذمہ دار مربی اپنے بچے کے دوستوں اور ہم جولیوں سے لاتعلق اور بے توجہ نہیں رہ سکتا کیونکہ بچہ بہت سارے کاموں میں اپنے دوستوں اور ہم جولیوں کی تقلید کرے گا۔

بعض اوقات بچہ سینما میں یا ٹیلی ویژن کی سکرین پر اداکاروں کو قتل، جرم، چوری، اور چاقو زنی کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کے اندر بھی اس سے تحریک پیدا ہوتی ہے اور وہ بھی ویسے ہی اعمال کرنے لگتا ہے۔ آپ مجلوں اور اخباروں میں ان بچوں کے احوال پڑھتے ہوں گے کہ جو قتل، جرم اور چوری کے مرتکب ہوتے ہیں اور بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ سینما اور ٹیلی ویژن میں انہوں نے جو پولیس کے کام دیکھے یا قتل اور جرم کے مناظر دیکھے تو وہ ان میں تحریک پیدا کرنے کا عامل بن گئے۔ ایسی صورت میں کیا بچوں کو ایسی چیزیں دیکھنے کے لیے کھلا چھوڑا جا سکتا ہے؟

---

[1] غرر الحکم ص ۲۷۸

[2] مکارم الاخلاق ص ۵۴۶

تلاشِ حقیقت

جب نومولود دنیا میں آتا ہے تو جہانِ خارج کی اسے کوئی خبر نہیں ہوتی۔ ہر چیز اُس کے لیے برابر ہے۔ وہ شکلوں میں، رنگوں میں اور لوگوں میں فرق نہیں کر سکتا۔ وہ شکلوں اور آوازوں سے متاثر ہوتا ہے لیکن انہیں پہچان نہیں پاتا۔ لیکن اسی وقت سے اس میں تحقیق، جستجو اور چیزوں کے پہچاننے کی شدید خواہش اور تمنا ہوتی ہے۔ وہ مسلسل اِس طرف اور اُس طرف دیکھتا ہے اور لوگوں کی صورتیں دیکھ دیکھ کے حیران ہوتا ہے۔ بچہ اپنے حواس کے ذریعے اور اپنی تحقیق و جستجو کی لگن سے اپنی معلومات میں اضافہ کرتا ہے اور کسبِ علم کرتا ہے اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا:

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

اللہ نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس عالم میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے اور اس نے تمہیں کان دیئے۔ آنکھیں دیں، دل دیا تاکہ تم (اللہ کی نعمتوں کو پہچانو اور شکرگزار بن جاؤ۔

کچھ مدت کے بعد بچہ جہانِ خارج کی طرف توجہ کرنے لگتا ہے۔ چیزوں کو ہاتھوں سے پکڑ لیتا ہے۔ انہیں حرکت دیتا ہے۔ پھر زمین پر پھینک دیتا ہے۔ منہ میں لے جاتا ہے۔ آوازوں

---

[1] نحل، ۷۸

کی طرف دھیان دیتا ہے۔ آنکھوں سے لوگوں کی حرکتوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ اس طرح سے تلاشِ حقیقت کی خواہش اور حس کو وہ پورا کرتا ہے اور دنیا کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے تحقیق و جستجو کی سرشت نوع انسان کو ودیعت کی ہے تاکہ اپنی کوشش اور جستجو سے اسرارِ جہان کے پردے ہٹائے اور تخلیق عالم کا راز پالے۔ بچہ میں فطری طور پر تحقیق اور جستجو کا مادہ ہوتا ہے اور وہ اس سلسلے میں حتی المقدور کوشش کرتا ہے۔ ماں باپ اس ضمن میں بچے کو تشویق و تحریک بھی کر سکتے ہیں اور اس کے اس داخلی احساس کو دبا بھی سکتے ہیں۔ اگر ماں باپ تحقیق سے متعلقہ چیزیں اسے دیں اور اُسے یہ آزادی بھی دیں کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق تجربہ کرے اور اس کی عمر کے تقاضے کے مطابق اسے فکری و علمی اعتبار سے جاذب کھلونے خرید دیں تو اس کی تحقیق و جستجو کی روح پروان چڑھے گی۔ بچے کی یہی تلاشِ حقیقت کی فطرت ہی بعد ازاں سائنسی اور علمی ایجادات اور انکشافات کا ذریعہ بنتی ہے۔ ایک کمرے میں موجود مختلف چیزیں اگرچہ پرانی، ٹوٹی پھوٹی اور غیر ضروری ہوں لیکن اس عمر میں بچے کے لیے بہت قابلِ استفادہ اور ثمر بخش ہوتی ہیں۔ لیکن اگر ماں باپ بچے کے داخلی احساس کی تسکین نہ کریں اور ضروری چیزیں اس کے اختیار میں نہ دیں اور اسے تحقیق و تجربے سے منع کریں تو تلاشِ حقیقت کی روح اس کے اندر دب جائے گی۔ اور وہ سائنسی اور تحقیقی امور میں شکست خوردہ اور مایوس ہو گا۔ اس مرحلے سے اہم تر وہ مرحلہ ہے جب بچہ مختلف قسم کے علمی، تحقیقی اور معلوماتی سوالات کرنے لگتا ہے۔ دو سال سے اوپر کی عمر سوالات کی عمر ہے اس عمر میں بچے کی عقل اور سمجھ ایک حد تک کامل ہو چکی ہوتی ہے اور وہ باتیں کرنا سیکھ لیتا ہے۔ اور ماں باپ سے بہت سے سوالات کرنے لگتا ہے مثلاً میں بعد میں ماں بنوں گا یا باپ؟ ابو ہر روز گھر سے باہر کیوں جاتے ہیں؟ پتھر سخت اور پانی نرم کیوں ہے؟ مجھے دادی اماں اچھی نہیں لگتی میں ان کے گھر کیوں جاؤں؟ بارش میں کیوں نہ کھیلوں؟ مچھلیاں پانی میں مر کیوں نہیں جاتیں؟ آپ ہر روز نماز کیوں پڑھتے ہیں؟ نماز کیا ہے؟ سورج رات کو کہاں چلا جاتا ہے؟ بارش اور برفباری کہاں سے ہوتی ہے؟ یہ ستارے کیا ہیں؟ کس نے ان کو بنایا ہے؟ مکھی اور مچھر کا کیا فائدہ ہے؟ جب

دادا جان مر گئے تھے تو انہیں مٹی میں کیوں ڈال دیا تھا؟ وہ کہاں گئے ہیں؟ واپس کب آئیں گے؟ یہ موت کیا ہوتی ہے؟ کم و بیش بچوں کے اس طرح کے سوالات ہوتے ہیں بچوں کے سوالات ایک جیسے نہیں ہوتے۔ عمر اور افراد کے فرق کے ساتھ سوالات بھی مختلف ہوتے ہیں۔

سمجھدار بچے زیادہ گہرے اور زیادہ سوال کرتے ہیں۔ جوں جوں ان کی معلومات بڑھتی جاتی ہیں ان کے سوالات دقیق تر ہوتے جاتے ہیں۔ بچہ سوالات، اور تحقیق سے خارجی دنیا کی شناخت کے لیے دوسروں کی معلومات اور تجربات سے استفادہ کرنا چاہتا ہے۔ تلاش حقیقت اور جستجو کی سرشت انسان کی بہت ہی قیمتی سرشتوں میں سے ہے۔ اس سرشت کے وجود کی برکت سے انسان نے کمال حاصل کیا ہے۔ جہانِ خلقت کے بہت سے اسرار اور راز کشف کیے ہیں۔ اور سائنس اور صنعت میں حیران کن ترقی کی ہے۔ جن ماں باپ کو اپنی اولاد اور انسانی معاشرے کی ترقی اور کمال عزیز ہے وہ اس خدا داد صلاحیت سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرتے ہیں۔ بعض ماں باپ بچگانہ سوالات کو ایسے ہی بے کار اور فضول سمجھتے ہیں اور جواب دینے کی طرف ہرگز توجہ نہیں دیتے کہتے ہیں بچہ کیا سمجھتا ہے؟ بڑا ہو گا تو خود ہی سمجھ لے گا۔

آخر ہم بچوں کے سوالوں کا جواب کیسے دے سکتے ہیں۔ بچوں کے سوالات سن کر کہتے ہیں۔ بیٹا جی! اتنی باتیں نہ کرو۔ ایسے ہی نہ بولتے رہو۔ مجھے کیا پتہ جب بڑے ہو گے تو خود ہی سمجھ لو گے۔ ایسے سوالوں کا وقت نہیں ہے ان کو چھوڑ دو! یہ میرے بس میں نہیں ہے۔

ایسے ماں باپ اپنے بچے کی قیمتی ترین انسانی صلاحیت کو خاموش کر دیتے ہیں اور اُسے دبا دیتے ہیں اور اس طرح سے اس کی روح اور نفسیات پر بھاری ضرب لگاتے ہیں۔ اس کی عقلی رشد و نمو کو روک دیتے ہیں۔ پھر شکایت کرتے ہیں کہ ان کے بچے میں سائنسی انکشافات سے دلچسپی کیوں نہیں ہے۔ وہ علمی اور سائنسی سوالات حل کرنے میں عاجز کیوں ہے۔ جب کہ خود ہی وہ اس کام کا سبب بنے ہیں۔ اگر اس صلاحیت کی صحیح تسکین نہ کی جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ حقیقی راستے سے بھٹک جائے اور بعد ازاں لوگوں کے راز معلوم کرنے اور لوگوں کے اسرار کے بارے میں تجسس کی صورت میں ظاہر ہو۔

بعض ماں باپ اپنے بچوں کو خوش کرنے کے لیے ان کے سوالوں کا جواب دیتے ہیں۔

لیکن انہیں ہرگز اس سے دلچسپی نہیں ہوتی کہ جواب صحیح ہو وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کا بچہ چپ کر جائے جواب صحیح ہو یا غلط۔ وہ سمجھتے ہیں کہ صحیح جواب بچوں کے لیے سمجھنا بہت مشکل ہے۔ لہٰذا انہیں مطمئن کرنے کے لیے ایسا جواب دیتے ہیں کہ بس وہ چپ کر جائے۔ ممکن ہے بچہ اس طرح سے وقتی طور پہ خاموش ہو جائے۔ لیکن تلاش حقیقت کے بارے میں اس کی خواہش سیر نہیں ہوئی اور کمال کے راستے پر آگے نہیں بڑھی بلکہ گمراہی اور خلافِ حقیقت راستے کی طرف بھٹک گئی ہے جب وہ بڑا ہوگا۔ اور حقیقت اسے معلوم ہو جائے گی تو وہ ان ماں باپ کے بارے میں بدبین ہو جائے گا جنہوں نے اسے گمراہ کیا تھا بلکہ یہاں تک ممکن ہے وہ ایک شکی قسم کا شخص بن جائے کہ جو ہر کسی کے بارے میں ہر مقام پہ بد گمانی کرے۔

لیکن سمجھدار اور فرض شناس ماں باپ اس قیمتی خدا داد صلاحیت کو ضائع نہیں کرتے اور اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرتے ہیں، وہ اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں کہ بچوں کے سوالات کا صحیح اور قابل فہم جواب دیں۔ پہلے وہ اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرتے ہیں مطالعہ کرتے ہیں۔ سوچتے ہیں۔ بچوں سے ان کی زبان میں بات کرتے ہیں اور ان کے سوالوں کی طرف خوب توجہ کرتے ہیں اور جواب دیتے ہیں ہرگز خلافِ حقیقت بات نہیں کرتے۔ اگر کسی موقع پر وہ جواب دینے سے عاجز ہوں تو باقاعدہ اپنی لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں اور اس طرح بچے کی تلاش حقیقت کی اس صلاحیت کو بھی ابھارتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ انہیں یہ بھی سکھاتے ہیں کہ جب کسی چیز کا علم نہ ہو تو لاعلمی کا اظہار کرنے میں شرم محسوس نہیں کرنی چاہیے۔

بعض ماں باپ بچوں کے سوال کا جواب دیتے ہوئے حد سے بڑھ جاتے ہیں یعنی ایک چھوٹے سے سوال کا جواب دینے کے لیے تفصیلات میں چلے جاتے ہیں اور جو کچھ بھی انہیں معلوم ہوتا ہے سب کچھ کہہ ڈالتے ہیں۔ یہ کام بھی درست نہیں۔ کیونکہ تجربے سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ بچہ زیادہ باتیں سننے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ اسے صرف اپنے سوال کے جواب سے غرض ہوتی ہے اور زیادہ باتوں سے وہ تھک جاتا ہے تحقیق و جستجو میں بچوں اور نوجوانوں کی تشویق کریں۔ انہیں بحث و استدلال سے آشنا کریں اور جہاں امکان ہو اور ضروری ہو وہاں انہیں تجربے کے لیے بھی ابھاریں۔ بچہ ایک سوچنے والا انسان ہے۔ اس کی سوچ

کو تقویت دیں تاکہ اس کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتیں کام آئیں اور وہ اپنے فکر و شعور سے استفادہ کرے اور اپنی آئندہ کی زندگی کے لیے تیار ہو جائے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

جو بھی بچپن میں سوال کر سکے بڑا ہو کر جواب دے سکے گا[1]

امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا:

بچے کا دل نرم زمین کے مانند ہے۔ آپ جو بھی اس میں ڈالیں گے قبول کرے گا[2]

ایک خاتون اپنے خط میں لکھتی ہے.....

ایک رات ابو گھر آئے اور مجھ سے ایک پہیلی کہی۔ اور کہا کہ میرے ساتھی اس پہیلی کو نہیں بوجھ سکے۔ سب سو گئے لیکن میں نے ارادہ کیا کہ اس کو بوجھ کے رہوں گی۔ اور دیر تک سوچتی رہی اور آخر کار میں نے اسے بوجھ لیا۔ خوشی خوشی میں نے ابو کو جگایا اور انہیں اس پہیلی کا جواب دیا۔ ابو خوش ہو گئے۔ مجھے شاباش کہی۔ ابو ہمیشہ فکری قسم کے کام مجھ سے کہتے اور اس سلسلے میں مجھے تشویق کرتے۔ اسی لیے میں فکری مسائل حل کرنے میں طاق ہو گئی ہوں۔ اور زندگی کی مشکلات کو سوچ بچار سے حل کر لیتی ہوں!

---

[1] غرر الحکم ص ۶۴۵

[2] غرر الحکم ص ۳۰۲

خود اعتمادی

تمام زندگی جد و جہد، پیکار، کوشش اور جستجو کا نام ہے۔ ہر انسان کو زندگی بھر میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ زندہ رہنے اور زندگی گزارنے کے لیے اُسے عالم طبیعت کی قوتوں سے ناچار جنگ کرنا پڑتی ہے اور انہیں تسخیر کرنا پڑتا ہے بیماریوں اور ان کے اسباب کے خلاف لڑنا پڑتا ہے۔ تجاوزوں، زیادتیوں اور آرام و آزادی کے خلاف مزاحمت کرنے والے عوامل کے خلاف جد وجہد کرنا پڑتی ہے۔ کارزارِ زندگی میں وہی کامیاب ہے جس کا دل بڑا ہو، ہمت بلند ہو۔ اور ارادہ قوی ہو۔ ہر کسی کی خوش بختی یا بدبختی کی بنیاد خود اس کے وجود میں موجود ہے۔ دنیا کے بڑے انسانوں کی درخشاں کامیابیوں کا سبب ان کی خود اعتمادی، قوت ارادی اور مسلسل کوشش رہی ہے عظیم اور قوی لوگ زندگی کی مشکلات سے نہیں ڈرتے۔ وہ ذاتی استقلال اور خدا پہ بھروسہ کرتے ہوئے ان کے خلاف بر سر پیکار ہوتے ہیں۔ اور کمر ہمت باندھ کے جد وجہد کرتے ہیں اور انہیں مغلوب کر لیتے ہیں۔ ہمت اور عالی حوصلگی ہر مشکل کو آسان بنا دیتی ہے۔ بلکہ جو چیز دوسروں کے لیے محال ہوتی ہے اسے ممکن بنا دیتی ہے۔ وہ زندگی کے گہرے سمندر میں کسی تنکے کی مانند نہیں ہوتے کہ جو فقط لہروں کے سہارے ادھر اُدھر بھٹکتے رہیں بلکہ ایک ماہر تیراک کی طرح اپنے قوی بازوؤں آہنی ارادوں اور توکل الی اللہ سے جس طرف کو چاہتے ہیں تیرتے ہیں بلکہ دنیا کے واقعات کا رُخ بدل دیتے ہیں۔ ہر انسان اپنے ذاتی استقلال، خود اعتمادی، ارادے اور جد و جہد سے اپنی زندگی میں کامیاب ہوتا ہے دین مقدسِ اسلام میں بھی دنیاوی اور اُخروی

کامیابی و ناکامی کو انسان کے اعمال اور کوشش کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۝ وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی ۝

انسان کے لیے جو کچھ بھی ہے وہ اس کی کوشش کا ماحصل ہے اور وہ جلد اپنی سعی کو (مجسم) دیکھ لے گا۔ (النجم - ۳۹، ۴۰)

حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اَلْقَدْرُ بِھِمَّتِہٖ

ہر کسی کی قیمت اس کی ہمت کے مطابق ہے[1]

جو شخص خود استقلال اور خود اعتمادی کا حامل ہو وہ مشکلات کے حل کے لیے دوسروں کا منتظر نہیں رہتا بلکہ اپنی بلند ہمتی اور پختہ ارادے کے ذریعے میدانِ عمل میں کود پڑتا ہے اور جب تک اپنے مقصد کو پا نہیں لیتا کوشش اور جدوجہد سے دستبردار نہیں ہوتا۔

امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں:

تمام اچھائیاں اس امر میں جمع ہیں کہ انسان دوسروں کے بھروسے پر نہ بیٹھا رہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

مومن کی عزت اور بزرگی کا راز یہ ہے کہ وہ لوگوں کے ہاتھوں میں موجود چیز سے امید وابستہ نہ رکھے[2]

البتہ خود اعتمادی سے محروم افراد اپنی ذات پر بھروسہ نہیں کرتے۔ وہ اپنے تئیں حقیر اور ناتواں سمجھتے ہیں، زندگی کے مسائل کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں اور ان کے ساتھ مقابلے

---

[1] نہج البلاغہ ج ۳ ص ۱۶۳

[2] اصول کافی، ج ۲ ص ۱۴۸

[3] اصول کافی ج ۲ ص ۱۴۸

کی جرأت سے عاری ہوتے ہیں۔ وہ مشکل کاموں اور ذمہ داریوں سے بھاگتے ہیں۔ منفی سوچوں اور یاس وناامیدی کی وجہ سے ممکن کاموں کو بھی محال بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اپنی زندگی کو محرومی اور کنارہ کشی کے عالم میں گزار دیتے ہیں۔

اب جب کہ استقلال اور خود اعتمادی کی اہمیت واضح ہو گئی ہے، اس امر کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ اس انسانی کمال کی بنیاد ہر انسان کے اپنے وجود میں مخفی ہے لیکن تربیت اور تکامل کی محتاج ہے۔ اس کی تربیت کا بہترین اور حساس ترین زمانہ بچپن کا دور ہے۔

روح انسانی میں استقلال اور خود اعتمادی کی بنیاد بچپن ہی میں پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ بے اعتمادی اور قوت ارادی سے محرومی، دوسروں کے انتظار میں بیٹھے رہنے کا سرچشمہ بھی بچپن کی غلط تربیت ہی ہے۔ وہ ماں باپ جو اپنے بچوں سے محبت رکھتے ہیں اور انہیں اپنی ذمہ داری کا احساس بھی ہے، انہیں چاہیے کہ اپنی اولاد کی تربیت کریں اور آئندہ کی زندگی کے لیے انہیں تیار کریں۔ اس صورت میں وہ اپنے فریضے پر بھی عمل کریں گے اور اپنی کامیابی کے اسباب بھی فراہم کریں گے۔

حضرت امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں:

اپنی اولاد کی اس طرح سے تربیت کر کہ وہ تیری عزت وسربلندی کا باعث بنے۔[1]

چار سال کی عمر سے لے کر آٹھ سال کی عمر تک شخصیت کی پرورش، استقلال، اور خود اعتمادی پیدا کرنے کا بہترین دور ہے۔ اس زمانے میں بچہ استقلال کی طرف میلان رکھتا ہے اور اپنے آپ کو مشکلات سے مقابلے کے لیے تیار کرتا ہے۔ کم سن بچہ اگرچہ اپنی کمزوری کا احساس بھی رکھتا ہے اور وہ کسی بڑی طاقت کے زیر سایہ رہنا چاہتا ہے تاہم استقلال اور خود اعتمادی کی طرف میلان بھی اس کی ذات میں چھپا ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ

---

[1] تحف العقول ص ۲۶۹

اپنی ضروریات کو پورا کرے اور ذاتی استقلال حاصل کر لے۔ وہ نئے نئے کاموں اور اپنی ایجادات سے بہت خوش ہوتا ہے اور فخر سے انہیں دوسروں کو دکھاتا ہے۔ آپ نے بچوں سے ایسے جملے بہت سُنے ہوں گے:

* دیکھ میں کیا کر رہا ہوں؟
* دیکھا میں نے کتنی بڑی چھلانگ لگائی ہے!
* دیکھو میں اپنے کپڑے خود پہن سکتا ہوں۔
* میں جوتا خود ہی پہنوں گا۔
* میں گلاس میں پانی پیوں گا۔
* میں خود ہی کھانا کھاؤں گا۔
* میں نہیں چاہتا کہ آپ میرے لیے چائے ڈالیں۔
* دیکھو میں نے کیسی خوبصورت تصویر بنائی ہے۔
* میں درخت پہ چڑھنا چاہتا ہوں۔

وہ ضد کرتا ہے کہ اُس کی جیب میں جو پیسے ہیں انہیں اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کھلونے اپنی مرضی سے رکھے۔ کبھی کبھی ماں باپ کے حکم کے خلاف ضد کرتا ہے۔ کبھی چاہتا ہے کہ ماں باپ کی مدد کرے۔ چھوٹی بیٹی برتن اور لباس دھونے میں ماں کی مدد کرتی ہے۔ چاہتی ہے کہ کھانا پکانے، دسترخوان بچھانے اور گھر کی صفائی میں ماں کی مدد کرے۔ چھوٹا بیٹا چاہتا ہے کیاری کو ٹھیک کرے، تصویر بنائے، خط لکھے اور چیزیں خریدنے میں اپنے باپ کی مدد کرے۔ اور ضد کرتا ہے کہ اپنا لباس اور جوتا خود انتخاب کرے راستے میں چلتے ہوئے ماں باپ سے آگے یا پیچھے چلتا ہے۔ خانہ داری کے امور میں اور گھر کے سامان کے سلیقے میں دخل دیتا ہے۔ بعض چیزیں بالکل نہیں کھاتا۔ ان کاموں سے اور ایسے سینکڑوں دیگر کاموں سے بچہ اپنے وجود کے استقلال کا اعلان کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اپنی شخصیت کا اظہار کرے اور اپنے تئیں کمال تک پہنچائے۔ چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو قوی بنائے وہ چاہتا ہے کہ

جہاں تک ممکن ہو سکے دوسروں پر اپنے انحصار کو کم کرے اور اپنے استقلال میں اضافہ کرے لیکن بچے کی شخصیت ماں باپ کے طرزِ عمل سے بہت زیادہ وابستہ ہوتی ہے. ماں باپ بچے کو آزاد چھوڑ سکتے ہیں تاکہ وہ خود ارادی سے کام کرے۔ انہیں چاہیے کہ وہ اس کی کامیابیوں پر اور نئی نئی چیزوں پہ اظہار مسرت کریں۔ اسے شاباش کہیں اور اس کا حوصلہ بڑھائیں۔ اس کے ذوق اور استعداد کے مطابق مفید کام اس کے ذمہ چھوڑ دیں۔ راہنمائی اور حوصلہ افزائی کے ذریعے اسے کام اور کوشش پر ابھاریں۔ اس طرح بچے کی شخصیت اور استقلال کی تدریجاً تکمیل ہوتی جائے گی۔ وہ اپنے وجود کے آثار اپنی آنکھوں سے دیکھے گا اور اس میں خود اعتمادی پیدا ہو گی۔ اس کا ارادہ قوی ہو گا۔ ایسے بچوں میں بچپن ہی سے عقلی صلاحیتوں اور خود اعتمادی کے آثار ظاہر ہونے ہیں۔

ایک ماہر نفسیات لکھتے ہیں :

ایک شخص نے ایک ننھے ماہی گیر کو دیکھا کہ وہ بڑی مہارت سے مچھلیاں پکڑنے میں مصروف ہے۔ اور بڑی بڑی مچھلیاں پکڑ رہا ہے۔ اسے تعجب ہوا، اور اس نے اس کی مہارت کی تعریف کی۔ ننھے ماہی گیر نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا ! میری مہارت کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ میں بچپن ہی سے ماہی گیری کر رہا ہوں۔ اس نے پوچھا ! مگر تمہاری عمر کیا ہے ؟ کہنے لگا چھ سال[1]

اگر ماں باپ نے اس بچے کی حوصلہ افزائی نہ کی ہوتی بلکہ اس کی حوصلہ شکنی کے اسباب فراہم کئے ہوتے تو اس میں ایسی مہارت ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی تھی اور اس میں کبھی خود اعتمادی پیدا نہ ہوتی۔ بعض ماں باپ کہ جو اپنے بچوں سے بہت زیادہ محبت رکھتے ہیں کوشش کرتے ہیں کہ بچوں کا وجود ان کا محتاج بنا رہے۔ انہیں کام کی اجازت نہیں دیتے۔ ان کے تمام کام خود انجام دیتے ہیں۔ خود ہی ان کے لئے ارادہ کرتے ہیں اور خود ہی انتخاب! بہت سے ماں باپ نہ صرف یہ کہ اپنی اولاد میں استقلال اور خود اعتمادی پیدا کرنے

---

[1] روان شناسی کودک و بالغ ص ۲۴۶

یں مدد نہیں کرتے بلکہ اپنی ڈانٹ ڈپٹ اور اُن کے کاموں میں کیڑے نکالنے سے ان کی روحِ استقلال طلبی کو سُلا دیتے ہیں بچے کو ایجادات سے روکتے ہیں اور اس کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کر دیتے ہیں۔ اس کے کام پر تنقید کرتے ہیں اور بُرا بھلا کہتے ہیں۔ اور اس کے کام میں کیڑے نکال کر اُسے شرمندہ کرتے ہیں اور اس کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔

اے عزیز ماں باپ! ہمارے بچوں نے بہر حال بڑا ہونا ہے اور آخر کار ہم سے جُدا بھی ہونا ہے آئندہ کی زندگی میں انہیں مشکلات اور مسائل کا سامنا بھی کرنا ہے۔ آپ کو بھی فطرت سے ہم آہنگ ہونا چاہیے اور ان کی آزادی کی خواہش کا جواب دینا چاہیے۔ آزادی کی خواہش کوئی عیب کی بات نہیں کہ آپ اس کا مقابلہ کرنے لگیں۔ بلکہ یہ آزادی کسی وجود کے استقلال اور کمال کا اظہار ہوتی ہے۔ آپ کوشش کریں کہ صحیح طریقے سے اس سے فائدہ اٹھائیں اور بچوں کو آئندہ کی زندگی کے لیے تیار کریں۔ آپ اس پر اصرار نہ کریں کہ جہاں آپ کے بچوں کو ارادہ کرنا چاہیے وہاں آپ خود ان کے لیے ارادہ کریں۔ بلکہ آپ کو چاہیے کہ ان کے لیے مسئلہ کو واضح کر دیں اور اس کے بعد انتخاب اور ارادہ ان کے ذمہ چھوڑ دیں۔

اگر بچہ کوئی کام شروع کرے اور اسے اس میں رغبت نہ ہو تو آپ اس میں دخالت نہ کریں بےجا دخل اندازی سے اُسے آزردہ خاطر نہ کریں۔ اُسے چھوڑ دیں کہ وہ اپنے سلیقے سے کام مکمل کرے۔ اور اپنی نئی نئی چیزوں سے خوش ہو۔ اس کے کام پر تنقید نہ کریں مگر یہ کہ خود وہ اس چیز کا اظہار کرے۔

اگر آپ کی بیٹی چاہتی ہے کہ خود سے کھانا تیار کرے تو اس کی راہنمائی کریں اور کام اس کے ذمہ چھوڑ دیں۔ اور اس میں دخیل نہ ہوں۔ کیا حرج ہے کہ ایک مرتبہ وہ خراب کھانا پکائے۔ اس کے کھانا پکانے پر نکتہ چینی نہ کریں۔ کیا آپ کو معلوم ہے آپ کی نکتہ چینی اور ڈانٹ ڈپٹ اس کی روح کو کس قدر مجروح کر دیتی ہے۔ اور کس قدر اس کی خود اعتمادی کو نقصان پہنچاتی ہے۔

...... ایک خاتون اپنے خط میں لکھتی ہیں:

بچپن میں میں جو کام بھی کرنا چاہتی مجھ سے کہا جاتا تجھے نہیں پتہ تو کیا ہے؟

تونے یہ برتن توڑ دیا ہے۔ تیرے کھانے میں نمک زیادہ ہے۔ تونے پانی زیادہ ڈال دیا ہے۔ خراب کر دیا ہے۔ تم کام کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ جھاڑو نہ دے! تجھے کیا پتہ جھاڑو کیسے دیا جاتا ہے۔ مہمانوں کے سامنے بات نہ کر۔ اور اسی طرح کی سینکڑوں باتیں۔ جب میں کھانا پکاتی تو کئی دفعہ چکھتی کہ کہیں نمک زیادہ نہ ہو۔ پانی زیادہ نہ ہو۔ لیکن پھر مجھے سرزنش کی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ میں خود اعتمادی پیدا نہیں ہو سکی۔ میں خود کو کمزور اور بے حیثیت سمجھتی ہوں۔ احساس کمتری اور خود پر عدم اعتماد سے میں بہت دکھی ہوں۔ یہ حالت اب بھی مجھ میں باقی ہے۔ ایک مجلس کا انتظام میرے ذمہ ہے ہر ہفتے جب کبھی مجھے اس مجلس کے انتظام کے لیے جانا ہوتا ہے تو مجھ میں اضطراب ———

پیدا ہو جاتا ہے۔ اور میرا دل گھبراتا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ شاید اچھی تقریر نہ کر سکوں۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بہت سی باتیں یاد ہوتی ہیں اور یہ باتیں متعدد مجالس میں بیان بھی کر چکی ہوتی ہوں لیکن پھر بھی خوف و ہراس ہوتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ میرے سر پہ کوئی ذمہ داری نہ ہو۔ جس کام کی طرف بھی بڑھتی ہوں اپنے آپ کو روکتی رہتی ہوں تاکہ کسی طرح سے درمیان میں ہی کام چھوٹ جائے۔ بہت چاہتی ہوں کہ بے اعتمادی کی یہ کیفیت ختم ہو جائے لیکن نہیں ہوتی۔

...... ایک اور خاتون لکھتی ہیں:

۔بچپن ہی سے میری ماں کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ کاموں میں میری مدد کرے۔ وہ مجھے اجازت نہ دیتی کہ میں کوئی کام تنہا انجام دوں۔ رفتہ رفتہ مجھے اس کی عادت ہو گئی۔ اور کسی دوسرے کا سہارا لینا میرا مزاج بن گیا۔ میں کاموں کی انجام دہی اور مشکلات کے حل میں اپنی طاقت سے استفادہ نہ کرتی بلکہ امی سے یا دوسروں سے مدد لیتی۔ بے اعتمادی کی یہ حالت ہو گئی کہ کسی چھوٹی سی مشکل پہ بھی بجائے اس کے کہ خود اس کے حل کے لیے کوئی چارہ کرتی دوسروں سے مدد لیتی اور

اپنے تئیں اس کا اہل نہ سمجھتی۔

آخر میں اس امر کی یاد دہانی ضروری ہے کہ ممکن ہے بعض بچے اپنے وجود کے اظہار کے لیے غلط کام شروع کر دیں۔ مثلاً پھولوں کو مسل دیں۔ درختوں کی ٹہنیوں کو توڑ دیں۔ پرندے، کتا اور بلی کو تکلیف پہنچائیں۔ اپنے ہم جولیوں کو اذیت دیں۔ دوسروں کو نقصان پہنچائیں۔ اپنی بہن کے بال کھینچیں۔ ایسے امور میں ماں باپ خاموش بیٹھے نہیں رہ سکتے اور ان کے کاموں کی تائید نہیں کر سکتے۔ البتہ اس امر کی طرف انہیں متوجہ رہنا چاہیے کہ بچے کا مقصد کسی سے دشمنی یا سرکشی نہیں بلکہ وہ اپنے وجود کا اظہار چاہتا ہے۔ ایسے امور سے روکنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کی توجہ دوسرے مفید کاموں کی طرف مبذول کر دی جائے۔ اور اسے تعمیری کھیلوں کی طرف اور مفید کاموں میں مہارت حاصل کرنے میں مشغول کر دیا جائے تاکہ وہ غلط کام چھوڑ دے۔

آزادی

بہت سے ماں باپ بچے کی تربیت اس میں سمجھتے ہیں کہ اس کی آزادی محدود کر دی جائے یا چھین لی جائے۔ کہتے ہیں بچہ اچھائی اور بُرائی میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اس کی اتنی عقل نہیں ہوتی۔ اگر اُسے آزاد چھوڑ دیں تو وہ خرابی کرے گا۔ چاہیے کہ اسے محدود اور پابند رکھا جائے۔ ایسے ماں باپ اپنے آپ کو بچے کی عقل کے مطابق فرض کر لیتے ہیں۔ اس کے مقام پر سوچتے ہیں۔ اس کی جگہ ارادہ کرتے ہیں۔ اس کی بجائے خود انتخاب کرتے ہیں یہاں تک کہ اس کے کھانے، پینے اور کھیلنے پر بھی کنٹرول رکھتے ہیں۔ اور اس کے ہر مسئلے پر نظر رکھتے ہیں۔ اور اپنے سلیقے کے مطابق اس کی زندگی کا نظام چلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک بچہ آزادی اور خود ارادی کا حق نہیں رکھتا۔ اور ماں باپ کی اجازت کے بغیر کام نہیں کر سکتا۔ جو کچھ وہ اس کے لیے پسند کریں اسے ناچار بے چون وچرا کرنا ہوگا۔ اور جسے وہ بُرا سمجھیں مجبوراً بغیر کچھ کہے اُسے ترک کرنا ہوگا۔ ماں باپ کے تربیتی پروگرام اور ان کے حکم اور ممانعت پہ بچوں کو اطاعت کے علاوہ چارہ نہیں۔ پہلے خاندان اسی طریقے سے اپنی اولاد کی تربیت کرتے تھے اور وہ زبردستی اور بزور اپنے احکام پر عمل کراتے تھے۔ دورِ حاضر میں بھی بہت سارے خاندان اسی طریقے پر چل رہے ہیں۔

مذکورہ طریقہ کار اگرچہ معمول رہا ہے اور آج بھی ہے لیکن یہ تربیت کی صحیح روش نہیں ہے۔ اس میں بہت سے عیوب ونقائص موجود ہیں۔ اس پروگرام کے مطابق ممکن ہے کہ بچوں کی ایسی تربیت ہو جائے کہ وہ بہت حد تک آرام سے رہیں، خاموش رہیں اور

فرمانبردار رہیں اور ماں باپ کی مرضی کے مطابق عمل کریں۔ایسے بچے زیادہ تر دبے اور قوت ارادی سے عاری رہ جاتے ہیں۔ان کی تخلیقی صلاحیتیں خاموش ہو جاتی ہیں۔اہم کاموں میں ہاتھ ڈالنے کی جرأت اُن میں نہیں ہوتی۔اور وہ عزم وارادہ سے محروم رہ جاتے ہیں۔دشوار ذمہ داریوں کو قبول کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔یہ قیادت نہیں کر سکتے اور کمانڈر نہیں بن سکتے۔ لیکن فرمانبرداری ان کے لیے مشکل نہیں ہوتی ایسے بچے ستم اٹھانے اور ظلم کو قبول کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور بڑے ہو کر اس بُری عادت سے دستبردار نہیں ہوتے چونکہ یہ لوگ آزادی سے محروم رہے ہیں اور اپنی اندرونی خواہشات کی تکمیل نہیں کر سکے ہیں۔ان کے دل میں گویا ایک گرہ سی پڑ گئی ہے۔ممکن ہے یہ گرہ بہت سی نفسیاتی اور اعصابی بیماریوں کا باعث بن جائے۔یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے عقدہ دار افراد ردّ عمل کے طور پر ظلم کرنے لگیں تاکہ اس ذریعے سے اپنے ماں باپ اور پورے معاشرے سے انتقام لے سکیں اور اپنی کمی کو پورا کر سکیں۔انہی بُرائیوں کی بناء پر حال ہی میں بعض دانشوروں اور ماہرین نفسیات نے اس ظالمانہ طرز تربیت کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا ہے،اور اس کی سخت مذمت کی ہے اور بچے کی کامل آزادی کی حمایت میں آواز اٹھائی ہے۔ان دانشوروں نے ماں باپ کو نصیحت کی ہے کہ اپنے بچے کو بالکل آزاد چھوڑ دیں تاکہ وہ اپنے ذوق اور سلیقے کے مطابق چلے۔وہ کہتے ہیں کہ بچے کو آزادی دیں کہ وہ جو کام چاہے کرے اگرچہ وہ کام آپ کی نظروں میں درست نہ ہو یا بچہ اس کام کی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔اس چیز سے بچہ آزاد مزاج ہو کر پروان چڑھے گا اور اس کا دل کسی گرہ سے دوچار نہیں ہوگا۔

معروف دانشور فرائڈ اسی نظریے کا حامی ہے اور اس نے مشرق و مغرب میں اپنے اس نظریے کے بہت سے پیروکار پیدا کر لیے ہیں۔بہت سے ماں باپ نے بھی اس نظریے کو قبول کر کے اس پر عمل کیا ہے اور اپنے بچوں کو کامل آزادی دے دی ہے ایسے ماں باپ اپنے بچوں کو کوئی حکم نہیں دیتے اور ان سے بے تعلق رہتے ہیں۔

یہ طرز عمل بھی درست نہیں۔اس میں بھی بہت سے نقائص موجود ہیں۔وہ بچے جو اس طرز عمل کے مطابق پروان چڑھتے ہیں وہ کاموں کی انجام دہی میں کسی بھی محدودیت کے

قائل نہیں ہوتے۔ ایسے بچے زیادہ تر خود غرض، شہوت پرست اور دھونس دھاندلی جانے والے ہوتے ہیں اور دوسروں کے لیے کسی حق کے قائل نہیں ہوتے۔ دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ ماں باپ سے چین چھین لیتے ہیں۔ بہن بھائیوں اور دوسرے بچوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ ہمسایوں اور رشتے داروں کو اذیت دیتے ہیں۔ ان کی خواہشات چونکہ مطلق آزادی کی حامل ہوتی ہیں لہٰذا ایسے بچے عموماً افراط اور زیادتی کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ یہ افراط ان کے لیے خرابی اور تباہی کا باعث بنتی ہے۔ افراط اور نامعقول آزادی بچے کو اضطراب اور پریشانی میں مبتلا کر دیتی ہے ممکن ہے ان کی توقعات اس حد تک جا پہنچیں کہ ان کی انجام دہی ایک مشکل کام بن جائے۔ اس طرح کے بچے جب بڑے ہو جاتے ہیں تو دوسروں سے ان کی یہ توقع ہوتی ہے کہ ان کے ماں باپ کی طرح ان کی اطاعت کریں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہر جگہ ان کی فرماں روائی ہو۔ وہ کسی کی اطاعت قبول نہیں کرتے معاشرے کے افراد پر ان کی نہیں چلتی اور جب وہ شکست کا سامنا کرتے ہیں تو پھر ان کے دل میں ایک گرہ پڑ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں وہ گوشہ نشین ہو جاتے ہیں یا اپنی شکست کی تلافی کے لیے ظلم اور خطرناک کام انجام دیتے ہیں۔ بے قید آزادی کبھی بچے کی ہلاکت کا باعث بھی بن جاتی ہے۔ شاید بچے کا دل یہ چاہتا ہو کہ وہ بغیر کسی پابندی کے سڑک پر دوڑے یا بجلی کے ننگے تار کو چھوئے یا گرم سماوار کو ہاتھ لگائے۔ اس بناء پر تربیت کے یہ دو طریقے کہ جو ایک دوسرے کے مقابل ہیں ایک افراط کا حامل ہے اور دوسرا تفریط کا۔ یہ دونوں طرز عمل درست نہیں ہیں۔ بچے کی تربیت کے معاملے میں ان پر عمل پیرا نہیں ہوا جا سکتا۔ اس معاملے میں بہترین قابلِ انتخاب روش بچے کی محدود اور معتدل آزادی ہے۔ اللہ نے انسانی وجود کو مختلف جبلتوں اور محسوسات کا مرکب بنایا ہے کہ جو انسانی شخصیت کی تکمیل کے لیے سودمند ہیں۔ مثلاً محبت، نفرت، شجاعت، خوف، حملہ، دفاع، جستجو، تقلید اور کھیل کا شوق وغیرہ یہ داخلی کیفیات و محسوسات اللہ کی طرف سے انسانی قوتوں کا سرچشمہ ہیں اور زندگی کی مشکلات کو حل کرنے کے لیے انسان کو عطا کی گئی ہیں۔ انہی سے انسانی شخصیت تشکیل پاتی ہے۔ ان جبلتوں کو آزاد ماحول میں پرورش اور رشد کا موقع ملنا چاہیے۔ انہیں پھلنے

سے انسانی شخصیت بُری طرح مجروح ہوجاتی ہے۔

خوف خطرات سے بچنے کے کام آتا ہے۔ غصہ دشمن پر حملہ آور ہونے کے کام آتا ہے جستجو حصولِ علم کے لیے ضروری ہے۔ جس شخص میں خوف اور غصہ نہ ہو وہ ناقص انسان ہے یہ درست نہیں ہے کہ بچے کے ان احساسات کو دبا دیا جائے یا کچل دیا جائے۔ آزاد ماحول میں بچہ ان احساسات سے استفادہ کر سکتا ہے آزادانہ عمل کر سکتا ہے، اپنی شخصیت کو پروان چڑھا سکتا ہے اور اجتماعی زندگی کے لیے اپنے تئیں تیار کر سکتا ہے۔

دینِ مقدسِ اسلام نے آزادی کی طرف خصوصی توجہ دلائی ہے۔ نمونے کے طور پر چند ایک احادیث ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

لَا تَكُنْ عَبْدَ غَيْرِكَ فَقَدْ جَعَلَكَ اللهُ حُرًّا۔

غیر کا بندہ نہ بن اللہ نے تجھے آزاد پیدا کیا ہے[1]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

جس شخص میں یہ پانچ خصوصیات نہ ہوں اس کا وجود فائدہ مند نہیں ہے۔

اوّل۔ دین

دوم۔ عقل

سوم۔ ادب

چہارم۔ آزادی

پنجم۔ خوش اخلاقی[2]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

بچہ سات سال کی عمر تک فرماں روا ہے۔ سات سال کی عمر سے لے کر

---

[1] بحار الانوار، ج ۷۷ [?]، ص ۲۱۴

[2] بحار، ج ۱، ص ۸۳

چودہ سال تک فرماں بردار رہے اور چودہ سال کے بعد سات سال ماں باپ کا وزیر اور مشیر رہے[۱]

البتہ مطلق آزادی بھی ممکن نہیں ہے۔ معاشرے میں زندگی بسر کرنے والا انسان کاملاً آزاد نہیں رہ سکتا کیونکہ معاشرے کے تمام افراد آزادی اور زندگی کا حق رکھتے ہیں۔ ایک فرد کی آزادی کے لیے دوسروں کے حقوق پامال نہیں کیے جا سکتے۔ بچے کو بچپن ہی سے سمجھا دینا چاہیے کہ بے قید و شرط آزادی کے ساتھ زندگی بسر نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے لوگ بھی زندگی اور آرام کے حقدار ہیں۔ مثلاً بچہ چاہتا ہے کہ کھیلے۔ کھیل اس کی تربیت کے لیے بھی ضروری ہے۔ اسے اس بات کی آزادی ہونا چاہیے کہ اپنے ذوق اور سلیقے کے مطابق کھیلے لیکن اس کھیل میں ماں باپ، ہمسایوں اور دوسرے بچوں کے حقوق کا بھی خیال رکھے اور ان کی آزادی میں حائل نہ ہو۔ درست ہے کہ اسے کھیلنا چاہیے لیکن اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اسے لوگوں کے در و دیوار خراب اور گندہ کرنے اور شیشے توڑنے کا حق نہیں۔ لہٰذا کھیل میں تو اسے آزادی ہے لیکن ایک محدود اور مشروط آزادی نہ کہ بے قید و شرط آزادی۔

بچہ اپنے غصّے کو استعمال کر سکتا ہے۔ اسے مناسب موقعے پر استعمال کر کے اپنا دفاع کر سکتا ہے۔ لیکن اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ غصّے کے وقت اسے یہ حق حاصل نہیں کہ گھر کے سامان کی توڑ پھوڑ شروع کر دے یا ماں باپ اور دوسرے لوگوں کو کوئی نقصان پہنچائے یا کسی کی توہین کرے یا کسی کا حق پامال کرے۔

اس حکمت عملی کے لیے ماں باپ کو چاہیے کہ بچے کی عمر، فہم، طاقت، خواہشات اور جذبات کو ملحوظ نظر رکھیں اور اس کے اعمال اور حرکات کو دو حصّوں میں تقسیم کریں۔

۱۔ وہ کام جو اس کے لیے جائز ہیں۔

۲۔ وہ کام جن کا وہ مجاز نہیں ہے۔

انھیں ان میں سے ہر ایک کی حدود پوری طرح سے واضح کرنا چاہیے۔ اس کے

---

[۱] وسائل، ج ۱۵، ص ۱۹۵

بعد انہیں چاہیے کہ جائز امور میں بچوں کو پوری آزادی دیں تاکہ وہ اپنی جبلت اور طبیعت کے مطابق عمل کر سکیں اور اپنی شخصیت کو پروان چڑھا سکیں۔ بچے کو اجازت دینی چاہیے کہ وہ خود غور کرے۔ ارادہ کرے اور کام کرے۔ نہ صرف بچے کو کامل آزادی دینی چاہیے بلکہ ضروری مواقع پر اس کی مدد بھی کرنا چاہیے لیکن جو کام اس کے لیے مناسب نہیں ان سے سختی سے روکنا چاہیے اور ان کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں دینا چاہیئے۔

اس طرز عمل سے بچے کی آزادی سلب نہیں ہوگی اور نہ ہی اس کی صلاحیتیں کچلی جائیں گی۔ بلکہ اس کو آزادی ہوگی۔ البتہ حدود کے اندر۔ اور ساتھ ہی اس کے جذبات اور طبیعت پر کنٹرول بھی پیدا ہو جائے گا۔ جبلت پر کنٹرول اس کو کچلنے اور اسے پیچھے کھینچنے کے معنیٰ میں نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب ہے نفس پر قابو اور تقویت ارادہ تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو غلط کاموں پہ صرف نہ کرے بلکہ انہیں مفید اور سود مند کاموں کے لیے جمع رکھے۔

آخر میں ماں باپ کو نصیحت کی جاتی ہے کہ پہلے تو وہ صحیح اور غیر صحیح کاموں کی حدود کو قطعی طور پہ معین کریں تاکہ بچہ اپنی ذمہ داری کو سمجھ سکے۔ مثلاً ایسے کام جو بچے یا خاندان کی سلامتی اور امن و سکون کے لیے نقصان دہ ہیں۔ نیز ایسے کام جو جسمانی یا مالی طور پہ ضرر رساں ہیں۔ اسی طرح شریعت اور قانون کے خلاف کام نیز اخلاقی اور معاشرتی اصولوں کے خلاف کام اور ایسے کام جو دوسروں کی آزادی میں حائل ہوتے ہیں اور ان کے حقوق ضائع کرنے کا باعث بنتے ہیں انھیں بلیک لسٹ کر دیا جانا چاہیے اور بچے کو ان سے سختی سے روک دینا چاہیے۔ ایسے کاموں کے علاوہ دیگر کاموں میں بچہ بالکل آزاد ہونا چاہیے۔ اور ان امور میں اسے خود سوچنا چاہیے۔ خود ارادہ کرنا چاہیے۔ اور خود انہیں انجام دینا چاہیے۔

دوسرا یہ کہ بچے کی توانائی کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اس کے عقلی رشد اور جسمانی طاقت کے مطابق اس کے لیے نظم و ضبط ہونا چاہیے اور سخت قسم کے نظم و ضبط اور غیر منطقی احکام سے پرہیز کرنا چاہیے۔

تیسرا یہ کہ ماں باپ کو چاہیے کہ وہ اپنے قول پہ پکے رہیں اور بچے سے پوری صراحت سے کہہ دینا چاہیے کہ

"یہ کام تو انجام دے سکتا ہے اور وہ کام تجھے حتماً ترک کرنا چاہیے"
ماں باپ کو چاہیے کہ بے جا احساسات اور جذبات کو ایک طرف رکھ دیں۔ شک و شبہ سے اجتناب کریں تاکہ بچہ اپنی ذمہ داری کو سمجھے اور اپنے فریضہ کی ادائیگی میں شک نہ کرے

امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں،

بچپن میں کسی بچے کی ماں باپ سے کے حکم کے خلاف جسارت اور بے اعتنائی بڑا ہو کر اس کے سرکش اور نافرمان ہو جانے کا باعث بنتی ہے۔[1]

چوتھا یہ کہ ماں باپ کو چاہیے کہ آپس میں ہم آہنگ ہوں اور اختلاف سے سختی سے پرہیز کریں اور اپنے اختلافات سے بچے کو شک اور دو دلی میں مبتلا نہ کر دیں۔

---

[1] بحار، ج ۷۸، ص ۳۷۴

ضدی پن

سب بچوں میں کچھ نہ کچھ ضدی پن اور خود سری ہوتی ہے خصوصاً دو سال کی عمر میں۔ ضدی بچہ اصرار کرتا ہے کہ جو کچھ بھی اُس کے دل میں آئے انجام دے اور کوئی اس کے راستے میں حائل نہ ہو۔ اگر وہ اپنی خواہش کے مطابق کام نہ کر سکے تو پھر وہ روتا ہے چیختا چلاتا ہے تاکہ کوئی راہ نکل آئے۔ اپنے آپ کو زمین پر گھسیٹتا ہے۔ سر دیوار سے ٹکراتا ہے۔ شور مچاتا ہے۔ غصہ کرتا ہے اور کھانا چھوڑ دیتا ہے۔ برتن توڑتا ہے یہاں تک کہ کبھی ماں باپ یا بہن بھائی پر حملہ بھی کرتا ہے۔ اتنا شور مچاتا ہے کہ ماں باپ پر اس کو کامیابی حاصل ہو جائے اور وہ اپنا مقصد پالے۔ یہ بچپنے کی ایسی عادت ہے کہ کبھی کبھی تو نسبتاً بڑے بچوں میں بھی دیکھی جاتی ہے۔ اکثر ماں باپ بچوں کی اس عادت سے نالاں رہتے ہیں اور اس کا حل سوچتے رہتے ہیں۔ بچوں کے ضدی پن کے بارے میں ماں باپ عموماً ان دو طریقوں میں سے ایک اختیار کرتے ہیں۔

پہلا طریقہ: بعض ماں باپ کا یہ نظریہ ہے کہ بچے کی ضد کے مقابلے میں سخت ردِ عمل کا مظاہرہ کیا جائے اور اس کی خواہشات کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کیا جائے۔ ایسے ماں باپ کا کہنا ہے کہ یہ بچہ بہت خود سر اور ضدی ہو چکا ہے۔ اس کے مقابلے میں استقامت کا مظاہرہ کیا جانا چاہیے تاکہ یہ اپنے ضدی پن سے دستبردار ہو جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اس بچے کو ایک انچ بھی اپنا زور چلانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ وہ سختی، زور اور مار پیٹ کے ذریعے سے بچے کو روک دیتے ہیں اور اپنی خواہشات اس پر سوار کر دیتے ہیں۔ یعنی در حقیقت وہ

بچے کی ہٹ دھرمی کے جواب میں ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل درست نہیں ہے کیوں کہ اگرچہ انہوں نے مار پیٹ اور زور کے ذریعے بچے کو اس کی ضد سے پیچھے ہٹا دیا ہے اور چپ کروا دیا ہے لیکن دوسری طرف اس کی شخصیت پر بڑی کاری ضرب لگائی ہے۔

دو سال کی عمر شخصیت اور ارادے کے اظہار کی عمر ہے اور ضدی پن ارادے کی پختگی اور خود اعتمادی کا بنیادی جوہر ہے۔ بچے کی عقل اس عمر میں اتنی رشد یافتہ نہیں ہوتی کہ وہ اپنی خواہشات پر کنٹرول کر سکے اور ان کے نتائج کے بارے میں غور و فکر کر سکے۔ وہ سوچے سمجھے بغیر کسی کام کا ارادہ کر لیتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی خواہش کے مطابق عمل کیا جائے تا کہ اس کے وجود کا اظہار ہو سکے اور اس کی شخصیت نمایاں ہو سکے۔ اگر ماں باپ اس کی مخالفت کریں گے تو وہ گویا اس کی شخصیت کو مجروح کریں گے۔ ممکن ہے وہ ایک پُر سکون فرد بن جائے لیکن حیثیت اور ارادے سے عاری۔ جب بچہ یہ دیکھتا ہے کہ کوئی اس کی خواہش پوری نہیں کر رہا اور طاقت کے ذریعے اُسے روکا جا رہا ہے تو وہ مایوس اور بدگمان ہو جاتا ہے۔ اضطراب اور پریشانی کی یہی حالت اس میں باقی رہتی ہے البتہ اس بات کا امکان بھی ہے کہ اپنی خواہشات کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے وہ بڑا ہو کر خطرناک کاموں کا مرتکب ہو مثلاً قتل اور ظلم وغیرہ تا کہ اس ذریعے سے وہ اپنے وجود کا اظہار کر سکے اور اپنی شخصیت منوا سکے۔

دوسرا طریقہ: بعض پرورش کنندگان کا نظریہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے بچے کے دل کو راضی کرنا چاہیے۔ اور اس کی خواہش کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ اُسے اجازت دی جانا چاہیے کہ جو کام وہ چاہے انجام دے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ بچے کی ضد اور اصرار کے سامنے تسلیم محض ہونا چاہیے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ بچہ ہے اسے آزادی ملنی چاہیے جب بڑا ہو گا تو خود ہی ضد اور بہانے بنانے چھوڑ دے گا۔ یہ طریقہ بھی عیب سے خالی نہیں ہے۔

اولاً۔ بعض کام ایسے ہوتے ہیں کہ جو بڑے جانی یا مالی نقصان کے حامل ہوتے ہیں اور خود بچے کی یا دوسروں کی جان و مال کو خطرہ میں ڈال دیتے ہیں ایسے کاموں میں بچے کو آزادی دینا خلافِ عقل اور خلافِ وجدان ہے ہو سکتا ہے دو تین سالہ بچہ بڑی سیڑھی کے ذریعے اوپر

جانا چاہے کہ جس میں احتمال ہے وہ گر پڑے گا اور اس کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں گے ممکن ہے وہ چاہے کہ ماچس سے خود گیس جلائے کہ جس میں امکان ہے کہ وہ اپنے آپ کو اور پورے گھر کو جلا دے گا۔ ہو سکتا ہے وہ دوسروں کے احوال اور حقوق پر تجاوز کرنا چاہے یا دوسرے بچوں کو اذیت دینا چاہے۔ ایسے کاموں میں بچوں کو آزادی نہیں دی جا سکتی۔

ثانیاً۔ جو بچہ ہمیشہ مطلق العنان رہا ہو۔ ضد سے اور شور شرابے سے اپنے مقاصد حاصل کرتا رہا ہو، جس نے اپنے سامنے کسی کو ٹھہرتے نہ دیکھا ہو رفتہ رفتہ اس طریقے کا عادی ہو جاتا ہے اور ایک خود غرض اور ڈکٹیٹر بن جاتا ہے۔ اُسے لوگوں سے توقع ہوتی ہے کہ وہ بے چون وچرا اس کی خواہش پر عمل کریں اور اس کے طرز عمل اور کردار پر کوئی تنقید نہ کریں۔ اس نے بچپن میں اپنی خواہشات کے مقابلے میں کسی کو قیام کرتے نہیں دیکھا کہ وہ دوسروں کی خواہشات کا اعتنا کرے۔ اگر وہ دیکھے کہ زور زبردستی سے اپنی خواہشات کو سیراب کر سکے اور اپنے مقصد کو پالے تو بہت خوش ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ تر ایسا نہیں ہوتا کیوں کہ دوسرے تیار نہیں ہوتے کہ اس کی ڈکٹیٹری کو برداشت کریں۔ اس لحاظ سے وہ معاشرے سے مایوس ہو کر گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔ ہمیشہ آہ وزاری کرتا رہتا ہے۔ اپنے تئیں شکست خوردہ سمجھتا ہے اور لوگوں کو حق ناشناس سمجھتا ہے۔

اسلام ہٹ دھرمی کو بری صفات میں سے شمار کرتا ہے اور اس کی مذمت میں بہت سی حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔

نمونہ کے طور پر۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ہٹ دھرمی برائیوں کا سبب ہے" [۱]

امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا،

"ڈھٹائی عقلِ انسانی کو نقصان پہنچاتی ہے" [۲]

---

[۱] غرر الحکم، ص ۱۶

[۲] غرر الحکم، ص ۱۷

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

"ہٹ دھرمی جنگ اور دشمنی کا باعث ہے"[1]

حضرت علی علیہ السلام نے ہی فرمایا:

"ہٹ دھرمی کا نقصان انسان کی دنیا اور آخرت کے لیے سب سے زیادہ ہے"[2]

تیسرا طریقہ: بہترین روش اعتدال کو ملحوظ رکھنا ہے۔ یہ وہ طریقہ ہے کہ جس کے مطابق ماں باپ بچے کی خود سری کو عیب نہیں سمجھتے بلکہ اس کی استقامت اور اصرار کو اس کے وجود اور قوت ارادی کے اظہار کا وسیلہ جانتے ہیں نہ صرف یہ کہ اس کو ختم نہیں کرتے بلکہ تعلیم و تربیت کے لیے اسی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بچے کی خواہشوں کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ بے ضرر خواہشات کے ضمن میں بچے کو آزادی دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے میلان کے مطابق عمل کرے اور اس طرح اپنی قوت ارادی میں اضافہ کرے۔ اس کے بے ضرر یا کم ضرر کاموں میں زیادہ دخالت نہیں کرتے وہ بچے کے دوست بن جاتے ہیں اور کاموں کی ادائیگی میں اس کی راہنمائی کرتے ہیں۔

ایسی صورت میں بچے کو زیادہ تر کاموں میں آزادی حاصل ہوتی ہے اس طرح سے وہ اپنے ارادے کو مضبوط کر سکتا ہے اور اپنے وجود کا اظہار کر سکتا ہے۔ ماں باپ کے بارے میں وہ بھی اچھی رائے رکھتا ہے اور انھیں اپنے راستے میں حائل نہیں سمجھتا۔

لیکن خطرناک نقصان دہ اور خلاف اخلاق وضمیر کاموں میں نیز ناجائز امور میں اور دوسروں کے حقوق پر تجاوز کے معاملے میں بچے کے سامنے استقامت کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ذرا سی بھی ڈھیل نہیں دیتے وہ پوری بے نیازی سے اور صراحت سے بچے سے کہتے ہیں اس کام کو نہ کرنا۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ حتی الامکان اس کام سے روکنے کی وجہ اسے

---

[1] غرر الحکم، ص ۱۸

[2] غرر الحکم، ص ۱۰۴

بتائیں اور اسے مطمئن کریں اور اس کی توجہ کسی اور اچھے کام کی طرف موڑ دیں۔ بچہ چونکہ ماں باپ کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہے اور اس پر زیادہ پابندیاں نہیں ہوتیں زیادہ تر مان جاتا ہے اور اس کام کو چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن اگر وہ غلط کاموں کے بارے میں ضد کرے۔ شور شرابہ کرے۔ زمین پر پاؤں مارے تو آپ سختی سے اسے روک دیں۔ اور اس سلسلے میں کوئی ڈھیل نہ دیں۔ اس کے شور وشین اور رونے دھونے پر توجہ نہ دیں۔ اسے اس کے حال پر رہنے دیں تاکہ وہ سمجھے کہ دنیا میں ہر چیز کا کوئی حساب ہے کہ جو اس کے شور شرابے سے بدل نہیں سکتا۔ آپ کچھ صبر کریں وہ خود شور شرابے سے تھک ہار کر چپ کر جائے گا۔ بچے کو سمجھائیں کہ آپ کی نہ حقیقی نہ ہے۔ اسے سمجھائیں کہ زور اور خودسری سے زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔ دوسروں کے حقوق کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اس کی ہٹ دھرمی اور شور شرابے پر مار پیٹ شروع کر دیں۔ اور سختی سے اُسے چپ کرائیں کیونکہ اس طرح سے اُسے چپ تو کرایا جا سکتا ہے لیکن حتمی طور پر اس کی روح اور نفسیات پر اس کے برے اثرات باقی رہ جائیں گے کیوں کہ وہ آپ سے بدبین ہو جائے گا۔ اور آپ کو بھی ایک زیادتی کرنے والا اور ڈکٹیٹر سمجھے گا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے خلاف اس کے دل میں کینہ پیدا ہو جائے اور وہ انتقام لینے کی ٹھان لے۔ ہو سکتا ہے آپ کی آمریت کو اپنے لیے نمونہ بنا لے۔ اس بحث کے اختتام پر ضروری ہے کہ مربّی حضرات کی خدمت میں چند امور ذکر کیے جائیں۔

۱۔ جہاں تک ممکن ہو بچوں کو عمل کی آزادی دیں۔ ان کے امور میں زیادہ دخالت نہ کریں اور ہر وقت یہ کرو! یہ نہ کرو نہ کرتے رہیں بچہ کرسی، درخت یا چھوٹی سیڑھی کے ذریعے اوپر جانا چاہتا ہے آپ کہیں بیٹے گر جاؤ گے! وہ پھل کا چھلکا اتارنے لگے تو آپ کہیں بیٹا ہاتھ کو زخمی کر لو گے، وہ سماوار روشن کرنے لگے تو آپ کہیں جل جاؤ گے، وہ چائے ڈالنا چاہے تو آپ کہیں عینک توڑ دو گے، گھر میں کھیلنا چاہے تو کہیں شور نہ کرو۔ گلی میں جانا چاہے تو آپ کہیں سائیکل کے نیچے آ جاؤ گے۔

پھر یہ ننھا بچہ کیا کرے! آخر وہ بھی انسان ہے۔ اس کا بھی ارادہ ہے۔ وہ بھی اپنے وجود کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ جب آپ اس کے کاموں میں دخالت کریں گے وہ

خستہ حال ہو جائے گا اور اس کے اندر ایک ہٹ دھرمی اور خود سری کی کیفیت پیدا ہو جائے گی بچے کی ہٹ دھرمیوں کی ایک وجہ ماں باپ کی اس کے کاموں میں زیادہ دخالت ہے۔

۲۔ جب آپ کا بچہ ضد کرے تو کوشش کریں کہ اس کی ضد کی وجہ معلوم کریں اور اس کو دور کریں تاکہ وہ خود بخود مطمئن ہو جائے۔ اگر اسے بھوک لگی ہو تو کھانا دیں۔ اگر وہ تھکا ہوا ہے تو اسے سُلا دیں۔ اگر وہ گھر کے تنگ ماحول، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے شور اور مہمانوں کی وجہ سے تنگ آگیا ہے تو اس کے لیے آرام دہ ماحول فراہم کریں۔

۳۔ بچے کی توہین اور اسے سرزنش نہ کریں کیونکہ توہین اور سرزنش اُسے ضد بازی پہ ابھارتی ہے وہ اپنے آپ سے کہتا ہے کہ یہ میری توہین کرتے ہیں اور مجھے ملامت کرتے رہتے ہیں۔ میں بھی ان کے سامنے ڈٹ جاؤں گا اور ان سے انتقام لوں گا۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"سرزنش میں زیادتی ہٹ دھرمی کی آگ کو بھڑکاتی ہے"۔[1]

۴۔ کبھی کسی بچے پر اس کے بھائی بہن ظلم اور زیادتی کرتے ہیں اور اس کی کوئی حمایت نہیں کرتا یوں وہ ہٹ دھرمی اور سرکشی پہ اُتر آتا ہے اس صورت میں ماں باپ کو چاہیے کہ اس کی سرکشی کی وجہ معلوم کریں۔ اور اُسے دور کریں تا کہ وہ اسے چھوڑ دے۔

۵۔ اگر آپ کا بچہ ضد کرتا ہے اور آپ کو اُس کی وجہ معلوم نہیں ہوتی تو آپ اپنے آپ کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ خود آپ کہیں ضدی پن کا شکار تو نہیں ہیں۔ شاید آپ کا ضدی پن بچے کے ضدی پن کا باعث بنا ہو۔ ایسا بہت ہوتا ہے کہ بچے ماں باپ ہی کے ضدی پن کا مظہر ہوتے ہیں اور انہیں کی تقلید کرتے ہیں۔

ایک خاتون اپنی یادداشتوں میں لکھتی ہیں کہ مجھے یاد ہے بچپن میں ایک روز ہمارے ہاں مہمان آئے۔ میں نے کسی بات پہ ضد کی تو اس پہ مہمانوں کے سامنے

---

[1] تحف العقول، ص ۸۰

مجھے مار پڑی مجھے مہمانوں سے بہت شرمندگی ہوئی۔ میں نے بہت چیخ و پکار کی۔ امی مسلسل کہے جاتی تھیں چپ کر! بیٹی کا شور مچانا اچھا نہیں ہوتا۔ میں آرہی ہوں تمہیں چپ کرواتی ہوں۔ امی نے اس بارے میں بالکل نہ سوچا کہ میری ضد کی وجہ کیا ہے اور میں کیوں شور مچا رہی ہوں۔ وہ صرف یہ چاہتی تھیں کہ اس طرح کی باتوں سے مجھے چپ کروا دیں، جو مجھے اور بھی بری لگتی ہیں۔ لیکن میں نے بھی زیادہ شور مچایا۔ ماں نے اپنے تئیں اس کا بہترین حل سوچا۔ گڑیا کے جو کپڑے میں نے خود سیے تھے وہ اٹھا لائیں مجھے وہ جان سے زیادہ عزیز تھے۔ انھیں امی نے میرے سامنے آگ لگا دی۔ گویا میری ساری امیدیں ختم ہو گئیں۔ میں آگ کے شعلے کی طرف دیکھتی تھی اور آنسو بہاتی تھی۔ اس وحشیانہ واقعہ سے میرے دل میں ایک گرہ سی پڑ گئی کہ جسے میں آج تک بھلا نہیں سکی۔ اور اب بھی مجھے اس پر افسوس رہتا ہے اور کبھی کبھی میں اپنی امی سے کہتی ہوں۔۔۔۔۔۔

کام اور فرض کی ادائیگی

کام اور کوشش انسانی زندگی کی بنیاد ہیں ۔ کام کے ذریعے انسان روٹی کپڑا اور مکان مہیا کرتا ہے۔ کام اور محنت کے ذریعے زمین آباد ہوتی ہے ۔ اور لوگوں کے لیے آرام و آسائش کے اسباب فراہم ہوتے ہیں یہ اتنی صنعتیں اور حیران کن ایجادات انسانی کام اور محنت کا نتیجہ ہیں۔ یہ علم اور محنت ہے کہ جس نے موجودہ تمدن کو وجود بخشا ہے اور انسان کو یہ عظمت عطا کی ہے۔ ہر ملک کی ترقی اور پیش رفت اس ملک کے افراد کی محنت اور کوشش سے وابستہ ہے۔ اگر کسی ملک کے افراد مختلف حیلوں بہانوں سے کام کرنے سے بچیں۔ بالخصوص پیداواری کاموں سے بچیں تو وہ ملک خوشحال نہیں ہو سکتا ۔ ایسی قوم پیدا کرنے والی نہیں صرف صرف کرنے والی ہوگی اور وہ استعماری قوتوں کے ہاتھوں میں چلی جائے گی ۔ ہر فرد کی ترقی بھی اس کے علم، کام اور کوشش سے وابستہ ہے۔ دنیا کام اور محنت کا مقام ہے نہ کہ سستی اور تن پروری کا ۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے۔

"وَاَنْ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ؕ"

"انسان کے لیے جو کچھ بھی ہے وہ اس کی کوشش کا ماحصل ہے" [1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

"مَلْعُوْنٌ مَنْ اَلْقٰی کَلَّہٗ عَلَی النَّاسِ"

---

[1] سورہ نجم، آیہ ۳۹

"وہ جو اپنا بوجھ دوسروں پہ ڈالے رکھے وہ ملعون ہے"۔[1]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ

"عبادت کے ستّر (۷۰) حصے ہیں۔ جن میں سب سے افضل رزق حلال کے حصول کی کوشش ہے"۔[2]

حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"میرے دوستوں اور شیعوں کو میرا سلام پہنچانا! اور ان سے کہنا! تقویٰ کو نہ چھوڑنا اور اپنی آخرت کے لیے توشہ تیار کرنا۔ خدا کی قسم میں صرف اس چیز کا تمہیں حکم دیتا ہوں کہ جس پہ خود عمل کرتا ہوں۔ محنت اور کوشش کریں۔ نمازِ صبح کے بعد جلد کام پہ نکل جائیں اور رزقِ حلال حاصل کریں۔ کام کریں۔ خدا تمہیں رزق دے گا اور تمہاری مدد کرے گا"۔[3]

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"جو شخص دنیاوی امور میں سست اور کاہل ہو وہ مجھے بُرا لگتا ہے۔ جو شخص محنت و مشقت میں سست ہو وہ امورِ آخرت میں بھی سست ہوگا"۔[4]

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"جو شخص اپنے خاندان کی روزی کے لیے زحمت اٹھاتا ہے اسے جہاد کا ثواب ملے گا"۔[5]

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

---

[1] کافی، ج ۵، ص ۷۲

[2] کافی، ج ۵، ص ۷۸

[3] کافی، ج ۵، ص ۷۸

[4] کافی، ج ۵، ص ۸۵

[5] کافی، ج ۵، ص ۸۸

"کسان انسانوں کے لیے خدا کے خزانے ہیں۔ وہ اچھا بیج بوتے ہیں اور خدا اس بیج کو اُگاتا ہے۔ قیامت میں کسانوں کا بہترین مقام ہے۔ اور انہیں "مبارکین" کے نام سے پکارا جائے گا"۔ ؎۱

ہر انسان دوسروں کی محنت اور کام سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ دوسروں کی محنت اور زحمت کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا اس کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی طاقت کے مطابق کام اور محنت کرے اور دوسرے انسانوں کو بھی فائدہ پہنچائے۔ مزدور بہترین اور شریف ترین انسان ہیں جو لوگ خود طاقت رکھتے ہیں لیکن کام نہیں کرتے اور دوسروں کی محنت پہ پلتے ہیں وہ پروردگار عالم کی رحمت سے دور ہیں جن ماں باپ کو اپنی اولاد کی سعادت اور خوش بختی مطلوب ہے اور جنہیں اپنے ملک کی خوشحالی اور ترقی پسند ہے وہ اپنے تربیتی پروگرام میں بچوں کو محنت کرنا بھی سکھائیں۔ اپنے بچوں کی اس طرح سے تربیت کریں کہ وہ بچپن ہی سے کام کرنے کے شوقین اور عادی ہو جائیں تاکہ بڑے ہو کر نہ صرف یہ کہ وہ کام کرنے کو ننگ و عار نہ سمجھیں بلکہ اس پر افتخار کریں۔ بہت سے ماں باپ زندگی کے اس انتہائی اہم موضوع سے غفلت برتتے ہیں اور اس طرف بالکل توجہ نہیں دیتے یہاں تک کہ ایک عرصے تک وہ بچوں کے کام خود انجام دیتے ہیں اور انھیں کوئی ذمہ داری نہیں سونپتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح سے وہ اپنی اولاد کی خدمت کر رہے ہیں جب کہ یہ خدمت نہیں بلکہ بہت بڑی خیانت ہے نہ بچے سے بھی ملک و قوم سے بھی کبھی وہ یہ بہانہ کرتے ہیں کہ کام کرنے میں جلدی نہیں کرنا چاہیے کام کرنا بچے کے لیے دشوار ہے۔ بڑا ہو گا تو خود ہی کام کے پیچھے چل پڑے گا۔ جب کہ ان کی یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ جو کام بچے کی عمر اور طاقت کے مطابق ہو وہ بچے کی طبیعت کے مخالف نہیں ہے جب کہ اس کی جبلت اور ضرورت کے مطابق ہے۔ اگر انسان کو بچپن ہی سے کام کرنے کی عادت نہ پڑے تو بڑا ہو کر کام کرنے میں دیر بھی لگے گی اور اس کے لیے دشوار بھی ہو گا۔ اگر صحیح تربیت کی جائے تو کام کرنا بچے کے لیے پسندیدہ بھی ہو گا اور لذت بخش بھی۔

؎۱۔ کافی۔ ج ۵، ص ۲۶۱

ایسے ماں باپ کبھی کہتے ہیں! اتنا حوصلہ کس میں ہے کہ انتظار کرے کہ بچہ اپنا کام خود انجام دے ہم اس کے لیے زیادہ جلدی کام کرکے فارغ ہو سکتے ہیں۔ بڑا ہوگا تو خود کام کرتا رہے گا۔

ان نادان ماں باپ کو اگر واقعاً اپنی اولاد سے محبت ہو تو وہ ایسے بے جا بہانے بنا کر اپنے آپ کو اولاد کی تربیت سے بری الذمہ قرار نہ دیں اور سست، کاہل اور بے کار افراد معاشرے میں بطور یادگار نہ چھوڑیں۔

فرض شناس اور سمجھ دار ماں باپ بچے کی عمر، جسمانی قوت اور اس کے فہم و شعور کو مدّنظر رکھتے ہوئے کوئی کام اس کے ذمے لگاتے ہیں نیز اس کام کی انجام دہی میں اس کی مدد کرتے ہیں۔ مثلاً تین سالہ بچے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنا جوتا اور جرابیں خود پہنو اور خود اتارو، اپنی نیکر خود پہنو نمک دانی، چمچہ اور کانٹا لاؤ۔ جب بچہ کچھ بڑا ہو جائے تو تدریجاً بڑے کام اس کے ذمے لگائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً وہ اپنا بستر خود بچھائے اور خود ہی تہ کرے، کوڑا کرکٹ کا برتن خالی کرکے لائے، کھانا پکائے، دسترخوان لگائے اور اٹھائے، برتن دھوئے، کمروں میں جھاڑو دے، مخصوص اوقات میں اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی حفاظت کرے۔ باغیچے میں پھولوں اور درختوں کو پانی دے، پالتو جانوروں کو پانی اور کھانا دے۔ روٹی، سبزی، دودھ، دہی، سرف، صابن، ٹوتھ پیسٹ خرید کر لائے، کھیل کا سامان صاف کرے اور سلیقے سے رکھے۔ ایسے کام بچے آرام سے انجام بھی دے سکتے ہیں اور انہیں اپنے ذمہ بھی لے سکتے ہیں۔

جب بچے کچھ اور بڑے ہو جائیں تو کچھ مشکل تر کام ان کے ذمے لگائے جا سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں ماں باپ کے لیے چند باتیں ضروری ہیں:

۱۔ بچے کی عمر اور بدنی قوت کو مدّنظر رکھتے ہوئے، جب بھی وہ دیکھیں کہ بچہ کسی کام کی استعداد رکھتا ہے تو وہ کام اس کے ذمے لگا دیں۔ بالخصوص جب بچہ خود کوئی کام کرنے کی خواہش کرے۔ خاص طور پہ وہ کام جو خود بچے کی ذات سے مربوط ہیں تاکہ

وہ بچپن ہی سے کام کرنے کا عادی ہو جائے اور سست اور آرام طلب فرد نہ بن جائے۔

۲۔ بچے کی قوت اور حوصلے کو پیش نظر رکھا جانا چاہیے اور مشکل اور زیادہ سخت کام اس کے ذمے نہ لگایا جائے۔ کیوں کہ ممکن ہے کہ ایسا کرنے سے وہ کام سے بیزار ہو جائے اور آئندہ کام سے جی چرائے۔ اگر کام تھکا دینے والا ہو تو ہو سکتا ہے بچہ سرکشی کا مظاہرہ کرے۔

۳۔ کوشش کریں کہ کام بچے کے سپرد کرتے وقت افہام و تفہیم سے کام لیں۔ اسے سمجھائیں کہ گھر کے کام خود بخود انجام نہیں پاتے۔ باپ محنت و مشقت کر کے گھر کا خرچ چلاتا ہے، ماں بھی گھریلو کام انجام دیتی ہے، تم بھی اسی خاندان کے ایک فرد ہو، گھر کے کام چلانے کے لیے ہمت کرو اور اپنی طاقت کے مطابق ان کاموں میں کمک کرو۔ ایسے مواقع پر حتی المقدور زور اور جبر سے پرہیز کرنا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ غلط اور اندھی اطاعت کا عادی ہو جائے۔

۴۔ اگر ممکن ہو تو کسی ذمہ داری کو قبول کرنے کے لیے حق انتخاب بچے کو دیں مثلاً آپ کہہ سکتے ہیں اگر تو چاہے تو برتن دھوئے چاہے تو کمرہ صاف کرے۔

۵۔ کام کی حدود اور مقدار بچوں پہ بالکل واضح کریں تاکہ وہ اپنی ذمہ داری کو سمجھیں اور اس میں شک و شبہ میں نہ پڑیں۔

۶۔ جن بچوں میں صلاحیت ہو ان کے لیے مستقل کام معین کر دیں۔ اس طرح سے کہ وہ متوجہ رہیں اور ان میں احساس ذمہ داری پیدا ہو۔ مثلاً کسی ایک بچے سے آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے دسترخوان پہ ہمیشہ سلاد ہونا چاہیے۔ سلاد خریدنا تیرے ذمے ہے۔ سرف، صابن اور ٹوتھ پیسٹ خریدنا بھی تیرے ذمہ ہے۔ ہمیشہ توجہ رکھنا کہ گھر سرف، صابن اور ٹوتھ پیسٹ سے خالی نہ ہو۔

۷۔ کوشش کریں کہ حتی القدور بچے کے ذمے ایسا کام کریں جو اس کی طبیعت اور پسند کے مطابق ہو تاکہ وہ اپنا کام خوشی خوشی انجام دے۔ البتہ بعض استثنائی مواقع

پڑا سے طبیعت کے خلاف کام بھی کرنا چاہیے۔ اور چاہیے کہ وہ ایسے کام بھی ناک منہ چڑھائے بغیر انجام دے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"گھر میں سب کام کرنے والوں کے لیے ایک کام معین کرو اور ہر کسی کی ذمہ داری اس کے سپرد کر دو جب وہ اپنی ذمہ داری سمجھ لیں گے تو پھر یہ نہیں سوچیں گے کہ یہ کام کسی دوسرے کو کرنا ہے" [۱]

۸۔ اگر آپ کے گھر میں متعدد بچے ہوں تو تقسیم کار میں عدالت کو ملحوظ رکھیں تاکہ لڑائی جھگڑا نہ ہو اور وہ خوشی خوشی اپنا کام انجام دیں۔

۹۔ بچوں کو کام کرنے پر مائل کرنے کے لیے آپ ان کے ساتھ مل جل کر کام کر سکتے ہیں کیونکہ بچوں کو یہ بات اچھی لگتی ہے کہ وہ بڑوں کے ساتھ مل کر کام کریں۔

۱۰۔ اگر ماں باپ کے درمیان گھر کا نظام چلانے میں ہم آہنگی اور تعاون ہو تو وہ اپنی اولاد کے لیے بہترین نمونہ ہیں اور اس طرح سے وہ بچوں میں ذمہ داری قبول کرنے کا شوق پیدا کر سکتے ہیں۔

۱۱۔ جب بچے بڑے ہو جائیں اور وہ کوئی ایسا کام کر سکیں جو مادی اعتبار سے مفید ہو تو چھٹیوں کے دنوں میں ان کے لیے کوئی کام اور ممکن ہو تو کوئی پیداواری کام ان کے لیے مہیا کریں اور اس کی انجام دہی میں انھیں تشویق کریں۔ اس طرح سے انہیں کام کرنے کی عادت بھی پڑے گی اور گھر کے خرچ میں وہ مدد کر سکیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ قوم و ملک کی خدمت بھی کر سکیں گے۔ انہیں سمجھائیں کہ کام کرنے میں کوئی عار نہیں بلکہ یہ باعث افتخار و شرف ہے۔ البتہ ان پر زیادہ دباؤ بھی نہ ڈالیں۔ انہیں تفریح اور کھیل کا بھی موقع دیں یہ درست نہیں کہ ماں باپ کہیں ہم مالی اعتبار سے خوش حال ہیں اور اپنے بچوں سے کام لینے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اس صورت میں

---

[۱] غرر الحکم ص ۱۴۳

تو وہ آوارہ گرد اور مفت خور بن جائیں گے۔

آخر میں ہم ایک بار پھر یاد دلا دیں کہ کام کرنے کے شوق اور محبت کی بنیاد بچپن میں رکھی جانا چاہیے تاکہ یہ بات بچے کی طبیعت میں رچ بس جائے اور وہ اس کا عادی ہو جائے ورنہ بعد میں یہ کام دشوار ہو جائے گا۔ فرض شناس ماں باپ کو چاہیے کہ اس اہم فرض سے غفلت نہ کریں۔

ایک عورت اپنی یادداشتوں میں لکھتی ہے۔

"میں بہت سست، بے حوصلہ اور ضدی عورت ہوں۔ بے چین اور ڈری ڈری رہتی ہوں۔ میرے معدے میں ورم ہے۔ کچھ کام کرنے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ کام کرنا تو میرے لیے بہت مشکل ہے گھر کا نظام سنبھالنے اور کھانا پکانے سے عاجز ہوں۔ اسی وجہ سے شوہر اور ساس سے ہمیشہ میری جنگ رہتی ہے۔ اور ان سب بدبختیوں کا سبب میری ماں ہے۔ وہ بہت مہربان، باصبر، اور باحوصلہ عورت تھیں۔ میں ایک گھریلو لڑکی تھی۔ لیکن امی کوئی کام میرے سپرد نہیں کرتی تھیں۔ گھر کے سب کام خود انجام دیتی تھیں انہوں نے مجھے کام کرنا اور گھر کا نظام چلانا نہ سکھایا۔ کوئی ذمہ داری مجھ پر نہ ڈالی کہ مجھے بھی کوئی ذمہ داری نبھانے کی عادت پڑتی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں تھک جاؤں اور اپنے تئیں وہ میرے بارے میں اچھا سوچتی تھیں۔ لیکن اس بات کی طرف ان کی توجہ نہ تھی کہ مجھے آئندہ زندگی بھی گزارنا ہے اور مجھے بھی ایک گھر کا نظام چلانا ہے۔

ایک صاحبہ اپنے ایک خط میں لکھتی ہیں:

..... میں گھر کی سب سے بڑی بیٹی ہوں۔ اپنی زندگی سے پوری طرح مطمئن ہوں اور کسی قسم کی کمی محسوس نہیں کرتی۔ بخیل اور حاسد نہیں ہوں۔ دوسروں کے لیے مہربان اور ہمدرد ہوں۔ دنیا کے زر و زیور کی میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں۔ سب کچھ کرنا جانتی ہوں۔ زندگی کے معاملات احسن طریقے سے نبھاتی ہوں۔ مجھے کسی قسم کا کوئی غم نہیں ہے۔ ایک صاف ستھری، پرسکون اور آرام دہ زندگی بسر کر رہی ہوں۔ میں اپنے ماں باپ کی شکر گزار ہوں کیوں کہ یہ انہی کی علاقائی

تربیت کا نتیجہ ہے۔

جب میرے ابو گھر میں داخل ہوتے تو مجھے پکارتے۔ جو کچھ لاتے مجھے تھما دیتے۔ زیادہ پیسے لاتے تو میرے سپرد کر دیتے کہ سیف میں رکھ دوں۔ اگر ان کا بٹن ٹوٹ گیا ہوتا یا ان کے لباس کو استری یا سلائی کی ضرورت ہوتی تو مجھے دے دیتے تاکہ میں یہ کام انجام دوں۔ جب میں وہ کام کر دیتی تو مجھے شاباش دیتے۔

ایک روز میں نے ان کا لباس خوب اچھے طریقے سے سیا وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے: میں تمہارے لیے ایک سلائی مشین لاؤں گا۔

چند ہی روز بعد انہوں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور میرے لیے سلائی مشین لے آئے۔ اس دن سے سلائی کا کام میرے ذمے ہو گیا۔ میری امی قیمتی کپڑا مجھے دیتیں اور کہتیں: جاؤ اسے سیو، اگر خراب ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ٹھیک ہو جائے گا۔

میری امی چونکہ مجھے اطمینان دلاتی تھیں لہٰذا مجھ میں خود اعتمادی بڑھ گئی۔ میں کوشش کرتی کہ کام اچھے طریقے سے انجام دوں۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے کبھی کوئی کپڑا خراب کیا ہو۔

خلاصہ یہ کہ میں اپنے ماں باپ کی توجہ اور تشویق کی وجہ سے تمام کام کرنا سیکھ گئی۔ کام کرنے اور ذمہ داری نبھانے کی عادی ہو گئی۔

میرا ارادہ ہے کہ میں اپنی اولاد کی بھی اسی طرح تربیت کروں گی۔

راستگوئی

جھوٹ بولنا ایک انتہائی بُری صفت ہے اور گناہان کبیرہ میں ہے۔ دنیا کی تمام قومیں اور ملتیں، جھوٹ بولنے کی مذمت کرتی ہیں۔ اور جھوٹ بولنے والے کو پست اور گھٹیا قرار دیتی ہیں۔ جھوٹ بولنے والے شخص کا دنیا والوں کی نظر میں کوئی عزت و اعتبار نہیں ہوتا۔ ایک شریف اور اچھا شخص جھوٹ نہیں بولتا۔ اسلام نے بھی اس بُری صفت کی مذمت کی ہے۔ اور اسے گناہ کبیرہ اور حرام قرار دیا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں،

"جھوٹ خرابیٔ ایمان کی بنیاد ہے" [۱]

حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں؛

کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا جو زیادہ جھوٹ بولتا ہے اس کی کوئی عزت نہیں ہوتی [۲]

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں؛

"کوئی کام جھوٹ سے بڑھ کے گھٹیا نہیں [۳]

---

[۱] اصول کافی، ج ۲، ص ۳۳۹

[۲] اصول کافی، ج ۲، ص ۳۴۱

[۳] مستدرک، ج ۲، ص ۱۰۰

اللہ کے سب نبیوں اور سب دینی رہنماؤں نے لوگوں کو سچائی کی دعوت دی ہے۔ سچ ایک فطری اور طبیعی چیز ہے۔ اور انسان کی سرشت کا حصہ ہے سب سچ اور سچے کو پسند کرتے ہیں۔ اور جھوٹے سے نفرت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جھوٹ بولنے والا شخص بھی ایسا ہی ہے۔ اگر بچے کو اس کے حال پہ چھوڑ دیا جائے تو فطری طور پر اُس کی تربیت ایسی ہوگی کہ وہ سچا ہوگا۔ یہ تو خارجی عوامل اور اسباب ہیں کہ جو اسے خداداد فطرت سے منحرف کر دیتے ہیں اور اُسے دروغ گوئی کی طرف لے جاتے ہیں۔ جھوٹ بولنا ایک ننھے بچے سے اصلاً میل نہیں کھاتا۔ بعد ازاں اس بچے منحرف ہو جائے اور جھوٹ بولنے کا عادی بن جائے تو بڑے ہو کر یہ عادت ترک کرنا اس کیلئے دشوار ہوگا اور زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ اس سے دستبردار نہیں ہوگا پھر اس پر نہ کوئی آیت اثر کرے گی نہ روایت اور نہ وعظ و نصیحت۔

ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچپن ہی سے اس بات کی فکر کریں کہ ان کی اولاد سچی ہو۔ جھوٹ کے علل و اسباب کو روکیں اور سچائی کہ جو ان کی سرشت میں شامل ہے اس کی پرورش کریں۔ سچائی کی تربیت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور بڑے ہونے پہ ٹال دینا چاہیے۔

جو ماں باپ اپنی اولاد کی تربیت کے خواہش مند ہیں اور احساس ذمہ داری رکھتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ مندرجہ ذیل امور کی طرف توجہ فرمائیں۔

ا۔ بچے کی تربیت پر اثر انداز ہونے والی ایک نہایت اہم چیز خاندان کا ماحول ہے۔ خاندان کے ماحول میں بچہ پروان چڑھتا ہے اور وہ ماں باپ سے اور ساتھ رہنے والوں سے اخلاق سیکھتا ہے اور ان کی پیروی کرتا ہے۔ اگر گھر کا ماحول سچائی اور درستی پہ مبنی ہو، ماں باپ اور دیگر افراد صداقت اور سچائی سے ایک دوسرے کے ساتھ پیش آنے والے ہوں تو ان کے بچے بھی یہی سیکھیں گے۔ اس کے برعکس اگر گھر کا ماحول ہی جھوٹ اور دروغ گوئی پر مبنی ہو، ماں باپ ایک دوسرے سے اپنی اولاد سے اور دیگر افراد سے جھوٹ بولتے ہوں۔ بے گناہ بچے جو ایسے ماحول میں پرورش پائیں گے یہی بری عادت ماں باپ سے سیکھیں گے اور دروغ گو بن جائیں گے۔ جن بچوں کے کان جھوٹ سے آشنا ہو گئے ہوں اور جو ہر روز نہ

ماں باپ سے دروغ گوئی کے مظاہر دیکھتے ہوں ان سے کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ سچے اور صادق پروان چڑھیں۔ ایسے ماحول میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ جھوٹے اور فریبی شخص کے علاوہ کچھ تربیت کرے۔ ایسا زہریلا ماحول ہی ہے کہ جو ایک حساس اور اثرات قبول کرنے والے بچے کی فطرت کو سچائی سے منحرف کر دیتا ہے اور دروغ گوئی کا عادی بنا دیتا ہے۔ بعض نادان ماں باپ نہ صرف یہ کہ خود جھوٹ بولتے ہیں بلکہ اپنے بچوں کو بھی جھوٹ بولنے کی تلقین کرتے ہیں۔ باپ گھر پہ ہے لیکن بچے کو کہتا ہے فلاں شخص سے کہو ابو گھر پہ نہیں ہیں۔ بچہ جو ٹھیک ٹھاک تھا اور اس نے گھر کا کام نہیں کیا باپ اس سے کہتا ہے استاد سے کہنا میں بیمار تھا۔ ایسے سینکڑوں جھوٹ ہیں جن کا بعض گھروں میں ہر روز تکرار ہوتا ہے۔ ایسے نادان ماں باپ اپنے بچوں سے بہت بڑی خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جھوٹ بولنا گناہ ہے لیکن جھوٹ سکھانا اس سے کہیں بڑا گناہ ہے۔ جھوٹے ماں باپ جھوٹ بولنے کی سزا کے علاوہ بھی بہت بڑی سزا پائیں گے اور وہ ہے جھوٹ بولنے کی تربیت دینا

ماں باپ کہ جو خاندان کے سرپرست ہوتے ہیں وہ جھوٹ بولیں تو یہ کوئی معمولی گناہ نہیں ہے بلکہ بہت بڑا گناہ ہے اس کے ساتھ بہت بڑا گناہ منسلک ہے اور وہ ہے بچوں کو جھوٹ سکھانا۔ ایسے ماں باپ نہ صرف گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور انہیں اس کی سزا ملے گی بلکہ وہ اپنے معصوم بچوں کے ساتھ بھی ایک بہت بڑی خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جب کہ یہ بچے ان کے پاس اللہ کی امانت ہیں۔ اور یہ خیانت ان کی معاشرے کے ساتھ بھی ہے۔ ایسے ماں باپ ہی ہیں جو ایک جھوٹے اور فریب کار معاشرے کو وجود دیتے ہیں۔

لہٰذا جو ماں باپ چاہتے ہیں ان کے بچے سچے ہوں ان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ خود راست گوئی اختیار کریں اور اپنی اولاد کے لیے بہترین ماحول فراہم کریں اور ان کے لیے نمونہ عمل بنیں۔

رسل لکھتا ہے

اگر آپ چاہتے ہیں کہ بچے جھوٹ بولنا نہ سیکھیں تو اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ بڑے پوری توجہ سے ہمیشہ بچوں کے سامنے سچائی

اختیار کریں "۔[1]

اے کاش بارسل کہتا کہ:!

بچوں کے سامنے بھی اور ہر کسی کے سامنے بھی سچائی اختیار کریں۔

کیونکہ بچوں کی پاک فطرت ہر جھوٹ سے متاثر ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ مخفی جھوٹ بھی جلد ان کے سامنے آشکار ہو جاتے ہیں۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

" لوگوں کو بغیر زبان کے اچھائی کی طرف دعوت دیں لوگ آپ سے تقویٰ، محنت ، نماز، نیکی دیکھیں اور اس طرح سے ان کے لیے ایک نمونہ عمل مہیا ہو جائے "۔[2]

۲۔ بچہ فطری طور پر دروغ گو نہیں ہوتا بلکہ اس کی فطرت اولیہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ راستگو ہو۔ اس کے جھوٹ بولنے کے لیے کسی سبب کی ضرورت ہے۔ اگر ماں باپ جھوٹ بولنے کے علل و اسباب پہچان لیں اور ان کی روک تھام کریں تو بچہ طبعاً راست گو ہو گا۔ ایک سبب جو بچے کو جھوٹ بولنے پر اُبھارتا ہے وہ ماں باپ کی مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ کا خطرہ ہے مثلاً بچے نے کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا۔ ماں باپ سے ڈرتا ہے کہیں اُسے ماریں نہ۔ لہٰذا جب اس سے پوچھے کہ شیشہ تم نے توڑا ہے تو جواب دیتا ہے نہیں! مجھے بالکل نہیں پتہ یا پھر شیشہ توڑنے کا الزام کسی دوسرے پر لگا دیتا ہے۔ مثلاً کہتا ہے کہ میں نے دیکھا ہے کہ حسن نے شیشے کو پتھر مارا ہے واضح ہے کہ اس بچے کے جھوٹ بولنے کی وجہ اس کا ماں باپ سے خوف ہے۔ اگر ماں باپ سمجھدار، ہوشمند اور منصف مزاج ہوں اور بچوں کی تربیت کے لیے انہوں نے صحیح حکمت عملی اپنائی ہو تو ان میں ایسا خوف پیدا نہیں ہو گا کہ جس کی وجہ سے وہ جھوٹ بولیں اور پھر تدریجاً جھوٹ بولنے کی انہیں عادت

---

[1] در تربیت ۔ ص ۱۴۸

[2] اصول کافی ، ج ۲ ، ص ۷۸

پڑ جائے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے شیشہ سہواً اور بلاارادہ ٹوٹ گیا ہو اس صورت میں بچہ تنبیہ اور سرزنش کا مستحق نہیں ہے۔ یہ تو کئی دفعہ ماں باپ کے ساتھ بھی پیش آیا ہوگا کہ شیشہ ان سے غیر ارادی طور پر ٹوٹ گیا ہو اور اس صورت میں انہوں نے اپنے آپ کو مجرم نہیں سمجھا ہوگا۔ پھر بیچارے بچے کو وہ کیوں مجرم سمجھتے ہیں اور اس پر کیوں غصہ جھاڑتے ہیں! اور اگر شیشہ کم توجہی اور بے احتیاطی کی وجہ سے ٹوٹ گیا ہے تو ماں باپ کو چاہیے کہ نرمی سے اس کو نصیحت کریں۔ اور سمجھائیں اور اُسے کہیں کہ وہ اپنے کاموں میں توجہ اور احتیاط سے کام لے تاکہ اس طرح کے واقعات پیش نہ آئیں۔

اس صورت میں بھی بچہ مار پیٹ اور ملامت کا مستحق نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے وہ خوف زدہ ہو کر جھوٹ کا سہارا لے۔ اور اگر اس نے شیشہ عمداً توڑا ہے اور اس کے لیے اسی نے سرکشی اور ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا ہے پھر بھی مار پیٹ اور سرزنش مسئلے کا حل نہیں ہے۔ کیونکہ مار پیٹ اور ڈانٹ ڈپٹ سے بچے کی تربیت نہیں ہو سکتی۔ اور نہ اس طرح سے اسے خرابیوں اور ضد بازیوں سے روکا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ماں باپ کو اس امر کی طرف خیال رکھنا چاہیے کہ بچہ فطری اعتبار سے شر دوست اور بدجنس نہیں ہوتا۔ اس کی شرارت اور ضد کا یقیناً کوئی خارجی سبب موجود ہے۔ لہٰذا کوشش اور تحقیق کرنی چاہیے تاکہ شیشے توڑنے کا اصل سبب اور وجہ معلوم کی جائے۔ جب سبب دور ہو جائے گا تو پھر اس طرح کے کاموں کی تکرار نہیں ہوگی۔ مثلاً ہو سکتا ہے اس کی تحقیر اور توہین کی گئی ہو۔ ہو سکتا ہے اس کی طرف کم توجہ دی جاتی ہو۔ ہو سکتا ہے ماں باپ کی سرد مہری کا شکار ہو، ہو سکتا ہے ماں باپ یا کسی اور نے اس پہ ظلم کیا ہو۔ ہو سکتا ہے اس سے غیر مساویانہ سلوک برتا گیا ہو۔ ہو سکتا ہے ایسی ہی کسی وجہ سے بچے کے اندر ضد اور سرکشی پیدا ہو گئی ہو۔ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ شیشہ اس نفسیاتی کیفیت یا احساس کمتری کی وجہ سے یا دوسروں کی توجہ اپنی طرف کرنے کے لیے توڑا ہو یا ایسے ہی کسی سبب سے اُس نے کوئی اور غلط کام سرانجام دیا ہو۔ اگر ماں باپ اس کے غلط کام کی نفسیاتی وجہ برطرف کر دیں تو بچہ بھی غلط کام اور سرکشی چھوڑ دے گا تو پھر ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جائے گی۔ لہٰذا ایسے موقع پہ بھی مار پیٹ اور ڈانٹ

ڈپٹ کا خوف نہیں ہو گا کہ بچے کو جس کی وجہ سے جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔

۱۲۔ اگر آپ کو معلوم ہو کہ آپ کے بچے نے کوئی غلط کام کیا ہے اور آپ اس کی راہنمائی کرنا چاہیں تو اس سے اعتراف جرم کرانے کے لیے ایک سخت گیر اور بد تمیز پولیس والے کی طرح بازپرس اور سوال نہ کریں ہو سکتا ہے وہ اپنی عزت بچانے کے لیے حقیقت چھپائے اور جھوٹ بولے۔ ایسے موقع پر بہتر ہے کہ بغیر سوال و جواب کے اس سے کہیں مثلاً اس سے کہیں مجھے معلوم ہے کہ جو کتاب تم اپنے دوست سے امانتاً لے کر آئے تھے ابھی تم نے اسے واپس نہیں کی یہ اچھا نہیں ہے! لوگوں کی امانت مقرر موقع پر انہیں واپس کرنا چاہیے۔ اپنے دوست کی کتاب فوراً اسے لوٹا دو اور اس سے معذرت کرو۔

۱۳۔ بچہ کو ایسی دھمکی ہرگز نہ دیں کہ جسے انجام دینے کا آپ کا ارادہ نہ ہو۔ مثلاً اس سے نہ کہیے کہ تو نے فلاں کام کیا تو تجھے مار ڈالوں گا یا پیٹوں گا یا پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ یا تجھے گھر سے نکال دوں گا یا تجھے فلاں کے ہاں دعوت پہ ساتھ نہ لے جاؤں گا۔ کیوں کہ ایسی جھوٹی دھمکیوں سے آپ بچے کو جھوٹ بولنا سکھائیں گے۔ آپ کو چاہیے کہ بچے سے وہی بات کریں جسے آپ انجام دینا چاہتے ہیں۔ اور جس کا انجام دینا درست بھی ہے۔

۱۴۔ جو ماں باپ اپنی اولاد سے سختی کرتے ہیں اور ان کی طاقت اور صلاحیت سے زیادہ ان سے توقعات رکھتے ہیں ہو سکتا ہے وہ اس طرح سے بچوں کو جھوٹ کی طرف دھکیل دیں۔ مثلاً اگر وہ جانتے ہوں کہ ان کا بچہ پڑھنے کی استعداد نہیں رکھتا اور یہ اس سے توقع رکھتے ہوں کہ مستقل بہترین نمبر لے کر آئے بلکہ کلاس میں فرسٹ آئے ہر روز اس سے پوچھتے رہتے ہوں کہ کتنے نمبر لیے ہیں اور پھر اُسے ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں۔ بچہ میں چونکہ یہ استعداد نہیں ہے وہ جتنی بھی کوشش کرتا ہے ماں باپ کی توقع کے مطابق نمبر نہیں لا پاتا۔ بچہ چونکہ چاہتا ہے ماں باپ کی خوشنودی حاصل کرے اور ان کی ڈانٹ ڈپٹ سے ڈرتا ہے تو وہ مجبور ہو جاتا ہے کہ کبھی کبھی جھوٹ بولے یا کہے کہ امتحان کے موقع پہ میرے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ میں اچھے طریقے سے امتحان نہیں دے سکا۔ یا کہتا ہے میرے کلاس فیلو نے ایسی باتیں کہیں جس سے میرے حواس کھو گئے، یا کہتا ہے اُستاد کو مجھ سے غرض تھی

اس لیے اس نے مجھے اچھے نمبر نہیں دیے۔ یا کہتا ہے آج میں نے پورے سو نمبر لیے ہیں۔

اگر اس بچے کے ماں باپ اُس کی صلاحیت اور طاقت کو سمجھ لیتے اور اس سے بے جا توقعات نہ رکھتے تو اسے دروغ گوئی پر آمادہ نہ کرتے اور اس طرح اسے رفتہ رفتہ جھوٹ بولنے کی عادت نہ پڑتی۔

۶۔ بعض ماں باپ جب اپنے ننھے بچے سے کوئی بُرا کام دیکھتے ہیں تو اس کو بری الذمہ قرار دیتے ہیں اور یہ بُرا کام دوسروں کے ذمے لگا دیتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات حیوانات اور جمادات پر الزام دھرنے لگتے ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ حسن تو اچھا بچہ ہے اس نے یہ کام نہیں کیا۔ یہ کسی بلی چوہے نے کیا ہے۔ ہمسایے کے بچے نے کیا ہے یا کسی درخت نے کیا ہے گندی بلی نے کیوں یہ کام کیا ہے۔

یہ ناداں ماں باپ اپنے تئیں اچھا کام کر رہے ہوتے ہیں کہتے ہیں بہتر ہے بچے کے سامنے بُرا کام کرنے کی بات کو کھولا نہ جائے لیکن اس کے اخلاقی نقصانات اور بد آموزیوں سے غافل ہیں۔ اس کام کے دو بڑے نقصانات ہیں۔

ایک طرف تو یہ بچے کو غلط بیانی کی تلقین کرنے کے مترادف ہے اور اسے جھوٹ بولنا سکھاتا ہے۔ دوسری طرف عملاً اور قولاً اُسے یہ بتاتا ہے کہ غلط اور بُرے کام انجام دے کر انہیں دوسروں کی گردن پر ڈالا جا سکتا ہے اور یہ کام جھوٹ بولنے سے بھی زیادہ بُرا ہے اور اس کا نقصان بھی زیادہ ہے۔

۷۔ اگر اتفاقاً آپ کے بچے جھوٹ بولیں تو کوشش کریں کہ اس کی وجہ معلوم کریں اور اس کے علاج کے درپے ہوں۔ البتہ اس بات پر زور نہ دیں کہ تحقیق و جستجو سے ان کا جھوٹ بولنا ثابت کیا جائے اور انہیں شرمندہ اور رسوا کیا جائے۔ کیونکہ جھوٹ بولنا اگر ثابت ہو جائے تو اس کا اس کے سوا کوئی فائدہ نہ ہوگا کہ بچے کو شرمندہ اور رسوا کیا جائے اور اُلٹا وہ اس سے اور بھی بے باک ہو جائے گا اور اس کی جرأت بڑھ جائے گی۔

وفائے عہد

انسانی زندگی کا نظام عہد و پیمان کے بغیر نہیں چل سکتا۔ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ قول و قرار کرتے ہیں یہ عہد و پیمان ہی ہے جس کے ساتھ خاندان تشکیل پاتا ہے۔ شہروں اور ملکوں کو معاہدے ہی ایک دوسرے سے مربوط کرتے ہیں۔ لوگ اس قول و قرار کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور یہ اُن کی اجتماعی زندگی کی بنیاد ہے ایفائے عہد کا ضروری ہونا ایک فطری چیز ہے اور ہر انسان فطرتاً اس کو سمجھتا ہے اور عہد و پیمان کی خلاف ورزی کو بُرا اور قبیح سمجھتا ہے۔ ہر شخص جو دوسرے سے عہد و پیمان باندھتا ہے توقع کرتا ہے کہ وہ اس کی پاسداری کرے گا۔ جو گروہ بھی اپنے عہد و معاہدوں کا وفادار ہوگا ان کا اجتماعی نظام اچھے طریقے سے چلے گا۔ کیوں کہ ان کو ایک دوسرے پر اعتماد اور حسن ظن ہوگا۔ وہ نفسیاتی طور پہ آرام اور اطمینان سے رہیں گے۔ ان کے درمیان زیادہ لڑائی جھگڑا نہیں ہوگا۔ وہ اعصاب کی کمزوریوں اور نفسیاتی پریشانیوں میں کم مبتلا ہوں گے۔ ان کی زندگی سعادت و خوش بختی سے ہمکنار ہوگی۔ لوگ جس قدر بھی اپنے عہد کے زیادہ وفادار ہوں گے وہ زیادہ سکون و آرام سے زندگی گزار سکیں گے۔ جب کہ اس کے برعکس جس ملک کے لوگ اپنے عہد کے وفادار نہ ہوں اس کا نظم و ضبط درست نہیں ہوگا ایسے لوگ باہمی لڑائی جھگڑے میں مبتلا رہیں گے۔ ان کے درمیان نفسیاتی پریشانیاں، اضطراب اور بے چینی زیادہ ہوگی۔ ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کریں گے اور بدگمان رہیں گے۔ ہر شخص یا ہر وہ معاشرہ کہ جو اپنے عہد و پیمان کا پابند ہو دوسروں کے نزدیک عزیز، محترم اور قابل اعتماد ہوگا۔ جب کہ عہد شکن لوگ دوسروں کے نزدیک ذلیل اور گھٹیا سمجھے

جائیں گے۔ اسلام کا مقدس دین ایک فطری دین ہے اس میں اس حیات آفریں امر پہ بہت تاکید کی گئی ہے۔ اور ایفائے عہد کو واجب اور ایمان کی نشانیوں میں سے قرار دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پہ

اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے:

"اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا"

اپنے وعدے کو پورا کرو کیوں کہ وعدے کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

(اسرا، آیہ ۳۴)

اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں ایک دوسری جگہ فرماتا ہے:

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ۔

(اور کامیاب مومنین کی ایک نشانی یہ ہے کہ) وہ امانت ادا کرتے ہیں اور عہد کی پاسداری کرتے ہیں۔ (سورہ مومنون۔ آیہ ۸)

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ۔

"جس شخص کا عہد نہیں اس کا دین ہی نہیں ہے"[۱]

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص بھی اللہ اور روز جزا پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنا وعدہ وفا کرے"[۲]

حضرت علی علیہ السلام مالک اشتر سے فرماتے ہیں:

"پیمان شکنی سے خدا بھی ناراض ہوتا ہے اور لوگ بھی"[۳]

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

---

[۱] بحار، ج ۷۵، ص ۹۶

[۲] کافی، ج ۲، ص ۳۶۴

[۳] بحار، ج ۷۷، ص ۹۶

بعض مقام پر اپنا وعدہ پورا نہیں کر سکتا وہاں وعدہ ہی نہ کرو اور جہاں کوئی امانت پوری نہیں کر سکتا وہاں ضامن نہ بن۔[1]

اس لئے کہ پورے معاشرے میں ایفائے عہد کا احیاء ہو اور وہ سب لوگوں کی ایک ذمہ داری کے طور پر جانا جائے تو آپ اس اچھی عادت کو بچپن ہی سے بچوں میں پروان چڑھائیں تاکہ انہیں ایفائے عہد کی عادت پڑے اور وعدہ خلافی کو قانون فطرت کی خلاف ورزی سمجھیں۔

ایفائے عہد کی تربیت بچپن میں اور گھر کے ماحول سے شروع کی جانا چاہیئے۔ بچہ ماں باپ کی طرف احترام کی نظر سے دیکھتا ہے اور گفتار و کردار میں اُن کی تقلید کرتا ہے۔ ماں باپ بچے کے لیے نمونہ عمل ہیں۔ بچے کا ذہن بہت حساس ہوتا ہے اور بہت چھوٹی چھوٹی چیزوں کی تصویر بھی اس کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہے۔ وہ ماں باپ کے کاموں کو بہت گہری نظر سے دیکھتا ہے اور آئندہ کی زندگی میں ان سے استفادہ کرتا ہے۔ بچہ اپنی طبیعت اور فطرت کے باعث ایفائے عہد کے ضروری ہونے کو سمجھتا ہے جب ماں باپ اس سے وعدہ کرتے ہیں تو اسے ان سے توقع ہوتی ہے کہ وہ اپنے وعدہ پر عمل کریں گے۔ اگر وہ عمل کریں تو بچہ ایفائے عہد کا عملی درس ان سے حاصل کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنا وعدہ پورا نہ کریں تو اسے دُکھ ہوتا ہے اور ماں باپ کو غلط کام کرنے والا سمجھتا ہے۔ جس گھر میں ماں باپ اپنے وعدے پر عمل کریں آپس میں اپنے بچوں سے اور دوسرے لوگوں سے وعدہ خلافی نہ کریں اس گھر کے بچوں میں بھی ایفائے عہد کی عادت ہوگی۔ جب کہ اس کے برعکس جس گھر میں ماں باپ اپنے وعدوں کے پابند نہ ہوں اور عہد شکنی کو بُرا نہ سمجھیں اس گھر کے بچے بھی عہد شکن ہوں گے۔ جو بچے ہر روز ماں باپ کی عہد شکنی کو دیکھتے ہیں ان کی نظر میں ایفائے عہد کی کوئی حیثیت نہیں۔ اور وعدے کو فقط چکر اور فریب دینے کا بہانہ سمجھتے ہیں۔

اگر ماں باپ خود عہد شکن ہوں اور جھوٹے وعدوں سے بچے کو فریب دیں اور اپنے وعدے پر عمل نہ کریں۔ یا اپنے غلط طرز عمل سے معصوم بچوں کو عہد شکنی کا سبق دیں اور

---

[1] غرر الحکم ص ۸۰۱

عملاً انہیں سمجھائیں کہ انسان اپنے مفادات کے لیے جھوٹے وعدے کر سکتا ہے اور پھر انہیں توڑ سکتا ہے جو معصوم اور سادہ بچے اپنے ماں باپ سے سینکڑوں جھوٹ اور وعدہ خلافیاں دیکھتے ہیں۔ کیا ایسے بچوں سے توقع ہو سکتی ہے کہ وہ باوفا ہوں۔ ماں بچے کو چپ کرانے کے لیے اس سے وعدہ وعید کرتی ہے کہ میں تمہارے لیے مٹھائی لاؤں گی آئس کریم لے کے دوں گی، ٹافی کھلاؤں گی۔ پھل لے کے دوں گی جوتا نیا خریدوں گی نئے کپڑے لاؤں گی، کھلونے خریدوں گی، تمہیں دعوت پر اور سیر پر لے جاؤں گی۔ یہ وعدے وہ کبھی صرف اسی لیے کرتی ہے کہ بچہ کڑوی دوائی پی لے۔ اس لیے کہ بچہ ڈاکٹر کے پاس اور انجکشن لگانے والے کے پاس چلا جائے اسے خوشخبریاں دیتی ہے۔ اس سے کہتی ہے اگر تو نے فلاں کام کیا تو تجھے پیٹوں گی، مار ڈالوں گی، پولیس کے حوالے کر دوں گی۔ گھر سے نکال دوں گی۔ تہہ خانے میں بند کر دوں گی۔ تم سے کوئی بات نہیں کروں گی۔ پیسے نہیں دوں گی عید پر تمہارے لیے نئے کپڑے نہیں خریدوں گی۔ تمہیں دعوت پر نہیں لے جاؤں گی تمہارے ابو سے شکایت کروں گی اور ایسی سینکڑوں دھمکیاں۔ اگر آپ مختلف خاندانوں اور خود اپنی زندگی پہ غور کریں تو دیکھیں گے کہ ہر روز سادہ لوح بچوں سے کتنے وعدے کیے جاتے ہیں کہ جن میں سے اکثر پر عمل نہیں ہوتا۔ کیا ماں باپ جانتے ہیں کہ ان وعدہ خلافیوں کی بچوں کی حساس روح پر کتنی بری تاثیر ہوتی ہے اور اس طریقے سے وہ ان کے بارے میں کتنی بڑی خیانت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ بچہ ماں باپ سے جو ناپسندیدہ عمل دیکھتا یا سنتا ہے وہ اس سے اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ اس کے اثرات آخر عمر تک نہیں جاتے۔

نادان ماں باپ کہ جو وعدہ خلافی کرتے ہیں ایک تو وعدہ خلافی کے گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں دوسرا وہ ان وعدہ خلافیوں سے اور جھوٹ سے بچے کی بھی تربیت کرتے ہیں کہ جس کا گناہ مسلمہ طور پر عہد شکنی سے بھی بڑا ہے۔

اسی وجہ سے اسلام ماں باپ سے کہتا ہے کہ آپ جو وعدہ اپنے بچوں سے کریں اسے حتماً ایفا کریں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

بچوں سے پیار کریں، ان سے مہربانی سے پیش آئیں اور اگر ان سے کوئی وعدہ کریں تو اسے حتماً پورا کریں۔ بچے یہ خیال کرتے ہیں کہ آپ ان کو روزی دیتے ہیں"۔ [۱]

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں،

جب آپ بچوں سے کوئی وعدہ کریں تو اسے حتماً پورا کریں۔ [۲]

۱۔ وسائل۔ ج ۱۵، ص ۲۰۱، بحار ج ۱۰۴، ص ۹۲

۲۔ مستدرک ج ۲، ص ۶۰۶

ملکیت

مال سے محبت انسان کی طبیعت کا حصہ ہے۔ جن چیزوں کی انسان کو ضرورت ہوتی ہے انہیں اپنی ملکیت بنا لیتا ہے۔ اور اپنے تئیں اس کا مالک سمجھتا ہے۔ دوسروں سے بھی وہ توقع رکھتا ہے کہ اس کی ملکیت کا احترام کریں اور اس کے مزاحم نہ ہوں۔ ملکیت کی خواہش انسان کی فطرت میں اس طرح سے موجود ہے کہ اسے کاملاً ختم نہیں کیا جاسکتا۔ جدھر سے بھی اس کا مقابلہ کیا جائے وہ کسی اور صورت میں ظاہر ہو جائے گی۔ ملکیت اگرچہ ایک امر اعتباری ہے لیکن ایسا امر اعتباری کہ جس نے حقیقت کی صورت اختیار کر رکھی ہے اور انسان کی فطرت میں جاگزیں ہو چکا ہے اور اس کے بغیر انسانی زندگی کا نظام چلنا ممکن نہیں ہے۔ جب سے بچہ اپنے آپ کو پہچاننے لگتا ہے اور اپنی احتیاجات کو سمجھنے لگتا ہے تو اس کا اشیائ سے تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا احساس اس کے وجود میں پیدا ہو جاتا ہے۔

بچے کو جو چیز زمین پر پڑی مل جائے یا کسی کے ہاتھ سے لے لے وہ اسے اپنے آپ سے مختص سمجھتا ہے۔ اسے مضبوطی سے تھام لیتا ہے اور آسانی سے تیار نہیں ہوتا کہ کسی کو دے دے۔ وہ اپنے جوتے، لباس اور کھلونوں کا اپنے آپ کو مالک سمجھتا ہے اور کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ ان میں تصرف کرے اور اگر کوئی اجازت کے بغیر انہیں استعمال کرے تو اسے غاصب اور متجاوز سمجھتا ہے اور اس کے خلاف قیام کرتا ہے اور لڑتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بچے اپنے کھلونوں سے یہاں تک کہ نہایت غیر اہم سی چیزوں سے کتنی محبت کرتے ہیں اور ان کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کے لیے لڑتے

جھگڑتے ہیں اور یہ ان کا حق ہے کیوں کہ وہ مالک ہیں اور اپنے حق کا دفاع کرتے ہیں۔ اگر کوئی اپنے حق کے حصول کے لیے قیام کرے تو اسے شریر اور غلط نہیں سمجھنا چاہیے۔ احساس ملکیت کوئی غلط چیز نہیں ہے بلکہ ہر انسان کے لیے فطری ہے۔ ماں باپ کو چاہیے کہ بچے کے اس فطری احساس کو قبول کر لیں اور اس کی خلاف ورزی نہ کریں۔

ایسا بہت ہوتا ہے کہ بچے ایک دوسرے کی ملکیت میں تجاوز کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسروں کی چیزوں اور کھلونوں میں تصرف کریں یا انہیں غصب کر لیں ماں باپ کو چاہیے کہ ایسے کاموں کی بچوں کو اجازت نہ دیں۔ کیوں کہ جن میں زیادہ طاقت ہوگی انہیں دوسروں کے حقوق اس طرح غصب کرنے کی عادت پڑ جائے گی۔ اور چھوٹے مظلوم بن جائیں گے اور ان کے دل اس پہ ملول ہوں گے۔ اگر ماں باپ ایسے امور میں ظالم کی حمایت کریں تو وہ شریک جرم ہوں گے اور جو بچہ مظلوم ہوگا وہ ان کے بارے میں بدگمان ہو جائے گا۔ اگر وہ ایسے مسئلے پر چپ رہیں تو اپنے سکوت سے بھی وہ زیادتی کرنے والے کے عمل کی تائید کریں گے اور اسے تشویق کریں گے۔ اور اس طرح سے وہ بچوں کو تجاوز پر سکوت اور حق کا دفاع نہ کرنا سکھائیں گے۔ اور یہ بھی ایک بہت بڑا جرم ہے۔ ماں باپ کو ایسے امور میں دخیل ہونا چاہیے۔ زیادتی کرنے والے بچے کی زیادتی کو روکنا چاہیے اور اسے اجازت نہیں دینا چاہیے کہ وہ طاقت سے کسی دوسرے بچے کے کھلونے چھین لے۔ لیکن یہ کام مار پیٹ اور گالی گلوچ کے ذریعے نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ شروع میں اچھے انداز سے اور مشفقانہ طریقے سے اسے سمجھائیں کہ یہ چیز تمہاری بہن کی ہے یا تمہارے بھائی کی ہے۔ اور تمہیں ان میں تصرف کا حق نہیں پہنچتا۔ بعد ازاں پوری قاطعیت سے کہیں کہ ہم اجازت نہیں دے سکتے کہ تم اپنی بہن یا بھائی کی چیزوں پر زبردستی قبضہ جما لو۔ اور اگر یہ طریقہ بھی مؤثر نہ ہو تو کچھ سختی اور ڈانٹ ڈپٹ سے روکیں اور جس بچے کے ساتھ زیادتی ہوتی ہو اس کی حمایت کریں۔ یہ صحیح ہے کہ احساس ملکیت کا احترام کیا جانا چاہیے اور جائز حدود میں اس کی حمایت کی جانا چاہیے لیکن اسے بالکل آزاد اور غیر مشروط نہیں چھوڑ دینا چاہیے۔ انسان کی نفسانی خواہشات ہمیشہ بڑھتی رہتی ہیں اور کسی معین حد پہ جا کر ٹھہرتی نہیں۔ اگر ان پہ کنٹرول نہ کیا جائے تو انسان کی تباہی اور ہلاکت کا سبب بن جاتی ہیں۔

اصول ملکیت انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہے۔ اور ملکیت کے حصول کے لیے کام اور محنت کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ اور حب مال جائز حدود میں نہ فقط عیب نہیں ہے بلکہ انسان کے لیے ایک فطری امر شمار ہوتا ہے لیکن اگر بالکل آزادی دے دی جائے تو پھر یہ مال پرستی کی صورت اختیار کرلے گی۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں کہ جو مال و دولت پر مرے جاتے ہیں۔ بغیر ضرورت کے شب و روز دیوانہ وار اس کے پیچھے لگے رہتے ہیں، یہاں تک کہ بعض لوگ حصول دولت کے لیے اپنا آرام و راحت عزت و آبرو، دین و اکرام اور احترام و شرافت سب کچھ فدا کر دیتے ہیں ایسے لوگوں کو عقل مند انسان نہیں سمجھا جاسکتا۔ مال پرستی بھی ایک طرح کا جنون ہے وہ لوگ کہ جنہیں نہ ضرورت ہوتی ہے۔ نہ خود کھاتے ہیں نہ دوسروں کو دیتے ہیں فقط اور فقط جمع کیے جاتے ہیں اور ڈھیر لگائے جاتے ہیں ایسے لوگوں کو عاقل اور خردمند نہیں سمجھا جاسکتا۔

لہذا ماں باپ بچے کے احساس ملکیت کے احترام کے ساتھ ساتھ اس کی زیادہ طلبی کی خواہش کو بھی روکیں۔ اس کے کھلونے ضرورت کے مطابق ہونا چاہئیں۔ زیادہ نہیں۔ بس اتنے کہ ان سے وہ کھیل سکے اور کوئی کام سیکھ سکے۔ نہ اتنے کہ بس جمع کر رکھے اور دوسرے بچوں کے مقابلے میں فخر کرتا رہے۔ اگر اس کے پاس اتنے کھلونے ہوں کہ اسے ان کی ضرورت نہ ہو اور انہیں اس نے بس جمع کر کے رکھ چھوڑا ہو تو بہتر یہ ہے کہ ماں باپ اسے شوق دلائیں کہ وہ دوسرے بچوں کو دے جنہیں ان کی ضرورت ہے اسے بڑے پیار محبت سے کہیں! یہ کھلونے تمہارے ہیں تمہیں ان کی ضرورت نہیں جب کہ دوسرے بچوں کے پاس کھلونے نہیں ہیں اور اُن کو ضرورت بھی ہے۔ مناسب نہیں ہے کہ تم ان کا ذخیرہ کر رکھو اور دوسروں کو نہ دو۔ جن کھلونوں کی تمہیں ضرورت نہیں ہے وہ دوسرے ضرورت مند بچوں کو دے دو۔ وہ خوش ہوں گے خدا بھی خوش ہوگا اور ماں باپ بھی۔ بچہ چونکہ صاف ذہن ہوتا ہے اور فطری طور پر خیر خواہ ہوتا ہے اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ ماں باپ کی خوشنودی حاصل کرے وہ ان کی بات سنتا ہے اور یوں اس کے اندر جود و عطا کی ایک پسندیدہ عادت پیدا ہو جائے گی۔ اس صورت میں جب کہ بچے کو کھلونے کی ضرورت نہیں

اور دوسرا بھی کوئی بچہ ان کھلونوں سے کھیلنا چاہتا ہے تو بہتر ہے کہ ماں باپ بچے کو نرمی اور پیار سے تشویق کریں کہ وہ کچھ دیر کے لیے کھلونے دوسرے بچے کو دے دے تاکہ وہ ان سے کھیل سکے۔ اس طرح سے اس میں تعاون اور ایثار کا جذبہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ باہمی تعاون کے جذبے کو فروغ دینے کے لیے ایسے کھلونے بچوں کو خرید کر دیئے جا سکتے ہیں کہ جن سے مشترکہ طور پر کھیلا جائے۔ اور انہیں شوق دلانا چاہیے کہ مل جل کر کھیلیں۔ اور مل جل کر فائدہ اٹھائیں۔

مختصر یہ کہ ماں باپ کو چاہیے تربیت کرتے ہوئے تمام مراحل میں بچوں کے لیے حد اعتدال کو ملحوظ رکھیں احساس ملکیت کے اصول کی حمایت کریں اور خرابیوں کو روکیں، کوشش کریں کہ اس احساس کو کنٹرول کریں اور صحیح راستے پر ڈالیں۔ اور اس امر پر نظر رکھیں کہ کہیں وہ مال و دولت کے اندھے عاشق اور زر پرست نہ بن جائیں۔

سخاوت

جود و سخا ایک اچھی اور پسندیدہ صفت ہے۔ ایک سخی انسان مال و دولت جمع کرنے میں محنت کرتا ہے لیکن مال سے دل بستگی نہیں رکھتا۔ وہ دولت چاہتا ہے لیکن خرچ کرنے کے لیے دوسروں کو دینے کے لیے۔ وہ مال کو ذخیرہ اندوزی کے لیے جمع نہیں کرتا۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ اچھی زندگی گزارتا ہے اور فلاحی کاموں میں شرکت بھی کرتا ہے۔ وہ محروم اور بے نوا لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ ایسے لوگ اپنے مال سے صحیح فائدہ اٹھاتے ہیں۔

کنجوس شخص مال کو جمع کرنے اور ذخیرہ اندوزی کے لیے اکٹھا کرتا ہے، خرچ کرنے کے لیے نہیں اس سے نہ وہ خود فائدہ اٹھاتا ہے اور نہ اس کا خاندان۔ نہ ہی دل اسے راہِ خیر میں خرچ کرنے کو چاہتا ہے۔ ایسا ذخیرہ اندوز شخص ایک ایسا ملازم ہے جو بغیر خواہش کے مال ورثاء کے لیے اکٹھا کرتا ہے۔

اسلام نے بخل کی مذمت اور سخاوت کی تعریف کی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

سخاوت ایمان کا حصہ ہے اور ایمان بہشت میں لے جاتا ہے۔[1]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

سخاوت ایک ایسا شجرِ بہشت ہے کہ جس کی شاخیں زمین تک پہنچی ہوئی ہیں۔

---

[1] جامع السعادات ، ج ۲ ، ص ۱۱۳

جس نے بھی ان میں سے کوئی ایک شاخ پکڑلی وہ اسے جنت تک لے جائے گی[۱]

پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں :

بہشت اہل سخاوت کا گھر ہے[۲]

پیغمبر اسلامؐ فرماتے ہیں :

اللہ جواد اور سخی ہے اور وہ سخاوت کو پسند کرتا ہے[۳]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

" بخل وہ درخت ہے کہ جو آتش دوزخ میں اگتا ہے۔ اور کنجوس لوگ دوزخ میں جائیں گے "[۴]

پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں :

" مومن کے لیے مناسب نہیں کہ وہ بخیل اور بزدل ہو "[۵]

جود و بخشش دلوں اور محبتوں کو انسان کی طرف جذب کر لیتے ہیں، لوگ ایک سخی شخص کو پسند کرتے ہیں اس کا احترام کرتے ہیں اور اس کی عزت کرتے ہیں۔ جود و بخشش سے دلوں کو تسخیر کیا جا سکتا ہے اور ان پر حکومت کی جا سکتی ہے۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

سخی شخص اللہ کے بندوں اور بہشت کے نزدیک ہے اور آتش دوزخ سے دور ہے۔ اور بخیل انسان خدا سے دور ہے انسانوں سے بھی دور ہے ،

---

[۱] جامع السعادات، ج ۲، ص ۱۱۳

[۲] جامع السعادات، ج ۲، ص ۱۱۴

[۳] جامع السعادات، ج ۲، ص ۱۱۳

[۴] جامع السعادات، ج ۲، ص ۱۱۰

[۵] جامع السعادات، ج ۲، ص ۱۱۱

بہشت سے دور ہے لیکن آگ سے نزدیک ہے۔[1]

بخیل شخص اپنے اموال سے واجب حقوق ادا نہیں کرتا اور اس وجہ سے بھی وہ عذاب اخروی کا حقدار ہوگا سخاوت انسان کی دنیا و آخرت کو آباد کرتی ہے اور بخل انسان کی دنیا و آخرت کو تباہ کر دیتا ہے جود و سخا کی بنیاد دیگر تمام اچھی صفات کی طرح سے فطری ہے لیکن اسے پروان چڑھانا بہت حد تک ماں باپ کے اختیار میں ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر بچہ ایک خاص مزاج رکھتا ہے۔ بعض مزاج جود و عطا کے لیے زیادہ تیار ہوتے ہیں اور بعض بخل اور کنجوسی کے لیے زیادہ تیار ہوتے ہیں۔ لیکن بہرحال ماں باپ کی تربیت بلاشک بہت اہم اثرات مترتب کرتی ہے۔ ماں باپ اگر باتدبیر اور دانا ہوں تو وہ بخل کے اسباب و عوامل کو روک سکتے ہیں اور بچوں کی طبیعت میں جود و سخا کی پرورش کر سکتے ہیں۔

جو چیز ان میں سے زیادہ اثر رکھتی ہے وہ ماں باپ کا کردار ہے ماں باپ بچے کے لیے نمونہ عمل اور سرمشق ہیں۔ اگر ماں باپ سخی ہوں، خود خرچ کرنے والے ہوں اور نیک کاموں میں شرکت کرنے والے ہوں تو ان کے بچے بھی ماں باپ کا کردار دیکھیں گے اور ان کی تقلید کریں گے۔ اور رفتہ رفتہ اُن کے اندر بھی اس کی عادت پڑ جائے گی۔ اس کے برعکس اگر والدین بخیل اور کنجوس ہوں تو ان کے بچے بھی زیادہ تر انہیں کا نمونہ اپنائیں گے اور کنجوسی کے عادی بن جائیں گے۔ اخلاق کو پروان چڑھانے میں عادت بہت کردار ادا کرتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

"اپنے نفس کو بخشش کا عادی بناؤ اور ہر خُلق میں سے بہتر کا انتخاب کرو کیونکہ خوبی عادت کی شکل اختیار کر لیتی ہے"[2]

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

"سخاوت اچھی عادتوں میں سے ہے"[3]

---

[1] محجۃ البیضاء، ج ۳، ص ۲۸۴

[2] بحار، ج ۷۷، ص ۲۱۴

[3] غرر الحکم، ص ۱۷

حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا۔

"انسان کی گنہگاری کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لیے کچھ خرچ نہ کرے اور اُسے محروم رکھے"۔[1]

ماں باپ بچے میں سخاوت اور بخشش کے جذبے کو فروغ دینے کے لیے مندرجہ ذیل طریقوں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

۱۔ بچوں سے کہیں کہ جو چیزیں ان کی ہیں ان میں سے کچھ ماں باپ کو یا بہن بھائی کو دے دیں اور جب ایسا کریں تو ان کی تعریف و ستائش کریں۔ اور ان کا شکریہ ادا کریں تاکہ آہستہ آہستہ انہیں سخاوت کی عادت پڑ جائے۔ البتہ اس امر کی طرف توجہ رکھیں کہ ممکن ہے شروع شروع میں یہ عمل بچوں کے لیے مشکل ہو۔ لہذا یہ عمل کبھی کبھی اور کم مقدار میں ہونا چاہیے۔ اور اس میں زبردستی بھی نہ کی جائے کہیں اُلٹا نتیجہ ہی نہ نکل آئے اور بچے سرکشی ہی نہ کرنے لگیں۔

۲۔ کبھی کبھی بچوں سے کہیں کہ وہ اجازت دیں کہ ان کے کھلونوں سے دوسرے بچے کھیلیں۔ اسی طرح انہیں نصیحت کریں کہ ان کے پاس جو کھانے کی چیزیں ہیں وہ اپنے دوستوں اور ہم جولیوں کو دیں اور اس امر پہ اُن کو شاباش بھی دیں۔

۳۔ کبھی کبھی انہیں نصیحت کریں کہ وہ اپنے جیب خرچ میں سے کچھ غریب لوگوں کو دیں۔ یا کسی کارِ خیر میں صرف کریں۔ اور اگر یہ کام ایک دائمی شکل اختیار کرے تو اس کا اثر بہتر ہوگا

۴۔ اپنے بچوں سے کہیں کہ وہ اپنے دوستوں کی گھر پہ دعوت کریں اور پھر ان کی خاطر تواضع کریں۔

۵ آپ ہر روز کچھ پیسے بچے کو دے سکتے ہیں کہ وہ کسی غریب کو دے یا کارِ خیر میں صرف کرے۔

---

[1] وسائل، ج ۱۵، ص ۲۵۱

۶- غریب لوگوں کی مشکلات اور ان کی زندگی کی دشواریوں کو بچوں سے بیان کریں ممکن ہو تو انہیں اپنے ہمراہ ہسپتال، یتیم خانوں اور غریب مسکین لوگوں کے گھروں میں لے جائیں اور ان کی موجودگی میں ضرورت مندوں کی مدد کریں۔

اس طریقے سے آپ بچوں کے احساسات کو تحریک کر سکتے ہیں اور ان کی طبیعت میں سخاوت کا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں تاکہ آہستہ آہستہ وہ قوی ہو جائے اور ایک عادت اور اخلاق کی شکل اختیار کرے البتہ ہم اس بات کے مدعی نہیں ہیں کہ اس طرح کے کام سب بچوں پر سو فیصد کامیاب اثر ڈالیں گے اور سب کے اندر جود و سخا کا جذبہ پیدا کر دیں گے۔ آپ کو بھی ایسی امید نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ ہر شخص کی ایک خاص استعداد ہوتی ہے اور خصوصی مزاج ہوتا ہے کہ شاید جسے انہوں نے ماں باپ سے یا بزرگوں سے ورثے میں پایا ہو۔ لیکن یہ دعویٰ یقیناً کیا جا سکتا ہے کہ بچوں کے لیے ماں باپ کی تربیت اور کوشش بے اثر نہیں رہے گی۔ اور کچھ نہ کچھ ان پہ ضرور اثر کرے گی۔ کامل نتیجہ نہ بھی نکلے تو بھی بے نتیجہ تو نہیں رہے گی۔

ایک خاتون اپنے ایک خط میں لکھتی ہے:

..... ایک پر فضا مقام پر ہمارا ایک باغ تھا اس میں مختلف قسم کے پھل تھے امی ابو اور ہماری دادی اماں کچھ پھل حاجت مندوں کو بھیجتی تھیں۔ جو خدمت گزار ہوتے ان پر ان کی خصوصی عنایت ہوتی تھی۔ اور یہ کام وہ میرے ذریعے سے انجام دیا کرتی تھیں، چھ، سات سال کی عمر سے مجھے اس کام کی عادت پڑ گئی، گاؤں میں دو نابینا خاندان تھے۔ میرا دل ان کی حالت پہ بہت کڑھتا تھا۔ ہر روز جب میں ان کے گھر جاتی ان کا ہاتھ پکڑتی، کمرے سے انہیں صحن میں لے آتی اور پھر صحن سے انہیں کمرے میں لے جاتی اور چشمے سے ان کے برتن بھر کر ان کے کمرے میں رکھ دیتی وہ میرے لیے دعا کرتے جب میں نے یہ بات اپنی امی ابو کو بتائی وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ میرے ابو نے یہ شعر پڑھا۔

شکر خدای کن کہ موفق شدی بہ خیر
زانعام و فضل خود نہ معطل گذاشتت

میری امی نے کہا جو نابینا ہو جائے وہ واقعاً ہی مستحق ہے۔

وہ ہمیشہ اچھے کاموں میں مجھے تشویق کرتے۔ میں اپنا جیب خرچ جمع کرتی اور فقرا کو دے دیتی آہستہ آہستہ اس کام کی مجھے عادت ہو گئی۔ اس وقت میں سماجی خدمت کے ایک ادارے میں کام کرتی ہوں اور چودہ خاندانوں کی سرپرستی کر رہی ہوں۔

میرے طرز عمل نے میرے بچے پر بھی اچھا اثر کیا ہے ایک دن کہنے لگا! کہ ہر روز مجھے کچھ پیسے دیا کریں میں نے کہا! کیا کرو گے؟ اور کتنے پیسے؟ کہنے لگا! ہر روز دو روپے۔ میں چاہتا ہوں جمع کروں۔ ہر روز میں اُسے دو روپے دے دیتی ہوں۔ اور کہتی دھیان رکھنا فضول خرچی نہ کرنا۔ چند دنوں بعد وہ اپنا گلا لے آیا اس میں اڑتالیس روپے تھے۔ کہنے لگا امی مجھے اجازت دیں یہ پیسے میں فلاں نابینا کو دے آؤں وہ ہمارے سکول کے راستے میں رہتا ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی اور میں نے بے اختیار اس کو چوم لیا۔

نیک کاموں میں تعاون

بعض کام خصوصاً اہم اور بڑے کام اکیلا شخص نہیں کر سکتا۔ البتہ دوسروں کے تعاون اور ہمکاری سے اہم اور بڑے بڑے کام انجام دیے جا سکتے ہیں۔ اگر انسان اکیلا اور تنہا ہی کام کرنا چاہے تو بہت سے اہم اور نہایت مفید کام کرنے سے محروم رہ جائے گا اور وہ کام پڑے رہ جائیں گے ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی شخص تنہا ہی سماجی بھلائی کا کوئی ادارہ بنا سکے مثلاً ہسپتال، شفاخانہ، سکول، مسجد، یتیم خانہ، لائبریری اور تربیت گاہ وغیرہ۔ بلکہ بیشتر اوقات اکیلا شخص کسی ایسے ادارے کا نظام بھی نہیں چلا سکتا۔ البتہ دوسروں کے تعاون اور مدد سے ایسے اور زیادہ اہم کام انجام دیے جا سکتے ہیں۔ کسی قوم میں امدادِ باہمی اور مِل جل کر کام کرنے کا جذبہ جتنا قوی ہو گا اتنا ہی ان کا اجتماعی امور کا نظام بہتر چل سکے گا۔

اس اعتبار سے دینِ اسلام ایک کامل اجتماعی نظام ہے کہ جو لوگوں کو باہمی طور پر دوسرے سے تعاون کی دعوت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے۔

"تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان"

"ایک دوسرے سے بھلائی اور پرہیز گاری کے کاموں میں تعاون کریں اور گناہ اور سرکشی کے کاموں میں تعاون نہ کریں" [1]

---

[1] سورہ مائدہ۔ آیہ ۲

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

"حق کے قیام کے لیے تعاون کرنا امانت اور دیانت ہے"[1]

تعاون اور ہمکاری کا جذبہ بچپن سے ہی پیدا ہونا چاہیے۔ خوش قسمتی سے انسان فطری طور پر معاشرتی مزاج رکھتا ہے۔ لیکن اس سے صحیح طریقے سے استفادہ کرنا چاہیے جو ماں باپ اپنے بچوں کی تربیت کے خواہش مند ہیں وہ مختلف طریقوں سے بچوں کے اندر سے یہاں تک کہ مناسب کھیلوں سے تعاون اور ہمکاری کا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں اور ان کی توجہ امور خیر کی طرف جذب کر سکتے ہیں اور اس خدا داد فطرت کو پروان چڑھا سکتے ہیں۔ مثلاً بچوں کے لیے مناسب کھلونے خرید کر ان کو باہم مل جل کر ایک ہسپتال یا سکول یا پل بنانے کی دعوت دیں۔ بچوں کے لیے وہ ایک مشترک گلا بنا سکتے ہیں اور ان سے کہہ سکتے ہیں کہ اپنے جیب خرچ میں سے کچھ پیسے گلے میں ڈالیں۔ کچھ عرصے بعد نکالیں اور ماں باپ کی نگرانی میں امور خیر میں صرف کریں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ پیسوں سے پھل یا مٹھائی خریدیں اور ماں باپ سے مل کر یا تنہا بیماروں کی عیادت کے لیے جائیں۔ وہ غریب لوگوں کی مدد بھی کر سکتے ہیں۔ ماں باپ انہیں کچھ پیسے دے سکتے ہیں تاکہ وہ طے شدہ طریقے سے یا کبھی کبھی کسی امور خیر کے ادارے کو دیں یا کسی عمومی کتاب خانے کے لیے کتاب خریدیں۔ بچوں کو یہ تجویز بھی دی جا سکتی ہے کہ وہ خود سے ایک کمیٹی بنائیں اور اس کی میٹنگ کریں اور کسی اچھے کام کے لیے کوشش کریں۔ اور اس سلسلے میں ان کی مدد کی جا سکتی ہے۔

اگر ماں باپ سماجی خدمت کے کسی ادارے میں شرکت کرتے ہوں تو اپنے بچوں کو بھی ان میں شریک کر سکتے ہیں اور کچھ رقم ان کے حوالے کر سکتے ہیں کہ وہ خود سے اس ادارے کو دیں اور اس کے باقاعدہ ممبر بن جائیں۔

---

[1] غرر الحکم ص ۴۸۴

انسان دوستی اور بچّے

سب لوگ اللہ کے بندے ہیں۔ سب کا ماں باپ ایک ہے اور دراصل ہر انسان ایک خاندان کا فرد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں پیدا کیا ہے اور انہیں پسند کرتا ہے۔ ہر کسی کو روزی دیتا ہے ان کی ضروریات کو اللہ نے پیدا کیا ہے اور پھر انہیں ان کے اختیار میں دیا ہے۔ عقل اور طاقت دی ہے تا کہ اللہ کی نعمات سے استفادہ کریں۔ اللہ نے ان کی روح کو کمال تک پہنچانے اور ان کی اخروی سعادت کی طرف بھی توجہ فرمائی ہے ان کی ہدایت کا سامان بھی فراہم کیا ہے ان کی ہدایت و راہنمائی کے لیے انبیاء کو بھیجا ہے۔ اماموں اور دینی رہبروں کو مامور کیا ہے تا کہ وہ انسانوں کی سعادت اور انھیں کمال تک پہنچانے کی کوشش کریں۔ یہ سب اس لیے ہے کہ اللہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے اور سب کی بھلائی اور سعادت کا آرزومند ہے۔ اس نے سب انسانوں سے چاہا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ہمدرد، مہربان، خیر خواہ ہوں اور ایک دوسرے کے لیے سودمند بنیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کریں اور ایک دوسرے کی ضروریات پوری کریں۔ مشکلوں اور مصیبتوں میں ایک دوسرے کی فریاد کو پہنچیں۔ انسانوں کے خدمت گزار بنیں اور سب کے فائدے کو ملحوظ خاطر رکھیں۔ انسان کے خدمت گزار اور خیر خواہ اللہ کے خاص بندے ہوتے ہیں اور بلند مرتبے کے حامل ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے بہت زیادہ جزا مقرر کی گئی ہے۔ دین اسلام کہ جو ایک مقدس اجتماعی نظام ہے اس نے اس بارے میں توجہ دی ہے اور ان امور کو سب کی ذمہ داری قرار دیا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"سب بندے اللہ کا رزق کھاتے ہیں۔ پس انسانوں میں سے اللہ کے نزدیک محبوب ترین وہ ہے جو انسانوں کو فائدہ پہنچائے یا کسی خاندان کو خوش کرے"[1]

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"خدا فرماتا ہے کہ لوگ میرا رزق کھاتے ہیں اور بندوں میں سے میرے نزدیک محبوب ترین وہ ہے کہ جو میرے بندوں کے لیے زیادہ ہمدرد ہو اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے زیادہ کوشش کرے"[2]

رسول خدا سے پوچھا گیا:

کہ لوگوں میں سے اللہ کے نزدیک محبوب ترین کون ہے؟ آپ نے فرمایا! وہ کہ جو لوگوں کے لیے سب سے زیادہ فائدہ رساں ہو[3]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

دین کے بعد سب سے اہم دانائی لوگوں سے محبت اور نیکی ہے ہر کسی سے اگرچہ وہ اچھا ہو یا برا ہو[4]

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

"مَنْ اَصْبَحَ وَلَمْ یَهْتَم بامور المسلمین فلیس بمسلم"

جو مسلمانوں کے امور کے اصلاح کی فکر میں نہ ہو وہ مسلمان نہیں ہے"[5]

حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا:

---

[1] بحار، ج ۷۴، ص ۳۱۷

[2] بحار، ج ۷۴، ص ۳۳۷

[3] بحار، ج ۷۴، ص ۳۳۹

[4] بحار، ج ۷۴، ص ۳۹۲

[5] بحار، ج ۷۴، ص ۳۳۷

اللہ کے خاص بندے وہ ہیں کہ لوگ اپنی ضروریات کے وقت ان کی پناہ میں آئیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو قیامت میں اللہ کی امان میں ہوں گے[1]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا!

"جو شخص کسی مسلمان کی فریاد سنے اور اس کا جواب نہ دے وہ مسلمان نہیں ہے"[2]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے اور وہ مہربان لوگوں کو دوست رکھتا ہے"[3]

پیغمبر اکرم اور آئمہ اطہار سے ایسی سینکڑوں احادیث مروی ہیں کہ جو حدیث کی کتب میں موجود ہیں۔

شارع مقدس اسلام نے ایک وسیع نظر سے پورے انسانی معاشرے کو اور بالخصوص اہل ایمان کے معاشرے کو ایک اکائی کے طور پر جانا ہے اور اپنے پیروکاروں سے خواہش کی ہے کہ وہ سب کی بھلائی اور سعادت کی کوشش کریں اور سب کے خیر خواہ بنیں۔ اسلام سو فیصد ایک معاشرتی دین ہے اور وہ افراد کی بھلائی کو معاشرے کی بھلائی سمجھتا ہے اور وہ ہر طرح کی خود غرضی کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ ایک مسلمان اور دیندار شخص خود غرض نہیں ہو سکتا اور یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کے مفادات کو نظر انداز کر دے۔

انسان دوستی ایک بہت ممتاز انسانی صفت ہے اور یہ انسان کے مزاج میں داخل ہے البتہ تربیت کے ذریعے سے اسے کمال تک پہنچایا جا سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ختم بھی ہو جائے۔ یہ عادت بھی تمام پسندیدہ انسانی صفات کے مانند ہے کہ جس کی بنیاد بچپن ہی میں رکھی جانا چاہیے۔ ماں باپ کا فریضہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو انسان دوست مہربان اور خیر خواہ

---

[1] بحار، ج ۷۴، ص ۳۱۸

[2] بحار، ج ۷۴، ص ۳۲۹

[3] بحار، ج ۷۴، ص ۳۹۴

بنائیں۔ اگر ماں باپ خود مہربان اور خیر خواہ ہوں اور خیر خواہی کے آثار ان کی گفتار و کردار میں نظر آئیں تو وہ اپنے بچوں کو بھی مہربان اور انسان دوست بنا سکتے ہیں۔

فرض شناس اور آگاہ ماں باپ کبھی کبھی اپنے بچوں کے سامنے ان کی حالت بیان کر سکتے ہیں جو محتاج ہوں، غریب ہوں، ناتواں ہوں اور ممکن ہو تو ایسے لوگوں سے انہیں ملوا بھی سکتے ہیں اور بچوں سے کہہ سکتے ہیں یہ سب انسان ہیں اور ہمارے بھائی ہیں۔ ان کے حقوق پامال کیے گئے ہیں یہ محروم و بے نوا ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ان کا دفاع کریں اور ان کے پامال شدہ حقوق انہیں واپس دلوائیں اور اب وقتی طور پر جو کچھ ہمارے بس میں ہے ان کی مدد کریں۔ وہ بچوں کی موجودگی میں بلکہ خود بچوں کے ذریعے سے ایسے افراد کی مدد کریں۔ ماں باپ کبھی کبھی ظالموں کے ظلم اور مظلوموں کی غم ناک حالت بچوں سے بیان کریں نیز ایک مسلمان انسان کی اس بارے میں ذمہ داری بھی انہیں بتائیں۔ وہ بچوں کو ہسپتالوں اور شفاخانوں میں بھی لے جا سکتے ہیں اور محتاج بیماروں کو انہیں دکھا سکتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں اسلامی ذمہ داریاں انہیں بیان کر سکتے ہیں اور اپنی طاقت کے مطابق ان کی مدد بھی کر سکتے ہیں ننھے یتیم بچے کہ جن کے سر پہ کوئی نہ ہو کی حالت بھی وہ بچوں کے سامنے بیان کر سکتے ہیں اور ممکن ہو تو ان سے ملوا بھی سکتے ہیں۔ اور بچوں کو بتا سکتے ہیں کہ ان کی حمایت اور مدد کس قدر ضروری ہے۔

عدل و مساوات

چند افراد پر مشتمل خاندان ایک چھوٹے سے ملک کی طرح ہے اور ماں باپ اس چھوٹے سے ملک کو چلاتے ہیں۔ جیسے ایک ملک کا اچھا نظام عدل و مساوات کے بغیر ممکن نہیں ایک گھر کے نظام کے لیے بھی عدل و مساوات ضروری ہے۔ صاف دلی اور خلوص، محبت و الفت، اعتماد و حسنِ ظن، آرام و راحت، عدل و مساوات کے ماحول میں ہی میسر آسکتی ہے۔ ایسے ہی ماحول میں صحیح بچے پرورش پا سکتے ہیں اور ان کی داخلی صلاحیتیں نکھر سکتی ہیں اور وہ ماں باپ سے عملی طور پر عدل و مساوات کا درس لے سکتے ہیں۔ جیسے بڑے عدل و انصاف کے احتیاج مند ہیں ایسے ہی بچے بھی عدل و مساوات کے پیاسے ہیں۔

حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

ایک پیاسے انسان کے لیے جیسے ٹھنڈا اور اچھا پانی بہت اچھا لگتا ہے اس سے کہیں زیادہ لوگوں کے لیے عدل و انصاف کا ذائقہ شیریں تر اور عمدہ تر ہوتا ہے۔ کاموں کو چلانے کے لیے اگرچہ کوئی چھوٹا سا کام ہی کیوں نہ ہو عدل سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔[1]

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

تین طرح کے لوگ قیامت میں خدا کے قریب ترین ہوں گے!

---

[1] اصول کافی، ج ۲، ص ۱۴۷

اوّل۔ وہ کہ جو غصّے کے عالم میں اپنے ماتحتوں پہ ستم نہ کرے۔
دوم۔ کہ جو دو افراد میں صلح کے لیے ان کے پاس آئے جائے لیکن حق کی ذرا بھر خلاف ورزی نہ کرے۔
سوم حق کہے اگرچہ خود اس کے اپنے نقصان میں ہو۔ [1]
اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:
"اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ"
"اللہ عدل اور نیکی کا حکم دیتا ہے" [2]
عادل اور منصف ماں باپ سب بچوں سے ایک جیسا سلوک کرتے ہیں۔ اور کسی کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتے، بیٹی ہو یا بیٹا۔ خوبصورت ہو یا بدشکل، بڑا ہو یا چھوٹا۔ با صلاحیت ہو یا کم استعداد، جسمانی طور پر سالم ہو یا غیر سالم سب کو اپنی اولاد سمجھتے ہیں اور ان کے درمیان تفاوت کے قائل نہیں ہوتے، مہربانی اظہار محبت، پیار، احترام، کھانے پینے لباس، جیب خرچ، گھر میں کاموں کی تقسیم اور زندگی کے باقی تمام امور میں بچوں کو برابر سمجھتے ہیں اور سب سے ایک طرح کا سلوک کرتے ہیں۔
پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
عدم موجودگی میں بھی اپنی اولاد میں عدل کو ملحوظ رکھیں۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری اولاد تم سے احسان، محبت اور عدالت کے ساتھ پیش آئے تو وہ بھی تم سے اسی بات کی توقع رکھتے ہیں [3]
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ جو اپنے ایک بچے سے پیار کر رہا تھا اور دوسرے سے نہیں تو آپؐ نے اُس سے فرمایا:

---

[1] بحار، ج ۷۵، ص ۳۳
[2] سورہ نحل، آیہ ۹۰
[3] مکارم الاخلاق، ج ۱، ص ۲۵۲

تم عدل و مساوات کا خیال کیوں نہیں رکھتے [1]

ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بیٹھا تھا کہ اس کا بیٹا وہاں پر آگیا۔ اس شخص نے اپنے بیٹے کو چوم کر اپنے زانو پر بٹھالیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی بیٹی آئی تو اس شخص نے بچی کو اپنے سامنے بٹھالیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے فرمایا:

تم نے اپنی اولاد کے درمیان عدالت اور برابری کا لحاظ کیوں نہیں رکھا [2]

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

عدالت و مساوات کی پاسداری بہترین سیاست ہے [3]

ایک عورت اپنے دو چھوٹے بچوں کے ہمراہ زوجۂ رسولؐ حضرت عائشہ کے پاس آئی۔ حضرت عائشہ نے اس عورت کو تین کھجوریں دیں۔ ان بچوں کی ماں نے ہر بچے کو ایک ایک کھجور دے دی پھر تیسری کھجور کے بھی دو حصے کر کے آدھی آدھی دونوں کو دے دی۔ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو حضرت عائشہ نے انہیں واقعہ سنایا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

کیا تجھے اس عورت کے عمل پر حیرت ہوئی ہے؟ اللہ عدالت و مساوات کا خیال رکھنے کی بناء پر اس عورت کو جنت میں داخل کرے گا [4]

اگر ماں باپ اپنی اولاد کے ساتھ عادلانہ برتاؤ کے بجائے امتیازی طرزِ عمل کا مظاہرہ کریں اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دیں تو ان بچوں پہ اخلاقی لحاظ سے ناقابلِ تلافی برے اثرات پڑیں گے۔ مثلاً:

۱۔ گھر کے ماحول میں بچے عملی طور پہ ماں باپ سے ناانصافی کا سبق سیکھیں گے اور

---

[1] مکارم الاخلاق، ج ۱، ص ۲۵۲

[2] مجمع الزوائد، ج ۸، ص ۱۵۶

[3] غرر الحکم ص ۶۴

[4] سنن ابن ماجہ، ج ۲، ص ۱۲۱۰

رفتہ رفتہ اس کے عادی ہو جائیں گے۔

۲۔ جن بچوں سے ناانصافی کی گئی ہو ماں باپ کے بارے میں ان کے دل میں کینہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے وہ کسی ردّ عمل کا مظاہرہ کریں اور نافرمانی و سرکشی پر اتر آئیں۔

۳۔ غیر عادلانہ سلوک سے بہن بھائیوں کے درمیان حسد اور دشمنی پیدا ہو جائے گی اور وہ ہمیشہ لڑتے جھگڑتے رہیں گے۔ ممکن ہے وہ کسی سخت ردّ عمل کا اظہار کریں اور کسی مسئلے پر شرارت اور زیادتی کے مرتکب ہوں۔

۴۔ وہ بچے جن سے ناانصافی کی گئی ہے، احساس محرومی و مظلومی کا شکار ہو جاتے ہیں اور بات اُن کے دل میں بیٹھ جاتی ہے۔ ممکن ہے یہی بات اُن کی پریشانی، اضطراب، بے چینی، اعصاب کی کمزوری اور متعدد نفسیاتی بیماریوں کا باعث بن جائے۔

ان تمام قباحتوں کے ذمہ دار وہ ماں باپ ہیں جنہوں نے عدل و مساوات کے لازمی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے فرق روا رکھا ہو۔

البتہ ماں باپ اپنی تمام اولاد کے ساتھ ایک جیسا سلوک نہیں کر سکتے۔ مختلف عمر میں بچوں کی ضروریات مختلف ہوتی ہیں۔ مختلف ادوار اور مختلف جنس ہونے کے اعتبار سے بھی ان کی ضروریات ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ عدل و مساوات کا قانون بھی ایسے مواقع پر ایک جیسے سلوک کا تقاضا نہیں کرتا۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ بڑے بچے کو گود میں لیا جائے اور اُس سے دودھ پیتے بچے کی طرح پیار کیا جائے؟ اسی طرح کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تین سالہ بچے کو اُتنا ہی جیب خرچ دیا جائے جتنا اٹھارہ سالہ بچے کو دیا جاتا ہے؟ کیا بیٹی بھی بیٹے کی طرح آزادی سے آنے جانے اور ملنے جلنے کا حق رکھتی ہے؟ عدالت و مساوات بھی اس بات کا تقاضا نہیں کرتی اور ہم بھی اس بات کا مشورہ نہیں دیتے۔

بہرحال ماں باپ کو چاہیے کہ وہ پوری طرح سے عقل و تدبیر کے ساتھ ایسے سلوک کا انتخاب کریں کہ جس سے اُن کے بچے ناانصافی کا احساس نہ کریں یہ بات حسد کی بحث میں بیان کی گئی ہے اس حصّے کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

ایک صاحب اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

..... بچپن کی یہ یاد تو بہت ہی تلخ ہے کہ جسے میں فراموش نہیں کر سکتا۔ ابو میرے اور بھائی کے درمیان فرق روا رکھتے تھے اس کی پوری خواہشوں پر عمل کرتے اور میری طرف اعتنا نہ کرتے۔ اس کا احترام کرتے اور میری توہین کرتے۔ اسے مجھ سے زیادہ پیار کرتے اور اس پر نوازشیں کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابو اور بھائی مجھے بہت برے لگنے لگے۔ میرا دل چاہتا کہ اس غیر انسانی سلوک پر ابو سے بدلہ لوں لیکن یہ کام میرے بس میں نہ تھا۔ پریشانی کے مارے ہر وقت میں تنہا تنہا رہتا۔ مہمان خانے میں چلا جاتا۔ دیواروں میں کہیں تھوکتا اور انہیں خراب کرتے رہتا۔ شیشے توڑ دیتا۔ اور کیا کرتا؛ کچھ اور کر نہیں سکتا تھا۔ لیکن ابو کو اس بات کا خیال بھی نہ تھا اور انہیں ہرگز پتہ نہ تھا کہ میں یہ نقصان ان کو پہنچا رہا ہوں۔

ایک خاتون اپنی ڈائری میں لکھتی ہیں:

..... ہمارے قریبی عزیزوں میں سے ایک خاتون کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک زیادہ لائق تھی اور دوسری کچھ کم۔ دونوں سکول جاتیں۔ بڑی بیٹی جو زیادہ باصلاحیت نہ تھی کم نمبر لاتی اور چھوٹی زیادہ نمبر لاتی۔ ماں جس کے پاس بھی بیٹھتی چھوٹی کی تعریف کرتی رہتی اور بڑی کو برا بھلا کہتی۔ چھوٹی کو زیادہ نوازتی، شاباش کہتی اور بڑی سے کہتی تمہارے سر میں خاک! کیا فضول لڑکی ہو۔ پیسے حرام کرتی ہو اور سبق یاد نہیں کرتی ہو۔ کھانا کھانے اور لباس بدلنے کا تمہیں کیا فائدہ۔ بدبخت، سست آخر کیا بنو گی،

وہی بڑی بیٹی اب شادی شدہ ہے۔ اس کے چند بچے ہیں۔ وہ ایک معمول کی خاتون نہیں ہے۔ بیمار سی لگتی ہے۔ احساس کمتری کا شکار ہے چپ چپ اور ڈری ڈری رہتی ہے۔ کسی دعوت میں ہو تو کونے میں جا بیٹھتی ہے اور بات نہیں کرتی۔ جب میں اس سے کہتی ہوں کہ تم بھی کچھ کہو۔ تو آہ بھرتی ہے۔ کہتی ہے کیا کہوں اس کی شادی سے پہلے کی بات ہے کہ میں ایک مرتبہ اسے اعصاب کے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔

ڈاکٹر نے معائنہ اور اس سے گفتگو کے بعد کہا! یہ صاحبہ مریض نہیں ہے بلکہ اس کے ماں باپ مریض ہیں جنہوں نے اس بے گناہ بیٹی کو ان دنوں تک پہنچایا ہے۔

ایک دن ڈاکٹر نے اُس سے پوچھا کہ کھانا پکا لیتی ہو وہ رونے لگی اور اس نے کہا پکا لیتی ہوں لیکن جب بھی کھانا پکاتی ہوں تو امی ابو پرواہ نہیں کرتے! کہتے ہیں! ماشاءاللہ اس کی بہن خوب کھانا پکاتی ہے۔

بچّوں کا احترام

بچہ بھی ایک انسان ہوتا ہے اور ہر انسان کو اپنے آپ سے محبت ہوتی ہے۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے اس کی قدر جانیں اور اس کا احترام کریں۔ دوسرے جب اس کا احترام کرتے ہیں تو وہ اسے اپنی بڑائی سمجھتا ہے اور اسے ایک طرح کی قدر دانی سمجھتا ہے۔ جن ماں باپ کو اپنی اولاد سے محبت ہے انہیں چاہیے کہ ہمیشہ ان کا احترام ملحوظ رکھیں اور ان کے وجود کو اہمیت دیں۔ بچے کی تربیت میں اس کا احترام اہم عوامل میں سے شمار کیا جاتا ہے۔ جس بچے کو عزت و احترام میسر ہو وہ بزرگوار، شریف اور باوقار بنتا ہے۔ اور اپنے مقام کی حفاظت کے لیے بُرے کاموں سے بچتا ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ اچھے اچھے کام کرکے دوسروں کی نظر میں اپنے مقام کو اور بھی بڑھائے تاکہ اس کی زیادہ سے زیادہ عزت کی جائے۔ جس بچے کا ماں باپ احترام کرتے ہوں وہ اپنے عمل میں ان کی تقلید کرتا ہے اور ماں باپ کا اور دوسرے لوگوں کا احترام کرتا ہے۔ بچہ ایک چھوٹا سا انسان ہے اسے اپنی شخصیت سے پوری محبت ہے۔ توہین اور تحقیر سے آزردہ خاطر ہو جاتا ہے۔ ماں باپ جس بچے کی توہین و تحقیر کرتے ہوں اس کے دل میں ان کے بارے میں کینہ پیدا ہو جاتا ہے اور جلد یا بدیر وہ سرکش اور نافرمان بن جاتا ہے اور ان سے انتقام لیتا ہے۔ نادان ماں باپ کہ بدقسمتی سے جن کی تعداد کم نہیں سمجھتے ہیں کہ بچوں کا احترام ان کی تربیت کے منافی ہے، ماں باپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے بچے کا احترام کیا تو وہ بگڑ جائے گا۔ اور پھر ہمارا احترام نہیں کرے گا۔ وہ بچوں سے بے اعتنائی

اور ان کی بے احترامی کو ان کی تربیت کا ذریعہ شمار کرتے ہیں اس طرح وہ ان کی شخصیت کو کچل دیتے ہیں اور ان کے دل میں احساس کمتری پیدا کر دیتے ہیں۔ جب کہ یہ روش تربیت کے حوالے سے بہت بڑا اشتباہ ہے اگر ماں باپ بچے کا احترام کریں تو اس سے نہ صرف یہ کہ ان کا مقام بچے کی نظر میں کم نہ ہوگا بلکہ اس طرح سے اُس کے اندر بھی بزرگواری اور وقار کی روح پروان چڑھے گی۔ بچہ اسی بچپن سے سمجھنے لگتا ہے کہ ماں باپ اسے ایک انسان سمجھتے ہیں اور اس کی اہمیت کے قائل ہیں۔ اس طرح سے جو کام معاشرے میں اچھے نہیں سمجھے جاتے وہ ان سے بچتا ہے۔ وہ اچھے کام کرتا ہے تاکہ اپنے مقام کو محفوظ رکھے۔ یہ بات باعث افسوس ہے کہ ہمارے معاشرے میں بچوں کا جس طرح سے احترام ہونا چاہیے نہیں کیا جاتا اور انہیں خاندان کا ایک باقاعدہ جزو شمار نہیں کیا جاتا۔ یہاں تک کہ دعوتوں میں بچے ماں باپ کے طفیلی ہوتے ہیں انہیں باقاعدہ دعوت نہیں دی جاتی۔ اور انہیں کسی نچلی جگہ پر یا کمرے کے دروازے کے ساتھ جگہ ملتی ہے اور ان کے لیے باقاعدہ پلیٹ، چمچ وغیرہ پیش نہیں کیا جاتا۔ آتے وقت اور جاتے وقت کوئی ان کا احترام نہیں کرتا۔ گاڑی میں ان کے لیے مخصوص نشست نہیں ہوتی۔ یا تو وہ کھڑے ہوں یا ماں باپ کی گود میں بیٹھے ہوں۔ محفل میں انہیں بات کرنے کا حق نہیں ہوتا اگر وہ بات کریں بھی تو کوئی ان کی سنتا نہیں انہیں بے احترامی سے بلایا جاتا ہے۔ میل ملاقات اور بات چیت میں ان سے مؤدبانہ سلوک نہیں کیا جاتا۔ ان کے لیے سلام، خوش آمدید، خداحافظ اور شکریہ نہیں ہوتا۔ ان کی خواہش کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ گھریلو امور میں ان سے مشورہ نہیں لیا جاتا۔ گھٹیا اور توہین آمیز کام کرنے کے لیے ان سے کہا جاتا ہے۔

دین مقدس اسلام نے بچوں کی طرف پوری توجہ دی ہے اس نے بچوں کا احترام کرنے کا حکم دیا ہے۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

اپنی اولاد کی عزت کرو اور ان کی اچھی تربیت کرو تاکہ اللہ تمہیں بخش دے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

سب سے گھٹیا انسان وہ ہے جو دوسروں کی توہین کرے [۱]

رسول اللہ ہمیشہ اور ہر جگہ بچوں سے محبت اور شفقت سے پیش آتے۔ جب وہ سفر سے واپس آتے تو بچے ان کے استقبال کے لیے دوڑتے۔ رسول اللہ ان سے پیار کرتے، محبت کرتے اور ان میں سے بعض کو اپنے ساتھ سوار کر لیتے اور اپنے اصحاب سے بھی وہ کہتے کہ دوسروں کو وہ سوار کر لیں۔ اور اس حال میں شہر کے اندر لوٹتے۔

بچوں سے یہاں تک شیر خوار بچوں کی توہین سے بھی سختی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ام الفضل کہتی ہیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسین علیہ السلام کو جب کہ وہ شیر خوار تھے مجھ سے لے لیا۔ اور سینہ سے لگا لیا۔ حسین علیہ السلام نے رسول کے کپڑوں پر پیشاب کر دیا میں نے حسین کو رسول اللہ سے زبردستی لے لیا۔ اس طرح سے کہ وہ رونے لگے۔ رسول اللہ نے مجھ سے فرمایا ام الفضل! آرام سے اس پیشاب کو پانی پاک کر دے گا لیکن حسین علیہ السلام کے دل سے ناراضی اور ناراحتی کون دور کرے گا؟ [۳]

ایک صاحب لکھتے ہیں:

ماں باپ کی نظر میں میری کوئی اہمیت نہ تھی۔ نہ صرف وہ میرا احترام نہ کرتے تھے بلکہ اکثر میری توہین اور سرزنش کرتے رہتے کاموں میں مجھے شریک نہ کرتے اور اگر میں کوئی کام انجام دیتا تو اس میں سے کیڑے نکالتے۔ دوستوں کے سامنے یہاں تک کہ میرے دوستوں کے سامنے میری بے عزتی کر دیتے۔ مجھے دوسروں کے سامنے بولنے کی اجازت نہ دیتے۔ اس وجہ سے ہمیشہ میرے دل میں اپنے بارے میں احساس ذلت وحقارت رہتا۔ میں اپنے تئیں ایک فضول اور اضافی چیز سمجھتا۔ اب جب کہ میں بڑا ہو گیا ہوں

---

[۱] بحار، ج ۷۴، ص ۱۴۲، ص ۲۵
[۲] غرر الحکم، ص ۱۸۹
[۳] ہدیۃ الاحباب، ص ۱۷۶

اب بھی میری وہی کیفیت باقی ہے۔ بڑے کام سامنے آجائیں تو میں اپنے آپ کو کمزور سمجھنے لگتا ہوں کاموں کی انجام دہی میں فیصلہ نہیں کرپاتا۔ میں اپنے تئیں کہتا ہوں میری رائے چونکہ درست نہیں ہے اس لیے دوسروں کو میرے بارے میں اظہار رائے کرنا چاہیے۔ اپنے تئیں حقیر و ناچیز سمجھتا ہوں مجھے اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہے یہاں تک کہ دوستوں کی موجودگی میں مجھ میں بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی اور اگر کچھ کہہ بیٹھوں تو کئی گھنٹے سوچتا رہتا ہوں کہ کیا میری بات درست تھی اور صحیح موقع پر تھی۔

خودشناسی اور بامقصد زندگی

حیوان کی ساری زندگی کھانے، سونے، خواہشات نفس کی تکمیل اور اولاد پیدا کرنے سے عبارت ہے۔ حیوان کی عقل اور آگاہی کامل نہیں ہوتی وہ اچھائی اور بُرائی میں تمیز نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس پر کوئی فرض اور ذمہ داری نہیں ہے اس کے لیے کوئی حساب وکتاب اور ثواب وعذاب نہیں ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی عاقلانہ پروگرام اور مقصد نہیں ہوتا۔ لیکن انسان کہ جو اشرف المخلوقات ہے وہ حیوان کی طرح نہیں ہے۔ انسان عقل، شعور اور آگہی رکھتا ہے۔ اچھے، بُرے، خوبصورت اور بدصورت میں تمیز کر سکتا ہے۔ انسان کو ایک دائمی اور جاوید زندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے نہ کہ نابودی اور فنا کے لیے۔ اس اعتبار سے اس کے سر پہ ذمہ داری بھی ہے اور فرض بھی۔ انسان خلیفۃ اللہ ہے اور امین الٰہی ہے۔ انسان کی زندگی کا حاصل فقط کھانا، سونا، خواہشات کی تکمیل اور نسل بڑھانا ہی نہیں ہو سکتا انسان کو ایسے راستے پر چلنا چاہیے کہ وہ فرشتوں سے بالاتر ہو جائے۔ وہ انسان ہے اسے چاہیے کہ اپنی انسانیت کو پروان چڑھائے اور اس کی تکمیل کرے۔ انسان کی زندگی کا کوئی مقصد ہے البتہ ایک بلند ہدف نہ کہ پست حیوانی ہدف۔ انسان رضائے خدا کے لیے اور مخلوق خدا کی خدمت کے لیے کوشش اور جدوجہد کرتا ہے نہ کہ زودگزر دنیاوی مفادات کے حصول کے لیے۔ انسان متلاشی حق اور پیروحق ہے۔

ہاں! انسانی وجود ایسا گوہر گراں بہا ہے کہ جو حیوانات سے بہت ممتاز ہے یہ امر بہت افسوسناک ہے کہ بہت سے انسانوں نے اپنی اس انمول انسانی قیمت کو گنوا دیا ہے۔

اور اپنی قیمتی زندگی کو ایک حیوان کی طرح سے گزار رہے ہیں اور ان کی نظر میں حیوانوں کی طرح سے کھانے، پینے، سونے اور خواہشات نفسانی کی تکمیل کے علاوہ کوئی ہدف نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک انسان سو سال زندہ رہے لیکن اپنی انسانی قیمت کو نہ پہچان سکے اور اپنے بارے میں جاہل ہی مر جائے۔ دنیا میں ایک حیوان کی صورت آئے اور ایک حیوان کی صورت چل بسے! بے مقصد اور سرگرداں رہے اور اس کی ساری جد و جہد کا نتیجہ بدبختی کے علاوہ کچھ نہ نکلے۔

انسان کو جاننا چاہیے کہ وہ کون ہے؛ کہاں سے آیا ہے؛ اور کہاں جانا ہے؛ اس کے آنے کا مقصد کیا ہے؛ اور اس کو کس راستے پر چلنا چاہیے۔ اور اس کے لیے حقیقی کمال اور سعادت کیا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

بہترین معرفت یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو پہچان لے اور سب سے بڑی نادانی یہ ہے کہ اپنے آپ کو نہ پہچانے[1]

امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

جس نے اپنے آپ کو نہ پہچانا وہ راہ نجات سے دور اور جہالت و گمراہی کے راستے پر رہا[2]

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

خدا کے نزدیک انسانوں میں سے ناپسندیدہ ترین شخص وہ ہے کہ جس کا زندگی میں مقصد شکم سیری اور خواہشات نفسانی کی تکمیل کے علاوہ کچھ نہ ہو[3]

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

---

[1] غرر الحکم، ص ۱۷۹

[2] غرر الحکم، ص ۷۰۰

[3] غرر الحکم، ص ۲۰۵

"جس نے اخروی سعادت کو اپنا مقصد بنالیا وہ بلند ترین خوبیوں کو پالے گا" [1]

ماں باپ کو چاہیے خود شناسی اور بامقصدیت کا درس بچے کو دیں، وہ تدریجاً اپنی اولاد کی تعبیر کر سکتے ہیں اور انہیں بامقصد اور خود شناس بنا سکتے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی اولاد کو انسانیت کا بلند مقصد سمجھا سکتے ہیں اور ان کے سامنے زندگی کا مقصد واضح کر سکتے ہیں۔ بچے کو ماں باپ کے ذریعے رفتہ رفتہ یہ سمجھنا چاہیے وہ کون ہے؟ کیا تھا؟ کہاں سے آیا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ آخر کار اسے کہاں جانا ہے۔ اس دنیا میں اس کی ذمہ داری اور فریضہ کیا ہے۔ اور اسے کس پروگرام اور ہدف کے تحت زندگی گزارنا چاہیے اس کی خوش نصیبی اور بدنصیبی کس میں ہے۔ اگر ماں باپ خود شناس ہوں اور ان کی اپنی زندگی بامقصد ہو اور وہ اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ ہوں تو وہ خود شناس اور بامقصد انسان پروان چڑھا سکتے ہیں۔

---

[1] غرر الحکم، ص ۶۹۳

گھر کی آمدنی اور خرچ

کسی گھر کے انتظامی امور میں سے اہم ترین اس کا معاشی پہلو ہے اور گھر کی آمدن اور خرچ کا حساب ہے اور باسمجھ خاندان آمد و خرچ کے حساب کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اور آمدنی کے مطابق خرچ کرتے ہیں۔ ہر خاندان کو جاننا چاہیے کہ پیسہ کس راستے پر خرچ کرے سمجھدار خاندان قرض سے ہمیشہ بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور پریشانیوں میں گرفتار نہیں ہوتے اور زندگی آرام سے اور دردِ سر کے بغیر گزارتے ہیں۔ ان کے اقتصادی حالات خراب بھی ہوں تو تدریجاً انہیں بہتر بناتے ہیں۔ اور زندگی کو فقر و بے سر و سامانی سے نکال لیتے ہیں۔

اس کے برعکس جس خاندان کا معاشی اعتبار سے، اور آمدن و خرچ کے اعتبار سے نظام درست نہ ہو اور اس کے افراد بغیر کسی حساب کے خرچ کرتے ہوں تو ایسا خاندان عموماً دوسروں کا مقروض اور مرہون رہتا ہے، اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے ایسا خاندان ناچار سودی قرض لیتا ہے۔ یا قرض پر مہنگی چیزیں خریدتا ہے۔ یعنی دوسروں کے لیے زحمت اٹھاتا ہے۔ ایسے خاندان کی زندگی زیادہ تر خوش نہیں گزرتی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زندگی کی ابتدائی ضروریات سے محروم رہے اور ان کی زندگی کی حالت مناسب نہ ہو۔ اگرچہ اس کی آمدنی اچھی ہی کیوں نہ ہو لیکن چونکہ ان کے گھر میں کوئی عقل و تدبیر نہیں ہوتی اور ایسے گھر کے لوگ ہوس اور بلند پروازی کا شکار ہوتے ہیں لہٰذا زیادہ تر گرفتارِ بلا ہی رہتے ہیں۔ کسی خاندان کی خوشحالی اور آسائش صرف کما کر لانے پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس سے بھی اہم عقل و تدبیر اور کسی منظم معاشی پروگرام کے مطابق اس کو خرچ کرنا ہے۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:
"جب اللہ کسی خاندان کے لیے بھلائی اور سعادت چاہتا ہے تو انہیں زندگی میں تدبیر اور سلیقہ عطا کر دیتا ہے" [1]

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:
"تمام کمالات تین چیزوں میں جمع ہیں
ان میں سے ایک زندگی میں فہم و تدبیر (سے) اور معاشی امور میں عقل (سے کام لینا) ہے [2]

حضرت صادق علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:
"فضول خرچی غربت و ناداری کا باعث بنتی ہے اور زندگی میں اعتدال اور میانہ روی بے نیازی اور استغناء کا باعث بنتے ہیں" [3]

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:
اعتدال سے آدھی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں [4]

امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:
فضول خرچ کی تین نشانیاں ہیں۔
۱۔ جو چیز اس کے پاس نہیں ہوتی وہ کھاتا ہے،
۲۔ جس چیز کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں ہوتے وہ خریدتا ہے اور
۳۔ جس لباس کی قیمت ادا نہیں کر سکتا اسے پہنتا ہے [5]

---

[1] کافی، ج ۵، ص ۸۸
[2] کافی، ج ۵، ص ۸۷
[3] وسائل، ج ۱۲، ص ۴۱
[4] مستدرک، ج ۲، ص ۴۲۴
[5] وسائل، ج ۱۲، ص ۴۱

گھر کے مالی امور کو منظم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے میاں بیوی کے درمیان ہم آہنگی پائی جائے اگر میاں یا بیوی گھر کی آمدنی کو مدنظر نہ رکھیں اور بغیر کسی حساب کتاب کے خرچ کریں تو ان کے گھر کا کام نہیں چل سکتا۔

دوسرے درجے پر بچوں میں بھی باہمی تعاون اور ہم آہنگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ گھر کے بچے بھی اگر آمدنی کو پیش نظر نہ رکھیں اور بغیر کسی حساب کتاب کے خرچ کریں تو بھی خاندان مشکلات اور مصائب کا شکار ہو جائے گا۔

ماں باپ کو چاہیے کہ مالی امور میں اپنے بچوں کے ساتھ ہم فکری پیدا کریں اور انہیں گھر کی آمدنی اور خرچ سے آگاہ کریں۔ بچوں کو تدریجاً یہ بات سمجھنا چاہیے کہ پیسے آسانی اور ایسے ہی ہاتھ نہیں آجاتے بلکہ اس کے لیے محنت صرف ہوتی ہے۔ انہیں جاننا چاہیے کہ باپ زحمت اٹھاتا ہے اور ہر روز کام پر جاتا ہے تاکہ پیسے کما کر لائے اور گھر کے اخراجات پورے کرے۔ اور اگر ماں بھی کہیں کام یا ملازمت کرتی ہو تو یہ بات بھی بچوں کو سمجھنا چاہیے اور اگر ماں خانہ دار ہو تو بچوں کو یہ بھی جاننا چاہیے کہ گھر کا نظام آسانی سے نہیں چلتا بلکہ اس کی ماں شب و روز محنت کرتی ہے۔

چاہیے کہ بچے آہستہ آہستہ ماں باپ کے کام اور گھر کی آمدنی کی مقدار کو جانیں انہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ ماں باپ کی آمدنی ہی سے گھر کے سارے اخراجات پورے ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ ان کے لیے کوئی اور راستہ نہیں اور انہیں یہ سمجھنا چاہیے کہ گھر کے تمام اخراجات کو ان پیسوں کے اندر پورا ہونا چاہیے اور سارے اخراجات ایک ہی سطح کے نہیں ہوتے بلکہ بعض اخراجات کو ترجیح دینا پڑتی ہے مثلاً مکان کا خرچ یا مکان کا کرایہ، پانی اور بجلی کا بل، روٹی اور کپڑے کے پیسے، گھر میں روزمرہ کی ضروریات کا سامان اور ڈاکٹر کی فیس دیگر ضروریات پر مقدم ہیں۔ پہلے مرحلے میں زندگی کی ضروریات پوری کرنا چاہئیں باقی چیزیں بعد میں آتی ہیں۔ باقی چیزیں بھی ایک سطح کی نہیں ہوتیں بچوں کو یہ بات سمجھنی چاہیے اور ماں باپ کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔

بچوں کو ابتدائی زندگی ہی سے اس امر کا عادی بنایا جانا چاہیے کہ ان کی خواہشات

اور توقعات کو گھر کی آمدنی سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ انہیں بے جا خواہشات اور بڑھ چڑھ کر خرچ کرنے سے بچنا چاہیے۔ انہیں چاہیے کہ اپنے آپ کو گھر کا ایک باقاعدہ فرد سمجھیں اور گھر کا خرچ چلانے میں اپنے آپ کو شریک سمجھیں۔ وہ یہ نہ سمجھنے لگ جائیں کہ ہم کوئی بلند مرتبہ لوگ ہیں اور ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ ہمارے خرچے پورے کریں۔ بچوں کو صرف اپنی خواہشات کو پیش نظر رکھ کر گھر کی باقی ضروریات کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے۔ بچے کو اوائل عمر ہی سے اپنی خواہشات سے چشم پوشی کر کے گھر کی ضروریات کو ترجیح دینے کی عادت پڑنی چاہیے۔

انہیں بچوں نے آئندہ بڑے ہو کر نظام چلانا ہے۔ لہٰذا انہیں ابھی سے فضول خرچ نہیں ہونا چاہیے گھر کی مالی حالت خوب اچھی ہی کیوں نہ ہو پھر بھی ماں باپ کو نہیں چاہیے کہ وہ بچوں کو اجازت دیں کہ وہ بے حد و حساب خرچ کرتے رہیں۔ انہیں چاہیے کہ بچوں کو سمجھائیں کہ سب لوگ ایک خاندان کے فرد ہیں اور امیروں کو چاہیے کہ غریبوں کی مدد کریں اور اگر کوئی کم آمدنی والا خاندان ہے اور مشکل سے روزانہ کے اخراجات پورے ہوتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ اپنی روزانہ کی آمدن کے مطابق اخراجات کریں۔ البتہ انہیں نہیں چاہیے کہ اپنی مشکلات کی شکایت اپنے بچوں سے کریں بلکہ انہیں صبر و استقامت کا درس دیں اور انہیں آئندہ زندگی کو بہتر کرنے کے لیے آمادہ کریں۔ جب بچے میں کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو اسے کام کرنے پر ابھاریں بچے سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر تم بھی کام کرو گے تو اس سے آمدنی ہوگی اور پھر ہمارے گھر کے حالات بھی بہتر ہو جائیں گے۔ بچے کو یہ عادت ڈالیں کہ وہ اپنی آمدنی کا کچھ حصہ گھر میں دے دے کیونکہ وہ اسی خاندان کے ساتھ مل کر رہتا ہے بچے میں مفت خوری کی عادت نہیں پیدا ہونی چاہیے۔ بچوں کا جیب خرچ بھی گھر کی آمدنی کے مطابق ہونا چاہیے۔

قانون کا احترام

لوگ قانون کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتے۔ معاشرے کے نظام کو چلانے کے لیے برائیوں کو روکنے کے لیے لوگوں کی جان ومال کی حفاظت کے لیے اور عوام کے آرام و آسائش کے لیے قانون ضروری ہے جن ملکوں میں قانون بنانے والے افراد اور عوام کے اچھے باہمی ربط ہوتے ہیں اور جہاں لوگوں کے لیے قانون بنائے گئے ہیں وہاں لوگ قانون کا احترام بھی کرتے ہیں اور قانون کے احترام سے ہی ملک میں امن وامان اور عوام کی زندگی کے لیے آرام وراحت وجود میں آتا ہے۔

لیکن جن ملکوں میں قانون بنانے والے لوگ حکومتوں کے مفادات کے لیے قانون بناتے ہوں اور عوام کے حقیقی مفادات ان کی نظر میں نہیں ہوتے وہاں عوام کی نظر میں قانون کا کوئی احترام بھی نہیں ہوتا اور ملک بھی امن اور چین سے محروم رہتا ہے۔ بدقسمتی سے پہلے ہمارے ملک کی بھی یہی حالت تھی۔ بیشتر قوانین اسلامی اور عوامی نہ تھے بلکہ حکومتوں کی خواہش پہ اور مغرب ومشرق کی سامراجی طاقتوں اور ان کے چیلوں کے فائدے میں قانون بنتے تھے۔ مزدور، محنت کش اور محروم افراد کے حقیقی مفادات کی طرف کوئی توجہ نہ تھی۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ رعب ودبدبہ سے اور مکر وفریب سے عوام دشمن قوانین ہی کو عوام پہ نافذ کریں۔ لیکن ایران کے مسلمان عوام چونکہ ان قوانین کو اسلامی اور اپنے مفادات کا محافظ نہیں سمجھتے تھے۔ لہٰذا ان کی نظر میں ان کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ البتہ ان قوانین میں کچھ عوامی فائدے کے قوانین بھی موجود تھے لیکن چونکہ عوام کا ان پر اعتماد نہیں تھا لہٰذا ان کا احترام بھی نہیں کرتے تھے۔ البتہ جائز

صحیح اور سودمند قانون کا احترام ضروری ہے اور ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ یہ بات اپنی اولاد کو سمجھائیں۔ جب بچہ اپنے ماں باپ کو دیکھتا ہے کہ وہ سڑک پار کرتے ہوئے سڑک پار کرنے کی معینہ جگہ (زیبرا کراسنگ) ہی سے سڑک پار کرتے ہیں تو اسے بھی اس کی عادت پڑ جاتی ہے اور پھر وہ اس کی خلاف ورزی کو اچھا نہیں سمجھتا۔

خصوصاً ماں باپ کو چاہیے کہ بچوں کو سمجھائیں سڑک کو استعمال کرنا ڈرائیوروں کا حق ہے اور زیبرا کراسنگ پیدل چلنے والوں کا حق ہے اور دوسرے کے حق پر تجاوز درست نہیں ہے۔ جب بچہ یہ سمجھ جاتا ہے کہ قانون پر عمل درآمد خود اس کے اور معاشرے کے فائدے میں ہے تو پھر تدریجاً ماں باپ کے عمل کو دیکھتے ہوئے اس کے اندر بھی اس بات کی عادت پڑ جاتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"عادت فطرت ثانیہ ہے"[1]

---

[1] غرر الحکم، ص ۲۶

ادب

ہر ماں باپ کی یہ حتمی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے مہذب ہوں اچھے اور با ادب بچے ہر ماں باپ کی سربلندی کا ذریعہ ہوتے ہیں اور وہ ان پہ فخر کرتے ہیں۔ جو بچے دوسروں سے ملاقات کے موقع پہ سلام کرتے ہیں اور جدا ہونے پہ خدا حافظ کرتے ہیں۔ مصافحہ کرتے ہیں۔ حال پوچھتے ہیں، پیار سے انداز سے بات کرتے ہیں، بزرگوں کا احترام کرتے ہیں۔ ان کے آنے پہ احتراماً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ صاحبان علم، با تقوی اور نیک افراد کا احترام کرتے ہیں۔ محفل میں مؤدب رہتے ہیں شور نہیں کرتے اور اگر کوئی کچھ دے تو اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ کسی کو گالی نہیں دیتے، دوسروں کو تکلیف نہیں پہنچاتے، دوسروں کی بات نہیں کاٹتے، کھانے کے آداب ملحوظ رکھتے ہیں۔ بسم اللہ کہتے ہیں۔ چھوٹے نوالے لیتے ہیں، آہستہ آہستہ چباتے ہیں، اپنے سامنے سے کھاتے ہیں، زیادہ نہیں کھاتے، کھانا زمین پر نہیں پھینکتے، اپنے ہاتھوں اور لباس کو خراب نہیں کرتے، صاف ستھرے اور پاکیزہ رہتے ہیں کسی کی توہین نہیں کرتے۔ دوسروں کا لحاظ کرتے ہیں اور صحیح طریقے سے بیٹھتے اور اٹھتے ہیں، صحیح انداز سے چلتے ہیں۔ اطاعت شعار اور فرماں بردار ہوتے ہیں۔ کسی کا تمسخر نہیں اڑاتے۔ اور دوسروں کی بات کان لگا کر سنتے ہیں ایسے بچے با ادب ہوتے ہیں۔

نہ صرف والدین بلکہ سب لوگ با ادب بچوں سے پیار کرتے ہیں اور گستاخ اور بے ادب بچوں سے نفرت۔

امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ادب انسان کا کمال ہے"۔[1]

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں،

"ادب انسان کے لیے خوبصورت لباس کے مانند ہے"[2]

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"لوگوں کو اچھے آداب کی سونے اور چاندی سے زیادہ ضرورت ہے"[3]

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں،

"ادب سے بڑھ کے کوئی زینت نہیں"[4]

امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"باپ کی بہترین وراثت اپنے بچے کے لیے یہ ہے کہ اسے اچھے آداب کی تربیت دے"[5]

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"بے ادب شخص میں برائیاں زیادہ ہوں گی"[6]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"سات سال تک اپنے بچے کو کھیلنے کی اجازت دو اور سات سال سے آداب زندگی سکھاؤ"[7]

---

[1] غرر الحکم، ص ۴۴
[2] غرر الحکم، ص ۲۱
[3] غرر الحکم، ص ۲۴۲
[4] غرر الحکم، ص ۸۳۰
[5] غرر الحکم، ص ۳۹۳
[6] غرر الحکم، ص ۶۳۴
[7] بحار، ج ۱۰۴، ص ۹۵

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں،

"بچے کے والدین پر تین حق ہیں،

۱۔ اس کے لیے اچھا نام منتخب کریں،

۲۔ اسے با ادب بنائیں اور

۳۔ اس کے لیے اچھا شریک حیات انتخاب کریں" [۱]

ہر ماں باپ کی انتہائی آرزو یہ ہوتی ہے کہ ان کی اولاد با ادب ہو لیکن یہ آرزو خود بخود اور بغیر کوشش کے پوری نہیں ہو سکتی اور نہ ہی زیادہ وعظ و نصیحت سے بچوں کو مؤدب بنایا جا سکتا ہے۔ اس مقصد تک پہنچنے کے لیے بہترین راستہ ان کے لیے اچھا نمونۂ عمل مہیا کرنا ہے۔ ماں باپ کو خود مؤدب ہونا چاہیے۔ تاکہ وہ اپنی اولاد کو عملی سبق دے سکیں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"بہترین ادب یہ ہے کہ اپنے آپ سے آغاز کرو" [۲]

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اپنے آپ سے تعلیم کا آغاز کرنا چاہیے اور پھر دوسروں کو تعلیم دیں۔ پہلے اپنے کردار کو مؤدب بنائیں پھر دوسروں کو وعظ و نصیحت کریں" [۳]

بچہ تو نرا مقلد ہوتا ہے۔ تقلید کی فطرت اس کے اندر بہت اہم اور طاقتور ہوتی ہے۔ بچہ ماں باپ اور دوسرے لوگوں کے گفتار و کردار کی پیروی کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تلقین بھی تربیتی عوامل میں سے ایک ہے۔ لیکن تقلید انسانی جبلت میں زیادہ قوی اور طاقتور ہوتی ہے خصوصاً بچپن میں جن ماں باپ کی خواہش ہے کہ ان کے بچے مؤدب ہوں انہیں چاہیے کہ پہلے اپنے طرز عمل کی اصلاح کریں وہ با ادب ماں باپ بنیں۔ انہیں چاہیے کہ

---

[۱] وسائل، ج ۱۵، ص ۱۲۳

[۲] غرر الحکم، ص ۱۹۱

[۳] نہج البلاغہ، ج ۳، ص ۱۶۶

ایک دوسرے سے، اپنے بچوں سے اور تمام لوگوں سے مؤدبانہ طرز عمل اختیار کریں۔ اور آداب زندگی کی پابندی کریں تاکہ بچے ان سے سبق حاصل کریں ان سے درس حیات حاصل کریں۔ اگر ماں باپ آپس میں ایک دوسرے سے باادب ہوں، گھر میں آداب و اقدار کو ملحوظ رکھتے ہوں، بچوں سے بھی باادب رہتے ہوں لوگوں سے مؤدبانہ طریقہ سے میل ملاقات کرتے ہوں ایسے گھر کے بچے فطری طور پر مؤدب ہوں گے۔ وہ ماں باپ کا طرز عمل دیکھیں گے اور اسے اپنے لیے نمونہ عمل بنائیں گے اور اس کے لیے ان کو وعظ و نصیحت کی ضرورت نہیں ہوگی۔

جو ماں باپ خود آداب کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ انہیں بچوں سے بھی ادب کی توقع نہیں کرنی چاہیے اگرچہ سینکڑوں مرتبہ انہیں نصیحت کریں۔ جو ماں باپ ایک دوسرے کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتے ہیں اور خود اپنے بچوں کے ساتھ بھی غیر مؤدبانہ سلوک کرتے ہیں وہ کیسے توقع کرسکتے ہیں کہ ان کے بچے باادب ہوں۔

ایسے گھر کے بچے زیادہ تر ماں باپ کی طرح یا ان سے بھی زیادہ بے ادب ہوں گے اور انہیں اچھی تلقین اور وعظ و نصیحت کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بچے بھی سوچتے ہیں کہ اگر ماں باپ کی بات صحیح ہوتی تو وہ خود عمل نہ کرتے لہذا یہ ہمیں دھوکا دے رہے ہیں۔

البتہ تلقین بالکل بے اثر نہیں ہوتی لیکن اس کا پورا اثر اس وقت ہوتا ہے کہ جب بچے اس کا نمونہ عمل دیکھیں۔ باادب ماں باپ بچوں کو اچھے آداب کی نصیحت بھی کرسکتے ہیں۔ لیکن اچھے انداز سے۔ ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے، تندی، بدتمیزی اور بے ادبی سے نہیں۔ بعض ماں باپ کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ بچوں کا کوئی خلاف ادب کام دیکھتے ہیں تو دوسروں کی موجودگی میں ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں اور برا بھلا کہتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں او بے ادب! تو نے سلام کیوں نہیں کیا؟ خدا حافظ کیوں نہیں کہا؟ گونگے ہو! احمق اور بے شعور بچے تو نے دوسروں کے سامنے پاؤں کیوں پھیلائے؟ کسی کے ہاں آکر شور کیوں مچا رہے ہو! حیوان کہیں کے اور دوسروں کی باتوں میں بولتے کیوں ہو۔

یہ نادان ماں باپ اپنے تئیں اس طرح سے اپنے بچوں کی تربیت کر رہے

ہوتے ہیں جب کہ بے ادبی سے ادب نہیں سکھایا جا سکتا۔ اگر بچے سے کوئی بے ادبی سرزد ہو جائے تو اسے نصیحت کرنی چاہیے۔ لیکن بے ادبی سے نہیں۔ نہ دوسروں کے سامنے بلکہ تنہائی میں اور بھلے انداز سے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بچوں کو سلام کرتے تھے اور فرماتے تھے:
"میں بچوں کو سلام کرتا ہوں تاکہ سلام کرنا ان کا معمول بن جائے"۔ ؎

؎

چوری چکاری

کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے بچہ دوسروں کے مال کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے کھانا، پھل یا کسی اور بچے کے کھلونے زبردستی لے لیتا ہے۔ باپ کی جیب سے یا ماں کے پرس سے چوری چھپے پیسے نکال لیتا ہے۔ ماں نے کھانے کے لیے چیزیں چھپا کے رکھی ہوتی ہیں اس میں ہاتھ مارتا ہے۔ دکان سے چپکے سے چیز اٹھا لیتا ہے۔ بہن یا بھائی یا ہم جماعت کی پنسل، پین، ربڑ یا کاپی اٹھا لیتا ہے۔ اکثر بچے بچپن میں اس طرح کے کم یا زیادہ کام کرتے ہیں۔ شاید ایسا شخص کوئی کم ہی ملے کہ جسے بچپن کے دنوں میں اس طرح کے واقعات ہرگز پیش نہ آئے ہوں۔ بعض ماں باپ اس طرح کے واقعات دیکھ کر بہت ناراحت ہوتے ہیں اور بچے کے تاریک مستقبل کے بارے میں اظہار افسوس کرتے ہیں۔ وہ پریشان ہو جاتے ہیں کہ ان کا بچہ آئندہ ایک قاتل یا چور بن جائے گا اس وجہ سے وہ اپنے آپ میں کڑھتے رہتے ہیں۔

سب سے پہلے ان ماں باپ کو اس امر کی طرف توجہ دلانا چاہیے کہ زیادہ ناراحت نہ ہوں اور اس پہ اظہار افسوس نہ کریں۔ کیونکہ یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں اٹھا لینا یا چرا لینا اس امر کی دلیل نہیں کہ آپ کا بچہ آئندہ شریر، غاصب اور چور ہوگا۔ کیونکہ بچہ ابھی رشد و تمیز کے اس مرحلہ پہ نہیں پہنچا کہ کسی کی ملکیت کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ سکے اور اپنی اور دوسرے کی ملکیت میں فرق کر سکے۔ بچے کے احساسات اس کی عقل سے زیادہ قوی ہوتے ہیں اس لیے جو چیز بھی اسے اچھی لگتی ہے انجام سوچے بغیر اس کی طرف لپکتا ہے۔ بچہ فطری طور پہ شریر نہیں ہوتا اور بچے کی یہ غلطیاں اس کے باطن سے پیدا نہیں ہوتی۔ یہ تو عارضی سی چیزیں ہیں۔ جب بڑا

ہوگا تو پھر ان کا مرتکب نہیں ہوگا۔ ایسے کتنے ہی پرہیزگار، امین اور راست باز انسان ہیں کہ جو بچپن میں اس طرح کی ننھی منی خطائیں کرتے رہے ہیں۔ البتہ میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں کہ آپ ایسی خطاؤں کو دیکھ کر کوئی ردعمل ظاہر نہ کریں اور اس سے بالکل لاتعلق رہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان کو دیکھ کر بچے کو شریر اور ناقابل اصلاح نہ سمجھ لیں۔ ایسے ہی داد و فریاد نہ کرنے لگیں بلکہ صبر اور بُردباری سے ان کا علاج کریں۔

خاص طور پر دو تین سالہ بچہ اپنے اور غیر کے مال میں فرق نہیں کر سکتا اور ملکیت کی حدود کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔ جس چیز تک اس کا ہاتھ پہنچ جائے اسے اپنا بنا لینا چاہتا ہے۔ جو چیز بھی اُسے اچھی لگے اٹھا لینا چاہتا ہے اس مرحلے پر ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس مرحلہ پر ماں باپ جو بہترین روش اپنا سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ بچے کو عملاً اس کام سے روک دیں۔ اگر وہ زبردستی کوئی چیز دوسرے بچے سے لینا چاہے تو اُسے اجازت نہ دیں اور اگر وہ لے لے تو اس سے لے کر واپس کر دیں۔ جو چیز وہ چاہتے ہیں کہ بچہ نہ اٹھائے اسے اس کی دسترس سے دور رکھیں۔ زیادہ تر بچے جب رشد و تمیز کی حد تک پہنچ جاتے ہیں اور ملکیت کی حدود کو اچھی طرح جان لیتے ہیں تو پھر دوسروں کے مال کی طرف وہ ہاتھ نہیں بڑھاتے اور چوری نہیں کرتے البتہ بعض بچے اس عمر میں بھی اس غلط کام کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ اس موقع پر ماں باپ کو خاموش اور لاتعلق نہیں رہنا چاہیے یہ درست نہیں ہے کہ ماں باپ اپنے بچے کی چوری چکاری کو دیکھیں اور اس کی اصلاح نہ کریں اور یہ کہتے رہیں کہ ابھی بچہ ہے۔ اس کی عقل ہی اتنی ہے جب بڑا ہوگا تو پھر چوری چکاری نہیں کرے گا۔ البتہ یہ احتمال ہے کہ جب وہ بڑا ہو تو چوری نہ کرے لیکن یہ احتمال بھی بہت ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی چوریوں سے اُسے چوری کی مستقل عادت پڑ جائے اور وہ ایک چور اور غاصب بن کر اُبھرے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی درست نہیں ہے کہ بچہ کسی کا یا ماں باپ کا مال اٹھا لے اور کوئی اس سے کچھ نہ کہے۔ اور اس سے بھی بدتر یہ ہے کہ ماں باپ اپنے بچے کے غلط کام پر اُسے منع کرنے کی بجائے اس کا دفاع اور اس کی حمایت کرنے لگیں۔ اگر کوئی ان سے شکایت کرے کہ ان کے بچے نے اس کا مال چرایا ہے تو یہ شور و غل کرنے لگیں کہ ہمارے

نیچے پر یہ الزام لگایا کیوں گیا؟

اس طرح کے نادان ماں باپ اپنے طرز عمل سے اپنی اولاد کو چوری چکاری کی تشویق کرتے ہیں اور عملاً انھیں سبق دیتے ہیں کہ وہ چوری کریں اور مکر جائیں اور اپنے آپ کو درست ثابت کرنے کے لیے شور مچائیں۔

اس بنا پر ماں باپ کو نہیں چاہیے کہ وہ اپنی اولاد کے غلط کاموں سے لاتعلق رہیں بلکہ انہیں کوشش کرنا چاہیے کہ وہ انہیں ایسے کام سے روکیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ برائی ان کے اندر جڑ پکڑے اور عادت بن جائے اور عادت کو ترک کرنا بہت مشکل ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"عادت کو ترک کرنا انتہائی کٹھن کام ہے"[1]

ماں باپ کو پہلے مرحلے پر کوشش کرنا چاہیے کہ ان عوامل کو دور کریں کہ جو بچے کی چوری کا سبب بنتے ہیں تاکہ یہ عمل اصلاً پیش ہی نہ آسکے۔ اگر بچے کو پنسل، ربڑ، کاپی یا قلم کی ضرورت ہے تو ماں باپ کو چاہیے کہ اس کی ضرورت کو پورا کریں۔ کیونکہ اگر انہوں نے اس کی ضروریات کو پورا نہ کیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ہم درس کی چیز اٹھا لے یا ماں باپ کی جیب سے پیسے چوری کرے۔ اگر اسے کھیل کے لیے گیند کی ضرورت ہے اور ماں باپ نہ لے کر دیں تو ممکن ہے کہ وہ کسی دوسرے بچے کا گیند زبردستی لے لے۔ یا محلے کی دوکان سے چوری کرے۔ ماں باپ کو چاہیے کہ حتی المقدور بچے کی حقیقی ضروریات کو پورا کریں۔ اور اگر ممکن نہ ہو تو بچے کو پیار سے سمجھائیں اور اس کا حل خود اس پر چھوڑ دیں۔ مثلاً اسے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں کہ تمہارے لیے رنگوں والی پینسلیں خرید سکیں۔ تم فلاں دوکان سے اُدھار لے لو۔ بعد میں اُسے پیسے دے دیں گے۔ یا آج اپنے دوست سے عاریتاً لے لو بچے پر زیادہ سختیاں اور کنٹرول اور سخت پابندیاں اس کے ذہن میں چوری کا راستہ پیدا کر سکتی ہیں۔ اگر ماں باپ کھانے پینے کی چیزیں کسی الماری میں یا کسی اور ڈبے میں رکھ

---

[1] غررالحکم، ص ۱۸۱

کہ اس کو تالا لگا دیں اور اس کی چابی چھپالیں تو بچہ اس سوچ میں پڑ جائے گا کہ کسی طرح سے چابی ڈھونڈ لے اور مناسب موقع پا کر اس چیز کو نکالے۔ یہ بات خاص طور پر اس وقت ہوتی ہے جب ماں باپ خود کھائیں اور بچے کو نہ دیں۔

جب ماں باپ اپنے پیسے سات تہوں میں کسی جگہ چھپا دیں تو ممکن ہے بچے میں تحریک پیدا ہو اور وہ اتنا انہیں تلاش کرے کہ آخر پا لے۔ ممکن ہو تو ماں باپ کو پیسے زیادہ بھی باندھ باندھ کر نہیں رکھنے چاہئیں۔ انہیں بچوں سے مل جل کر اور ہم رنگ ہو کر رہنا چاہیے اور ان کے ساتھ افہام و تفہیم پیدا کرنا چاہیے۔ انہیں سمجھائیں کہ زندگی کسی حساب کے تحت ہی بسر ہو سکتی ہے کھانے پینے کی چیزوں کو معین وقت پر ہی استعمال کرنا چاہیے اور پیسے ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے ہیں انہیں کسی حساب کے مطابق ہی خرچ کرنا چاہیے۔

بچوں کو چوری، ڈاکے اور قتل کی فلمیں نہیں دکھانا چاہئیں۔ ریڈیو اور کتابوں کی ایسی کہانیوں سے بھی بچوں کو دُور رکھنا چاہیے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ چوری کرنے کے جرم میں عدالت میں پیش ہونے والے بچوں نے یہ بیان دیا ہے کہ یہ کام انہوں نے سینما یا ٹیلی ویژن میں ہوتے دیکھا ہے۔

سب سے اہم یہ ہے کہ ماں باپ اور گھر کے سارے افراد کوشش کریں کہ ان کے گھر کا ماحول امانت داری اور سچائی پر مبنی ہو۔ دوسروں کی ملکیت کا احترام کیا جائے اور اس پہ تجاوز نہ کیا جائے۔ ماں باپ کی اجازت کے بغیر ان کی جیب سے پیسے نہ نکالے اور اسے بتائے بغیر اس کے اموال میں بے جا تصرف نہ کرے۔ شوہر بھی بتائے بغیر زوجہ کی الماری اور سوٹ کیس کو نہ چھیڑے اور اس کے لیے مخصوص چیزوں میں تصرف نہ کرے۔ ماں باپ کو بھی بچوں کی ملکیت کا احترام کرنا چاہیے اور بچوں کی اجازت کے بغیر ان سے مخصوص الماری اور اٹیچی کیس کو ہاتھ نہ لگائیں اور ان کے کھیلوں کے سامان میں تصرف نہ کریں۔

بچے کے چھوٹے سے تجاوز پر اس کی عزت و آبرو کو نابود کر کے اسے ذلیل و خوار نہ کریں اسے یہ نہ کہیں اے چور! اے خیانت کار! تم چور بن جاؤ گے اور جیل خانے میں جاؤ گے ان توہین آمیز خطابات کے ساتھ آپ بچے کو چوری سے نہیں روک سکتے بلکہ

اس سے وہ ڈھیٹ بن جائے گا اور ممکن ہے کہ ان سب باتوں کا انتقام لینے کے لیے وہ بڑی بڑی چوریاں شروع کر دے۔

وہ بہترین طریقہ کہ ماں باپ کو جس کا انتخاب کرنا چاہیے یہ ہے کہ محبت اور نرمی کے ساتھ بچے کو سمجھائیں چوری کی بُرائی کو بیان کریں اور ملکیت کی وضاحت کریں۔ مثلاً اسے کہیں تم نے جو فلاں چیز اٹھائی ہے وہ کسی اور شخص کی ہے اسے فوراً واپس لوٹا دیں۔ اور آئندہ ایسا عمل نہ دہرائیں۔

لیکن اگر اس طرز عمل سے بھی کوئی مثبت نتیجہ حاصل نہ کیا جا سکے تو مجبوراً بچے کو سختی اور ڈانٹ ڈپٹ سے روکا جائے اور اگر ناگزیر ہو تو بعض مواقع پر مار پیٹ سے بھی بچے کو چوری سے روکا جا سکتا ہے۔

حسد

حسد ایک بُری صفت ہے حاسد شخص ہمیشہ دوسروں کی خوشی اور آرام وسکون کو دیکھ کر رنج اور دکھ میں مبتلا رہتا ہے کسی اور شخص کے پاس کوئی نعمت دیکھنے کے بعد غمگین ہو جاتا ہے اور اس سے نعمت کے چھن جانے کی آرزو کرتا ہے۔ چونکہ عموماً یہ کسی کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتا اور اس سے وہ نعمت بھی نہیں چھین سکتا لہذا غمگین رہتا ہے اور حسد کی آگ میں دن رات جلتا رہتا ہے۔ حاسد شخص دنیا کی لذت اور آسائش سے محروم رہتا ہے حسد اور کینہ پروری انسان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتے ہیں۔ اور انسان سے راحت وآرام چھین لیتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"حاسد انسان کو سب لوگوں سے کم لذت اور خوشی محسوس ہوتی ہے"[1]

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"حسد حاسد کی زندگی کو تاریک کر دیتا ہے"[2]

امیرالمومنین علی علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:

"حاسد شخص کو ہرگز راحت اور مسرت نصیب نہیں ہوتی"[3]

---

[1] مستدرک، ج ۲، ص ۳۲۷

[2] مستدرک، ج ۲، ص ۳۲۸

[3] مستدرک، ج ۲، ص ۳۲۷

حسد انسان کے دل اور اعصاب پر بُرے اثر مرتب کرتا ہے اور انسان کو بیمار اور علیل کر دیتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"حاسد شخص ہمیشہ بیمار اور علیل رہتا ہے" [۱]

حسد ایمان کی بنیادوں کو تباہ کر دیتا ہے اور انسان کو گناہ اور نافرمانی پر اُبھارتا ہے بہت سے قتل، جُرم، جھگڑے، لڑائیاں اور حق تلفیاں حسد ہی کی بنیاد پر ہوتی ہیں۔ حاسد کبھی محسود کی غیبت اور بدگوئی کرتا ہے اور اُس پر تہمت بھی لگاتا ہے اس کے خلاف باتیں بناتا ہے۔ اس کا مال ضائع کرتا ہے۔

امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

"حسد ایمان کو یُوں تباہ کر دیتا ہے جیسے آگ ایندھن کو جلا دیتی ہے" [۲]

حسد انسان کی طبیعت کا حصہ ہے۔ ایسا شخص کوئی کم ہی ہو گا کہ جو اس سے خالی ہو۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"تین چیزیں ایسی ہیں کہ جن سے کوئی شخص خالی نہ ہو گا۔

* گمان بد،
* فال بد،
* اور حسد [۳]

لہٰذا اس بُری صفت کا پوری قوت سے مقابلہ کیا جانا چاہیے اور اسے بڑھنے اور پھلنے پھولنے سے روکنا چاہیے۔ اگر اس بُری عادت کو نظرانداز کر دیا جائے تو چوں کہ اس کا ریشہ انسان کی طبیعت کے اندر ہوتا ہے لہٰذا یہ پھلنے پھولنے لگتی ہے اور اس حد تک

---

[۱] مستدرک، ج ۲، ص ۳۲۸

[۲] شافی، ج ۱، ص ۱۷۳

[۳] محجۃ البیضاء، ج ۲، ص ۱۸۹

جا پہنچتی ہے کہ اس کا مقابلہ کرنا اور اس کا قلع قمع کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ بہترین موقع کہ جب اچھے اخلاق کی پرورش کی جا سکتی ہے اور بُرے اخلاق کو پھیلنے پھولنے سے روکا جا سکتا ہے بچپن کا زمانہ ہے۔ اگرچہ یہ چھوٹی عمر میں ہی بچوں کی طبیعت میں موجود ہوتا ہے لیکن ماں باپ اپنے اعمال اور طرز عمل سے اس بُری عادت کو تحریک بھی کر سکتے ہیں اور اس کا قلع قمع بھی۔ اگر ماں باپ اپنی ساری اولاد سے عادلانہ سلوک کریں اور کسی کو دوسرے پر ترجیح نہ دیں۔ لباس، خوراک کے معاملے میں، گھر کے کاموں کے معاملے میں۔ جیب خرچ اور اظہار محبت کے معاملے میں میل جول کے معاملے میں عدالت و مساوات کو ملحوظ نظر رکھیں۔ چھوٹے بڑے میں۔ خوبصورت اور بدصورت میں۔ بیٹے بیٹی میں۔ باصلاحیت اور بے صلاحیت میں کوئی فرق نہ کریں تو بچوں میں حسد پروان نہیں چڑھے گا اور ممکن ہے تدریجاً ختم ہی ہو جائے۔ بچوں کی موجودگی میں کبھی کسی ایک کی تعریف و ستائش نہ کریں ان کا آپس میں موازنہ نہ کریں۔ بعض ماں باپ تعلیم و تربیت کے لیے اور بچوں کی تشویق کے لیے ان کا آپس میں موازنہ کرتے ہیں مثلاً کہتے ہیں! احمد بیٹا دیکھ تمہاری بہن نے کتنا اچھا سبق پڑھا ہے کتنے اچھے نمبر لاتی ہے۔ گھر کے کاموں میں ماں کی مدد کرتی ہے کتنی با ادب اور ہوش مند ہے تم بھی بہن کی طرح ہو جاؤ تاکہ امی ابو تم سے بھی پیار کریں - یہ نادان ماں باپ اس طرح چاہتے ہیں کہ اپنے بچے کی تربیت کریں جب کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ اس طریقے سے مقصد حاصل ہو۔ جب کہ اس کے برعکس معصوم بچے کے دل میں حسد اور کینہ پیدا ہو جاتا ہے اور اسے حسد اور دشمنی پر آمادہ کر دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس طرح سے بچہ کے دل میں اپنی بہن یا بھائی کے لیے کینہ پیدا ہو جائے اور وہ اُسے نقصان پہنچانے پر تُل جائے اور ساری عمر ان کے دل میں حسد اور دشمنی باقی رہے۔

کبھی اپنے بچوں کا دوسرے بچوں سے موازنہ نہ کریں اور اپنی اولاد کے سامنے دوسروں کی تعریف نہ کریں۔ یہ درست نہیں ہے کہ ماں باپ اپنی اولاد سے کہیں! فلاں کے بیٹے کو دیکھو کتنا اچھا ہے! کتنا باادب ہے۔ کتنا اچھا سبق پڑھتا ہے۔ کتنا فرمانبردار ہے گھر کے کاموں میں امی ابو کا کتنا ہاتھ بٹاتا ہے - اس کے ماں باپ کس قدر خوش قسمت ہیں۔ ان کے حال پہ رشک آتا ہے۔ ایسے ماں باپ کو سمجھنا چاہیے کہ اس طرح کا موازنہ اور

اس طرح کی سرزنش کا نتیجہ حسد کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ زیادہ تر ان کا نتیجہ اُلٹ ہی نکلتا ہے اور انہیں ڈھٹائی اور انتقام پر اُبھارتا ہے۔

ماں باپ کو ایسے طرزِ عمل سے سختی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ البتہ سارے بچے ایک سے نہیں ہوتے کوئی بیٹا ہے کوئی بیٹی ہے۔ کوئی باصلاحیت ہے کوئی نہیں ہے کوئی خوش اخلاق ہے کوئی بداخلاق ہے کوئی خوبصورت ہے کوئی نہیں ہے۔ کوئی فرمانبردار ہے کوئی نہیں ہے۔ کوئی تیز کوئی سست ہے۔ ہوسکتا ہے ماں باپ ان میں سے کسی ایک سے دوسروں کی نسبت زیادہ محبت کرتے ہوں اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ دل کی محبت اور پسند انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ اور جب تک اس فرق کا عملاً اظہار نہ ہو تو یہ نقصان دہ نہیں ہے۔ لیکن ماں باپ کو عمل اور زبان سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے سے سختی سے بچنا چاہیے۔ عمل، گفتار اور اظہارِ محبت کرتے ہوئے مساوات اور برابری کو پوری طرح سے ملحوظ رکھنا چاہیے اس طرح سے کہ بچہ محسوس نہ کرے کہ دوسرے کو مجھ پہ ترجیح دی جا رہی ہے۔ اگر آپ کسی بچے کو اس کے کام پر تشویق کرنا چاہتے ہیں تو مخفی طور پر کریں۔ دوسرے بہن بھائیوں کی موجودگی میں نہ کریں۔ البتہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ ماں باپ عادلانہ طرزِ عمل اور مساوات سے بہن بھائیوں کے درمیان محبت سے حسد بالکل ختم کردیں۔ کیونکہ حسد انسان کے باطنی مزاج میں موجود ہوتا ہے۔ ہر بچے کی خواہش ہوتی ہے کہ وہی ماں باپ کو زیادہ لاڈلا ہو اور اس کے علاوہ دوسرا ان کے دل میں نہ سمائے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ ماں باپ دوسرے سے اظہارِ محبت کررہے ہیں تو اُسے اچھا نہیں لگتا اور اس کے دل میں حسد پیدا ہوتا ہے لیکن اس کا کوئی چارہ نہیں۔ بچے کو آہستہ آہستہ یہ بات سمجھنی چاہیے کہ وہ تنہا ماں باپ کا محبوب نہیں بن سکتا۔ دوسروں کا بھی اس میں حق ہے۔ ماں باپ اپنے عاقلانہ اور عادلانہ طرزِ عمل سے بچے کو دوسرے بہن بھائیوں کو قبول کرنے کے لیے آمادہ کرسکتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہوسکے اس کو حسد سے بچاسکتے ہیں۔

اگر آپ دیکھیں کہ آپ کا بیٹا دوسرے بھائی یا بہن سے حسد کرتا ہے۔ اُسے اذیت کرتا ہے۔ مارتا ہے، چٹکیاں لیتا ہے۔ گالی دیتا ہے اس کے کھلونے توڑتا ہے، ان

کے حصے کے پھل اور کھانا چھین لیتا ہے۔ اس صورت میں ماں باپ خاموش نہیں رہ سکتے۔ کیوں کہ ہو سکتا ہے ان کی خاموشی کے اچھے نتائج نہ نکلیں۔ ناچار زیادتی کرنے والے بچے کو انہیں روکنا چاہیے لیکن مار پیٹ سے اصلاح نہیں ہوگی۔ کیونکہ اس طریقے سے ممکن ہے صورت حال اور بھی بگڑ جائے اور اس کے حسد میں اضافہ ہو جائے۔ بہتر ہے کہ اسے سختی سے روکیں اور کہیں میں اجازت نہیں دے سکتا کہ اپنی بہن یا بھائی کو تنگ کرو۔ آخر یہ تمہاری بہن ہے اگر تم اسے پیار نہ کرو گے تو کون کرے گا اور یہ تمہارا بھائی ہے تمہیں تو چاہیے کہ دوسرے ان پر زیادتی کریں تو تم ان کی حفاظت کرو۔ یہ تم سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ اللہ نے تمہیں کتنے پیارے بہن بھائی دیے ہیں اور ہمیں تم سب سے پیار ہے۔ نہیں نہیں چاہیے کہ ایک دوسرے کو ستاؤ اور تنگ کرو۔

آخر میں ضروری ہے کہ اس بات کا ذکر کیا جائے کہ بچوں کے درمیان کامل مساوات کو ملحوظ رکھنا شاید ممکن نہ ہو۔ ماں باپ چھوٹے بڑے، بیٹی اور بیٹے کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیسے کر سکتے ہیں۔ بڑے بچوں کو نسبتاً زیادہ آزادی دی جا سکتی ہے۔ لیکن چھوٹوں کو آزادی نہیں دی جا سکتی۔ بڑے بچوں کو زیادہ جیب خرچ کی ضرورت ہوتی ہے اور چھوٹوں کو نہیں۔ چھوٹے بچوں کو زیادہ ضرورت ہوتی ہے کہ ان کی رکھوالی کی جائے اور ماں باپ ان کی طرف زیادہ توجہ دیں۔ کہیں آتے جاتے ہوئے بیٹیوں کی نسبت بیٹوں کو زیادہ آزادی دی جا سکتی ہے اور مناسب بھی نہیں کہ بیٹیوں کو زیادہ آزادی دی جائے۔ لہٰذا مساوات اور عدالت کو ملحوظ رکھنے کے ساتھ ساتھ عمر اور جنس کے اختلاف کے تقاضوں کو بھی ماں باپ کو ملحوظ رکھنا ہوتا ہے اور ان کی ضروریات کے فرق کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے خواہ مخواہ فرق پیدا ہوتا ہے لیکن سمجھدار ماں باپ اس طرح کے فرق کو اپنی اولاد کے سامنے بیان کر سکتے ہیں اور انہیں سمجھا سکتے ہیں کہ یہ اس لیے نہیں ہے کہ ہم ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتے ہیں بلکہ عمر اور جنس کے فرق کی وجہ سے ایسا ہے مثلاً بڑے بیٹوں سے کہا جا سکتا ہے۔ تمہارا یہ بھائی چھوٹا اور کمزور ہے۔ خود سے کام نہیں

کر سکتا۔ اپنے آپ کو گندا کر لیتا ہے۔ خود سے کھانا نہیں کھا سکتا۔ اسے امی اور ابو کی زیادہ ضرورت ہے لیکن تم ماشاءاللہ بڑے ہو گئے ہو۔ تم میں توانائی زیادہ ہے اور ننھے کی طرح سے تمہاری دیکھ بھال کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم اس پر زیادہ وقت لگاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمیں اس سے زیادہ محبت ہے۔ بلکہ چارہ ہی نہیں ہے۔ مطمئن رہو کہ ہماری تم سے محبت کم نہیں ہو گی۔ جب تم چھوٹے سے تھے تو اسی طرح سے تمہارا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا۔

آخر میں اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اسلام کی نظر میں حسد اگرچہ قبیح اور برا ہے اور اسے گناہوں میں سے شمار کیا گیا ہے لیکن رشک نہ صرف یہ کہ برا نہیں ہے بلکہ جدوجہد، کوشش اور انسانی ترقی کے عوامل میں سے ہے۔ رشک اور حسد میں فرق یہ ہے کہ دوسروں کے پاس کسی نعمت کو دیکھ کر اگر انسان ناراحت ہو جائے اور یہ آرزو کرے کہ یہ ان کے پاس نہ رہے تو یہ حسد ہے۔ جب کہ رشک یہ ہے کہ انسان دوسروں سے اس نعمت کے چھن جانے کی آرزو نہ کرے۔ بلکہ یہ آرزو کرے کہ یہ نعمت اس کو بھی میسر آئے۔ اور یہ آرزو بری نہیں ہے۔

ایک صاحب لکھتے ہیں :

میری ایک بہن تھی مجھ سے دو سال بڑی تھی امی ابو بہن کی نسبت مجھ سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ جو بھی میں آرزو کرتا فوراً اسے پورا کر دیتے۔ ہر جگہ میری تعریف کرتے لیکن میری بہن کی طرف کوئی توجہ نہ دیتے۔ جب کہ بہن مجھے بہت تنگ کرتی ادھر اُدھر جب بھی اسے موقع ملتا مجھے مارتی ہمیشہ مجھے تنگ کرتی رہتی۔ برا بھلا کہتی۔ مذاق اڑاتی۔ میرے کھلونے خراب کر دیتی۔ اسے اچھا نہ لگتا کہ میں ایک منٹ بھی خوش رہوں! میں ہمیشہ سوچتا رہتا کہ بہن مجھے آخر تنگ کیوں کرتی ہے آخر میں نے کیا کیا ہے! وہ مجھ سے بہت

حسد کرتی تھی اور شاید اس کی وجہ دہی ماں باپ کا مجھ سے ترجیحی سلوک تھا۔ وہ اپنے تئیں مجھ سے بھلائی کرنا چاہتے تھے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ بہن مجھ سے انتقام لے گی اور صبح و شام مجھے ستائے گی۔ اب جب کہ میرے والدین دنیا سے جا چکے ہیں میری بہن مجھ پر انتہائی مہربان ہے۔ وہ تیار نہیں ہے کہ مجھے ذرہ بھر بھی تکلیف پہنچے۔

غصّہ

غصہ انسانی طبیعت کا حصہ ہے اس کی بنیاد انسانی جبلت میں موجود ہے اس غیر معمولی نفسیاتی کیفیت کا آغاز انسان کے دل و دماغ سے ہوتا ہے۔ پھر یہ کیفیت شعلۂ آگ کے مانند پورے جسم پر چھا جاتی ہے۔ آنکھیں اور چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے ہیں، منہ سے جھاگ نکلنے لگتی ہے۔ انسان کے اعصاب اس کے کنٹرول سے نکل جاتے ہیں۔ غصیلے شخص کی عقل کام نہیں کرتی اور اس حالت میں اس میں اور کسی پاگل میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ایسے عالم میں ممکن ہے اس سے ایسی غلطیاں سرزد ہوں جن کی سزا اسے پوری عمر بھگتنا پڑے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:
غصے سے بچو کیونکہ اس کی ابتدا جنون سے ہوتی ہے اور انتہا پشیمانی پہ[1]

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:
غصہ تمام برائیوں اور جرائم کی کنجی ہے[2]

غصہ انسان کے دین اور ایمان کو بھی نقصان پہنچاتا ہے اور اس کے نیک اعمال کو بھی غارت کر دیتا ہے۔

---

[1] مستدرک، ج ۲، ص ۳۲۶
[2] اصول کافی، ج ۲، ص ۳۰۳

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

غصہ ایمان کو یوں ختم کر دیتا ہے جیسے سرکہ شہد کو تباہ کر دیتا ہے۔[۱]

غصے کے عالم میں انسان احمقانہ باتیں کرتا ہے اور اس سے ایسے غلط کام صادر ہوتے ہیں جو اُس کے باطن کو آشکار کر دیتے ہیں اور اُسے دوسروں کی نظر میں رُسوا کر دیتے ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

غصہ ایک بُرا ساتھی ہے کہ جو انسان کی خامیوں کو آشکار کر دیتا ہے۔ انسان کو بُرائی سے قریب اور نیکی سے دور کر دیتا ہے۔[۲]

دائمی غصہ انسان کے دل اور اعصاب پر بُرے اثرات مرتب کرتا ہے اور انہیں کمزور و مضمحل کر دیتا ہے۔ لہٰذا جو شخص اپنی حیثیت، صحت اور دین کا خیر خواہ ہے اسے چاہیے کہ اس بُری صفت کا سختی سے مقابلہ کرے اور اس امر کے لیے خبردار رہے کہ کہیں غصہ اس کے اعصابی کنٹرول کو چھین لے اور اس کا دین و دنیا اور عزت و آبرو برباد کر دے۔

اس نکتے کی یاددہانی بھی ضروری ہے کہ غصہ ہر جگہ اور ہر حال میں بُرا، ناپسندیدہ اور نقصان دہ نہیں ہے بلکہ اگر اس سے صحیح موقع پر صحیح طریقے سے استفادہ کیا جائے تو یہ انسانی زندگی کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔ اسی جبلت سے انسان اپنی جان، مال، اولاد، دین، وطن اور دیگر انسانوں کا دفاع کرتا ہے۔ اس جبلت کی موجودگی کے بغیر انسان آبرومندانہ زندگی نہیں گزار سکتا۔ یہ جبلت اگر عقل کے اختیار میں رہے تو نہ فقط نقصان دہ نہیں ہے بلکہ بہت مفید ہے۔

راہِ خدا میں جہاد، دین و وطن کا دفاع، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، عزت و ناموس کی حفاظت، ظلم کے خلاف قیام، مظلوموں کی حمایت، کفر اور بے دینی سے مقابلہ اور ستم رسیدہ انسانوں کی حمایت ــــــ یہ سب کام اسی قوت کی برکت سے انجام پاتے ہیں۔

---

[۱] اصول کافی، ج ۲، ص ۳۰۲

[۲] مستدرک، ج ۲، ص ۳۲۶

ایک متدین اور ذمہ دار مسلمان زندگی کے تلخ و ناگوار حوادث کے سامنے، ظلم اور حق کشی کے سامنے، استبداد اور آمریت کے سامنے، برائی اور گناہ کے سامنے، لوگوں کے اموال پہ تجاوز کے مقابلے میں، سامراج اور استعمار کے مقابلے میں، ملتوں کو غلامی کے طوق پہنانے کے مقابلے میں، بے دینی اور مادہ پرستی کے مقابلے میں خاموش اور لاتعلق رہے، اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن اس کے غصے کو اس کی عقل پہ بالادستی حاصل نہیں ہونا چاہئے کیونکہ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اگر تو نے غصے کی پیروی کی تو یہ تجھے ہلاکت تک جا پہنچائے گا۔[1]

یہ درست نہیں ہے کہ اس قوت کو بالکل ختم کر دیا جائے اور انسان لاتعلق، بے حس اور بے غیرت ہو جائے۔ بلکہ افراط و تفریط سے اجتناب کرنا چاہیے اور اس قوت کو صحیح طریقے سے پروان چڑھانا چاہیے تاکہ ضروری مواقع پر اس سے استفادہ کیا جا سکے۔ غصہ دیگر صفات کی طرح بچپن ہی سے انسان میں نشو و نما حاصل کرتا ہے۔ یہ تمام انسانوں کی سرشت کا حصہ ہے لیکن اس کی کمی یا زیادتی کا تعلق تربیت، ماحول اور ماں باپ سے ہے ماں باپ اپنے طرز عمل سے اس قوت کو حالتِ اعتدال میں بھی رکھ سکتے ہیں اور افراط یا تفریط کی طرف بھی لے جا سکتے ہیں۔ اس امر کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ سب انسانوں کا مزاج ایک سا نہیں ہوتا کسی میں غصہ زیادہ ہوتا ہے اور کسی میں پیدائشی طور پر کم۔ عقلمند اور باتدبیر ماں باپ بچے کے خاص مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی تربیت کرتے ہیں اور اس کی جبلی قوتوں کو اعتدال پر لاتے ہیں اور اسے افراط و تفریط کے عوامل سے بچاتے ہیں۔

بچہ غصے میں چیختا چلاتا ہے اس کا بدن کانپتا ہے، چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے زمین پر پاؤں مارتا ہے اور لوٹتا ہے ایسے عالم میں وہ سخت سست جملے بولتا ہے کرنے میں جا لگتا ہے لیکن اس کا مقصد شرارت نہیں ہوتا۔ ضروری ہے کہ بچے کے غصے کی وجہ دریافت کی جائے اور اسے دور کیا جائے۔

---

[1] مستدرک، ج ۲، ص ۳۲۶

غصہ کلی طور پر کسی پریشانی اور ناراحتی سے پیدا ہوتا ہے۔ شدید درد تھکاوٹ، زیادہ بے خوابی، بھوک، شدید پیاس اور گرمی اور سردی کا غیر معمولی احساس نومولود اور چھوٹی عمر کے بچوں کو بے آرام کر دیتا ہے اور اس کے غصے کو بڑھاتا ہے۔ بچے کی توہین کرنا اور اسے اذیت دینا۔ اس کی خواہشوں کے خلاف قیام کرنا، اس کی آزادی کو سلب کرنا، خواہ مخواہ اس پہ پابندیاں عائد کرنا، دوسرے کو ترجیح دیے جانے کا احساس اور ناانصافیاں، اس امر کا احساس کہ مجھ سے پیار نہیں کیا جاتا، اس پہ زبردستی بات ٹھونسنا، بچے کی خوداعتمادی کو نقصان پہنچانا، ناتوانی کا احساس اور کامیاب نہ ہونے کا احساس، مشکل اور طاقت فرسا احکامات، سخت ڈانٹ ڈپٹ ان میں سے ہر امر بچے کا چین چھین لیتا ہے اور اس کے غصے کو بڑھاتا ہے اور اگر ایسی چیزوں کا تکرار ہوتا رہے تو بچے کے اندر غصے کی سرشت کو تقویت ملتی ہے اور وہ ایک غصیلا اور چڑچڑا شخص بن جاتا ہے۔ بعض ماں باپ عملاً بچوں کو غصے کا سبق دیتے ہیں۔ ان پر چیختے ہیں اور سختی کرتے ہیں۔ ان کے غصے کے مقابلے میں غصے ہو جاتے ہیں۔ اس طرح سے انہیں زیادہ غصیلا بناتے ہیں۔

اگر آپ کا بچہ غصے میں آیا ہو تو آپ اس کے مقابلے میں غصہ نہ کریں۔ اس بات کا اطمینان رکھیں وہ کسی برائی کا ارادہ نہیں کرتا۔ آپ اس امر کی کوشش کریں کہ اس کی ناراضگی کی وجہ معلوم کریں۔ اگر اُسے درد ہے تو اس کا علاج کریں۔

اگر بھوکا اور پیاسا ہے تو اسے کوئی چیز کھانے پینے کے لیے دیں۔ اگر تھکا ہوا ہے تو اسے سلا دیں۔ اگر آپ کے کاموں یا طرزِ عمل کی وجہ سے وہ غصے میں ہے تو آپ تلافی اور اصلاح کریں۔ اگر اُس کا غصہ خیال اِدھر اُدھر بھٹکنے کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے تو اُس کے اشتباہ کو دور کریں۔ اگر اسے روحانی طور پر تقویت کی ضرورت ہے تو آپ وہ مہیا کریں۔ اگر اس کی کوئی جائز خواہش ہے اور آپ اسے پورا کر سکتے ہیں تو پورا کریں لیکن جب وہ معمول کی حالت پہ آجائے تو کہیں کہ انسان کو جو چیز چاہیے ہو اُسے زبان سے مانگنا چاہیے نہ کہ غصے اور زور سے اس دفعہ تو میں نے تمہاری خواہش پوری کر دی ہے لیکن آئندہ اگر تم نے غصے اور زور سے کوئی بات منوانے کی کوشش کی تو پوری نہیں کی جائے گی۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

" غصّے سے بچو کہیں یہ تم پر مسلط ہی نہ ہو جائے اور ایک عادت ہی نہ بن جائے" [۱]

چڑچڑے بچے زود رنج ہوتے ہیں اور چھوٹی سی بات پر غصّے میں آجاتے ہیں۔ کیونکہ ان کی روح قوی نہیں ہوتی۔ لہٰذا وہ کوئی بھی ناپسندیدہ بات برداشت نہیں کر سکتے اور معمولی سی چیز پر بھی متأثر ہو جاتے ہیں اور غصّے میں آجاتے ہیں۔

۱۔ غرر الحکم ص ۸۰۹

بدزبانی

بدگوئی ایک بری عادت ہے بدزبان اپنی بات کا پابند نہیں ہوتا۔ جو کچھ اس کے منہ میں آتا ہے کہے جاتا ہے، گالی بکتا ہے، نا سزا کہتا رہتا ہے، شور مچاتا ہے، برا بھلا کہتا رہتا ہے، طعن زنی کرتا ہے، زبان کے چرکے لگاتا ہے۔

بدزبانی حرام ہے اور گناہانِ کبیرہ میں سے ہے۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

بدزبانی کرنے والے پر اللہ نے بہشت کو حرام قرار دیا ہے اور گالی دینے والے، بے حیا اور بدتمیز پر بھی جنت حرام ہے۔ بدگو شخص جو کچھ دوسروں کے بارے میں کہتا ہے نہ اس کا خیال رکھتا ہے اور جو کچھ دوسرے اس کے بارے میں کہتے ہیں نہ اس پر دھیان دیتا ہے[1]

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

دشنام طرازی، بدگوئی اور زبان درازی نفاق اور بے ایمانی کی نشانیوں میں سے ہے[2]

اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے:

---

[1] اصول کافی، ج ۲، ص ۳۲۳

[2] اصول کافی، ج ۲، ص ۳۲۵

وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃٍ ○

افسوس ہے ایسے سب افراد پر کہ جو لوگوں کی عیب جوئی اور طعن و تمسخر کرتے ہیں۔ (ہمزۃ - ۱)

بد زبان افراد گھٹیا اور کم ظرف ہوتے ہیں۔ اس بُری عادت کی وجہ سے لوگوں کو اپنا دشمن بنا لیتے ہیں۔ لوگ ان سے نفرت کرتے ہیں۔ لوگ ان کی زبان سے ڈرتے ہیں اور ان سے میل ملاقات سے دُور بھاگتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لوگوں میں سے بدترین وہ ہے کہ لوگ جس کی زبان سے ڈریں اور اس کے ساتھ ہم نشینی کو پسند نہ کریں۔[۱]

حضرت صادق علیہ السلام نے فرمایا:

لوگ جس کی زبان سے بھی ڈریں وہ جہنم میں جائے گا۔[۲]

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مومن طعن زنی نہیں کرتا، بُرا بھلا نہیں کہتا رہتا، دشنام طرازی نہیں کرتا اور بدزبانی نہیں کرتا۔[۳]

بچہ فطری طور پر بدزبان نہیں ہوتا۔ یہ بری صفت وہ اپنے ماں باپ، بہن بھائی یا، دوستوں، ہم جولیوں اور ہم جماعت بچوں سے سیکھتا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ماں باپ کا اثر سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ ماں باپ اپنے بچے کے لیے مؤثر ترین نمونہ عمل ہوتے ہیں۔ لہٰذا ماں باپ نہ فقط اپنے قول و عمل کے ذمہ دار ہیں بلکہ بچوں کی تربیت کے بھی ذمہ دار ہیں۔ یہ ماں باپ ہی ہیں جو بچے کو خوش کلام یا بدزبان بنا دیتے ہیں۔ بعض ماں باپ مذاق

---

[۱] اصول کافی، ج ۲، ص ۳۲۵

[۲] اصول کافی، ج ۲، ص ۳۲۷

[۳] محجۃ البیضاء، ج ۳، ص ۱۲۷

کے طور پر یا غصّے میں اپنے بچوں کو بدزبانی کا عملی درس دیتے ہیں۔ بعض گھروں میں اس طرح کے کلمات روز مرّہ کا معمول ہیں:

کتے کا بچہ، کتے کی ماں، کتیا کی بیٹی، احمق، بے وقوف، بے شعور، گدھا، حیوان، حرام زادہ، پاگل، سست، بے ادب، بے غیرت، خدا تمہیں موت دے، گاڑی کے نیچے آؤ وغیرہ۔

کبھی ماں باپ ایک دوسرے کی عیب جوئی کرتے ہیں، ایک دوسرے کا مذاق اڑاتے ہیں یا ایک دوسرے کو گالی دیتے ہیں۔

ماں باپ جن کا فرض یہ ہے کہ بچوں کی کمزوریاں کو چھپائیں وہ کبھی خود بچوں کی عیب جوئی کرنے لگتے ہیں، انہیں طعنے دیتے ہیں، ان پر طنز کرتے ہیں اور انہیں سخت سست کلمات کہتے ہیں۔ کیا ایسے ماں باپ کو توقع ہے کہ ایسے خاندان کا بچہ خوش زبان ہوگا۔ ایسی توقع عموماً پوری نہیں ہوتی۔ ایسے ماں باپ کو توقع رکھنا چاہیے کہ ان کے بچے انہی کی طرح بلکہ ان سے بڑھ کر بدزبان ہوں گے۔ انہیں امید رکھنا چاہیے کہ وہ بعینہ یہی الفاظ بچوں کے منہ سے سنیں گے۔ وعظ و نصیحت اور مار پیٹ سے بچے کو اس بری عادت سے نہیں روکا جا سکتا۔ بہترین طریقہ یہ ہے کہ ماں باپ اپنی اصلاح کریں اور پھر بچے کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔

کبھی بچے یہ بری عادت اپنے ہمجولیوں سے سیکھتے ہیں لہذا ماں باپ کو اس امر کی طرف توجہ رکھنا چاہیے کہ ان کے بچوں کے دوست کس طرح کے ہیں۔ انہیں اس بات کی اجازت نہ دیں کہ بدزبان بچوں سے میل جول رکھیں۔

اگر آپ کبھی اپنے بچے سے کوئی فحش یا بری بات سنیں تو ہنس کر یا مسکرا کر اس کی تائید نہ کریں۔ گالی اور غصّے کے ذریعے سے بھی بچے کو ایسی بات سے نہ روکیں کیونکہ اس طریقے کا نتیجہ زیادہ تر الٹ ہی نکلتا ہے بلکہ اسے اچھے انداز سے اور پیار سے سمجھائیں۔ اس سے کہیں! گالی دینا بری عادت ہے اچھے بچے کبھی گالی نہیں دیتے۔

چغل خوری

چغل خوری ایک انتہائی بری عادت ہے کہ جو بدقسمتی سے بہت سے افراد میں پائی جاتی ہے اگر کوئی شخص کسی کے بارے میں بری بات کرے تو چغل خور اسے آگے پہنچاتا ہے اور کہتا ہے فلاں نے تیرے بارے میں ایسا ویسا کہا ہے چغل خوری پست فکری اور شیطنت کی صفات میں سے ہے۔ اس سے ایک دوسرے کے درمیان کینہ اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ دوستوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے۔ بہت سے جرائم، جھگڑے، قتل، لڑائیاں اسی چغل خوری کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ کتنے گھروں کو اس عادت نے خراب کر دیا ہے میاں بیوی کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہے والدین سے بچوں کو جدا کر دیا ہے۔ چغل خور لوگوں کے راز فاش کرتا ہے۔ جب کہ خدا اس امر پہ راضی نہیں ہے۔ چغل خور کی لوگوں میں کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اسے شیطان، جاسوس اور بدذات سمجھا جاتا ہے۔ زیادہ تر لوگ اس سے ہم نشینی اور دوستی سے گریز کرتے ہیں اور اس پر اور اس کے والدین پر لعنت بھیجتے ہیں۔ بدترین چغل خوری ظالموں کے لیے جاسوسی کرنا اور ٹوہ لگانا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی ظالم کے لیے جاسوسی کرے اور کسی مسلمان کو مصیبت میں پھنسا دے۔ اور اس کی قید، اذیت یا قتل کا سبب بنے تو وہ ظالم کے ظلم میں شریک ہے۔ روز قیامت اسے سزا ملے گی۔ اگرچہ وہ ظلم اور قتل کے جرم میں ظاہراً شریک نہ ہو۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

سب سے برا شخص وہ ہے جو اپنے مسلمان بھائی کی بادشاہ کے پاس چغلی کرے

اور اس کی جاسوسی کرے ۔ یہ جاسوسی اس کے لیے بھی باعث ہلاکت ہے!
اس کے بھائی کے لیے بھی اور بادشاہ کے لیے بھی ۔[۱]

اسلام کے دین مقدس نے جاسوسی اور چغل خوری کو حرام قرار دیا ہے اور اس سلسلے میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں ۔

امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں :

چغل خور پہ بہشت حرام کر دی گئی ہے اور وہ اس میں داخل نہیں ہو سکتا ۔[۲]

امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

تم میں سے شریر اور برے وہ ہیں کہ جو چغل خوری سے دوستوں کے درمیان جدائی ڈال دیتے ہیں اور پاکدامن افراد کی عیب جوئی کرتے ہیں ۔[۳]

چغل خوری کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں ۔ کبھی دشمنی اس کا باعث بنتی ہے ۔ چغل خور کو کسی ایک یا دونوں افراد سے دشمنی ہوتی ہے اس لیے ایک سے دوسرے کی بات بیان کرتا ہے تاکہ ان میں پھوٹ پڑ جائے ۔ اور وہ آپس میں لڑ پڑیں ۔ کبھی کوئی شخص خود نمائی اور دوستی و خیر خواہی جتانے کے لیے چغلی کھاتا ہے ۔ اور کبھی اُس کا مقصد فقط محفل آرائی ہوتا ہے ۔ بہر حال مقصد کچھ بھی ہو کام بہت برا ہے کہ ایک مسلمان کو جس سے بہر حال اجتناب کرنا چاہیے ۔ دین مقدس اسلام نے چغلی سننے تک کو حرام قرار دیا ہے ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں :

چغل خوری نہ کرو اور نہ چغل خور کی باتوں پر کان لگاو ۔[۴]

---

[۱] بحار ، ج ۷۵ ، ص ۲۶۶

[۲] اصول کافی ، ج ۲ ، ص ۳۶۹

[۳] اصول کافی ، ج ۲ ، ص ۳۷۹

[۴] مجمع الزوائد ، ج ۸ ، ص ۹۱

علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ٹوہ لگانے والے اور چغل خور کی بات کی تکذیب کرو وہ غلط ہو یا صحیح [1]

واضح ہے کہ اگر کوئی شخص چغل خور کی باتوں پر کان نہ دھرے گا تو وہ ناچار اس عادت سے دستبردار ہو جائے گا۔ جو شخص کسی کی چغلی آپ کے سامنے کرتا ہے آپ اطمینان رکھیں کہ وہ آپ کا حقیقی دوست اور خیر خواہ نہیں ہے اگر وہ آپ کا دوست ہوتا تو کہنے والے کے سامنے تمہارا دفاع کرتا نہ کہ اس کی بات آکر تمہارے سامنے نقل کرتا۔ تاکہ تم غصے میں جلو اور پریشان ہو۔ اور کبھی وہ تمہیں غلط کاموں پہ ابھارتا ہے۔ مسلمان کو چاہیے کہ وہ رازدار ہو اور اپنی زبان پر کنٹرول کرے اور جاسوسی اور چغل خوری سے پرہیز کرے۔ بہت سے لوگ یہ ناپاک عادت بچپن ہی میں ماں باپ کے ہاں سے حاصل کرتے ہیں۔ لہذا ماں باپ کی بھی اس سلسلے میں ذمہ داری ہے۔ اپنی اولاد کو اس بری عادت سے بچانے کے لیے پہلے ماں باپ کو چاہیے کہ وہ کسی کی چغلی نہ کھائیں ماں کو نہیں چاہیے کہ وہ پھوپھی، باجی، خالہ اور ہمسائیوں کی شکایتیں اپنے شوہر سے کرے۔ اور شوہر بھی بیوی سے دوسروں کی چغلی نہ کھائے کیونکہ اگر ماں باپ کو چغل خوری کی عادت ہوگی تو ان کی اولاد بھی ان کی تقلید کرے گی۔ اور اس بری عادت کو ان سے سیکھے گی۔ کبھی کوئی بچہ اپنی امی، بہن یا بھائی کی شکایت ابو سے کرتا ہے اور چغلی کھاتا ہے۔ اس موقع پر باپ کی ذمہ داری ہے کہ فوراً بچے کو روکے اور اس سے کہے کہ چغلی کھانا برا کام ہے۔ کیوں امی کی بات میرے سامنے بیان کرتے ہو؟ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تم دوسروں کی باتیں مجھ سے بیان کرو۔ پھر میں نہ دیکھوں کہ تو چغلی کھاتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کی چغلیوں پر ردعمل بھی بالکل ظاہر نہ کریں اور انہیں بالکل نظر انداز کر دیں۔ بچوں کو یہ بری عادت نہ پڑے اس لیے

پیغمبر اسلام نے فرمایا:

"چغل خور کی چغلیوں پہ کان نہ دھرو"

---

[1] غرر الحکم، ص ۱۲۵

عیب جوئی

لوگوں میں یونہی کیڑے نکالنا بھی بُری اور مذموم عادتوں میں سے ہے۔ عیب جوئی کرنے والے شخص سے لوگ نفرت کرتے ہیں اور اس سے میل ملاپ پسند نہیں کرتے۔ عیب جوئی دشمنی اور کینے کا باعث بن جاتی ہے، دوستیوں کے بندھن توڑ دیتی ہے اور دوستوں کے مابین جدائی ڈال دیتی ہے۔ اگر کسی کی غیر موجودگی میں اس کی عیب جوئی کی جائے تو یہ غیبت ہے اور سامنے کی جائے تو بھی بُرائی ہے۔ دینِ مقدس اسلام نے اس بُری عادت کو گناہانِ کبیرہ میں سے شمار کیا ہے اس بارے میں بہت سی احادیث مروی ہیں۔ مثلاً :

رسولِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خطبہ دیتے ہوئے باآواز بلند فرمایا: اے وہ لوگو! کہ جو زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہو۔ لیکن تمہارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا! مسلمانوں کی غیبت اور بدگوئی نہ کرو اور ان کے عیب تلاش نہ کرتے رہو کیونکہ ہر وہ شخص جو اپنے بھائی کے عیب ڈھونڈے اللہ اس کے عیوب آشکار کر دے گا اور اسے لوگوں کی نظروں میں رسوا کر دے گا[1]

---

[1] جامع السعادات، ج ۲، ص ۳۰۲

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

جو شخص بھی کسی مومن سے متعلق کوئی ایسی بات کہے کہ جس سے اس کی عزت و آبرو جاتی ہو، اللہ اسے اپنے دوستوں کے زمرے سے نکال کر شیطان کے دوستوں میں شامل کر دے گا اور شیطان بھی اسے قبول نہیں کرے گا۔[1]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

جو کوئی بھی کسی مسلمان مرد یا عورت کی غیبت اور بدگوئی کرے گا، اللہ چالیس روز تک اس کی نماز روزہ قبول نہیں کرے گا مگر یہ کہ جس کی اس نے غیبت کی ہے اسے راضی کرے۔[2]

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

غیبت اور بدگوئی حرام ہے اور نیکیوں کو یوں تباہ کر دیتی ہے جیسے آگ ایندھن کو جلا ڈالتی ہے۔[3]

بدقسمتی سے اتنا بڑا گناہ ہمارے لوگوں کا معمول بن چکا ہے۔ یہاں تک کہ اب لوگوں کو برائی ہی معلوم نہیں ہوتا اور لوگ اس کے عادی ہو چکے ہیں۔ ماں باپ کی برائی کرتی ہے اور باپ ماں کی۔ ہمسائے اور رشتے دار ایک دوسرے کی عیب جوئی کرتے ہیں۔ معصوم بچے یہ بُری عادت اپنے گھر اور ماں باپ ہی سے اپناتے ہیں۔ بچے دوسرے بچوں کی عیب جوئی کرتے ہیں۔ تدریجاً بڑے ہو جاتے ہیں تو پھر اس خو کو چھوڑنا ان کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔

بعض ناسمجھ ماں باپ اپنے بچوں کی برائی بھی کرتے ہیں جب کہ انہیں اپنی اولاد

---

[1] جامع السعادات، ج ۲، ص ۳۰۵

[2] جامع السعادات، ج ۲، ص ۳۰۴

[3] جامع السعادات، ج ۲، ص ۳۰۵

کی کوتاہیوں کو چھپانا چاہیے۔ کبھی ماں باپ اپنی اولاد کی بُرائی اس کے سامنے مذاق کے طور پر یا غصے میں بیان کرتے ہیں۔

ایسی صورت میں بچے ماں باپ کے بارے میں بدظن ہو جاتے ہیں، یا ان میں بھی یہ عادت پڑ جاتی ہے اور یا پھر اپنے بارے میں وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں لہٰذا ماں باپ کو بچوں کی عیب جوئی سے پرہیز کرنا چاہیے۔

گھر میں بچوں کا لڑائی جھگڑا

ایک بہت بڑی گھریلو پریشانی بچوں کا لڑائی جھگڑا ہے۔ بچے جب ایک سے زیادہ ہوجائیں تو پھر ان کے درمیان لڑائی جھگڑا بھی شروع ہوجاتا ہے۔ ایک دوسرے کو اپنے لیے بدشگون سمجھتا ہے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہیں، کھلونے چھینتے ہیں، ایک دوسرے کی کاپی پر لکیریں کھینچ دیتے ہیں، مذاق اڑاتے ہیں، ایک شور مچاتا ہے تاکہ دوسرا اسکول کا سبق یاد نہ کر سکے۔ ہر بچہ جانتا ہے کہ وہ کن طریقوں سے اپنے بھائی یا بہن کو ستا اور رُلا سکتا ہے وہ ایک دوسرے کی خوب خبر لیتے ہیں۔ اس صورت حال پر ماں باپ بے چارے کڑھتے رہتے ہیں۔ لڑائی جھگڑے کی شکایت ان کے پاس آتی ہے۔ خرابی تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بچوں کی لڑائی ماں باپ پر اثر انداز ہوجاتی ہے۔ ماں، باپ سے کہتی ہے تم تو بچے کی تربیت کی طرف توجہ نہیں دیتے، وہ تم سے ڈرتے تک نہیں، یہ تمہاری لاپرواہی کی وجہ ہی سے گھر میدان جنگ بن چکا ہے۔

باپ، ماں سے کہتا ہے: اگر تو سمجھدار عورت ہوتی تو یہ بچے اتنے شیطان اور نالائق نہ ہوتے۔ تیری حمایت کی وجہ سے بچوں کی یہ حالت ہے۔

یہاں پر ماں باپ کو یاد رکھنا چاہیے کہ بچے تو بچے ہوتے ہیں۔ ان سے اس بات کی توقع نہ رکھیں کہ وہ پینتالیس سالہ کسی شخص کی طرح آرام سے کسی کونے میں بیٹھے ہوں۔ آپ اس حقیقت کو قبول کریں کہ بچوں کا لڑائی جھگڑا تو ایک فطری سی بات ہے۔ لڑائی تو بڑوں میں بھی ہوجاتی ہے۔ ایک گھر میں بچوں سے کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ہمیشہ آرام د

سکون سے بیٹھے رہیں اور کبھی لڑائی جھگڑا نہ کریں۔ بچے تو شریر ہوتے ہی ہیں۔ وہ جلدی پھر آپس میں گھُل مِل جاتے ہیں بڑوں کی طرح دیر تک ایک دوسرے سے منہ بسورے بیٹھے نہیں رہتے۔ ایک ماہر نفسیات اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ یہ بات ہمیں سوچنا ہی نہیں چاہیے کہ ایک گھر، اس میں چند بچے بھی ہوں مگر وہ ہمیشہ مل جل کر رہیں کبھی لڑیں جھگڑیں نہیں۔ ہم نے جس بچے سے بھی بات کی ہے وہ یہ کہتا ہے کہ امی ابو یہ سوچتے رہتے ہیں کہ ہم بہن بھائی جب اکھٹے ہوں تو ہمیں بہت زیادہ اتفاق و آرام سے رہنا چاہیے۔ اگر آپ حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی اس توقع سے تھوڑا سا پیچھے ہٹ جائیں تو بچوں کے اس لڑائی جھگڑے سے اتنا پریشان نہیں ہوں گے۔[1]

ہمیں یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیے کہ بچوں کی یہ عادت ہمیشہ نہیں رہے گی بلکہ عمر کے ساتھ ساتھ خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اگر ماں باپ ان کے بچپن کے طرز عمل کو ایک حقیقت کے طور پر مان لیں تو پھر کسی حد تک انہیں اطمینان ہو جائے گا اور کم از کم وہ ان کے بچپن کے لڑائی جھگڑے خود اُن تک نہیں پہنچنے دیں گے۔

ایک ماہر نفسیات لکھتے ہیں:

شاید بچوں کے بہت سارے کام مثلاً آپس میں مذاق کرنا۔ ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا کرنا۔ کشتی کرنا۔ صرف وقت کے ساتھ ساتھ اور ان کے بڑے ہونے سے ختم ہو جاتے ہیں۔[2]

ہاں یہ درست ہے کہ زیادہ تر موقع پر ماں باپ بچوں کے لڑائی جھگڑوں کو ختم نہیں کر سکتے لیکن عقل اور تدبیر سے ان میں کمی پیدا کر سکتے ہیں۔ عقل مند ماں باپ بچوں کے

---

[1] روان شناسی کودک از تولد تا دہ سالگی، ص ۲۸۶

[2] روان شناسی کودک۔ رفتار کودکان از تولد تا دہ سالگی ص ۲۸۶

لڑائی جھگڑے پر بالکل تماشائی نہیں بنے رہ سکتے۔ بلکہ ان کی ذمہ داری ہے کہ عقل و تدبیر سے اس کے عوامل کو ختم کریں۔ انہیں اجازت نہ دیں کہ وہ ایک دوسرے کو اذیت پہنچائیں۔ ماں باپ کو چاہیے کہ پہلے وہ اختلاف کے عوامل کو سمجھیں اور ان اسباب کو پیدا ہونے سے روکیں ورنہ بعد میں مسئلہ مشکل ہو جائے گا۔ بچوں کے درمیان اختلاف کی ایک اہم وجہ ان کا آپس میں حسد ہے نظر انداز کرنے سے حسد ختم نہیں ہو سکتا۔ اور ڈانٹ ڈپٹ بھی اس کا علاج نہیں ہے۔ چاہیے کہ حسد پیدا ہونے کے اسباب کو روکا جائے۔

بچہ خود پرست ہے وہ چاہتا ہے کہ فقط وہی ماں باپ کا محبوب ہو اور کوئی اور ان کے دل میں جگہ نہ پائے۔ پہلا بچہ عموماً ماں باپ کو لاڈلا ہوتا ہے۔ وہ اس سے پیار محبت کرتے ہیں۔ اس کی خواہشات کو پورا کرتے ہیں۔ لیکن جب دوسرا بچہ دنیا میں آتا ہے تو حالات بدل جاتے ہیں۔ ماں باپ کی پوری توجہ نومولود کی طرف ہو جاتی ہے اب بڑا بچہ خطرہ کا احساس کرتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہ ننھا بن بلایا مہمان اب اس کا رقیب بن گیا ہے۔ اور ماں باپ کو اس نے اپنا بنا لیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس سے انتقام لینا چاہیے۔ لیکن نومولود پر ماں باپ کی شفقت ہوتی ہے لہذا اُسے قبول کیے بغیر چارہ بھی نہیں ہوتا۔ ان حالات میں ممکن ہے بڑا بچہ اپنے آپ کو بیمار ظاہر کرے، زمین پر گر جائے، کھانا نہ کھائے، غصہ کرے۔ روئے یا اپنے کپڑوں کو خراب کر دے تاکہ اس طرح سے وہ ماں باپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کر سکے یہ بچہ اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا ہے اور اُسی وقت سے بھائی یا بہن کے بارے میں اپنے دل میں کینہ پیدا کر لیتا ہے۔ اور اس موقع کے انتظار میں رہتا ہے کہ اس سے انتقام لے سکے۔ اس کیفیت میں سب بچے پیدا ہوتے ہیں اور گھر کے دوسرے بچوں سے آملتے ہیں۔ انہیں حالات میں حسد اور کینہ پیدا ہوتا ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ماں باپ شروع ہی سے اپنے طرز عمل پر توجہ رکھیں۔ اور بچوں میں حسد کے اسباب پیدا نہ ہونے دیں۔ سمجھدار ماں باپ نومولود کے دنیا میں آنے سے پہلے ہی بڑے بچوں کو ذہنی طور پر اس کے استقبال کے لیے اور قبول کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ ان سے کہتے ہیں۔ انہیں پہلے ہی سمجھاتے ہیں کہ جلد ہی تمہارا ننھا بھائی یا ننھی بہن پیدا ہوگی۔ جب وہ بڑی ہو گی تو

تم سے پیار کرے گی۔ تمہارے ساتھ مل کے کھیلے گی۔

اگر وہ نو مولود کے لیے کوئی چیز تیار کریں تو بڑے بچوں کے لیے بھی کوئی چیز خریدیں جب ماں نئی پیدائش کے لیے کسی میڈیکل سینٹر میں داخل ہو جائے تو باپ بچوں کے لیے تحفہ لا سکتا ہے اور ان سے کہہ سکتا ہے کہ یہ ننھے کی آمد کی خوشی میں تمہارے لیے تحفہ لایا ہوں۔ جب نو مولود گھر آئے تو زیادہ شور شرابہ نہ کریں اور دوسرے بچوں کی موجودگی میں اسی کی زیادہ تعریف نہ کریں۔ پہلے کی طرح بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ان کا خیال کریں۔ ان سے محبت کریں ایسا سلوک کریں کہ بڑے بچے مطمئن ہوں وہ سمجھیں کہ نئے بچے کے آنے سے اُن کی زندگی کو نقصان نہیں پہنچا۔ اس طرح سے وہ نئے بچے کے لیے اپنی گود پھیلا سکتے ہیں اور خوشی خوشی اس کا استقبال کر سکتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر ماں باپ چاہیں کہ ان کے بچے آپس میں دوست ہوں اور ان میں لڑائی جھگڑا نہ ہو تو ان میں حسد کے اسباب پیدا نہ ہونے دیں اور ان کو ایک آنکھ سے دیکھیں۔ سب سے ایک جیسا سلوک کریں تا کہ وہ آپس میں دوست ہوں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

انصاف اختلاف کو ختم کر دیتا ہے اور دوستی کا سبب بنتا ہے [1]

امیر المومنین علی علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:

عادلانہ سلوک بہترین تدبیر ہے [2]

ممکن ہے بعض بچوں میں واقعاً ایسی خصوصیت ہو کہ جس کی وجہ سے ماں باپ کی محبت ان سے زیادہ ہو جائے۔ ہو سکتا ہے بعض بچے زیادہ ذہین ہوں زیادہ خوبصورت ہوں۔ بعض کا اخلاق بہتر ہو۔ ہو سکتا ہے زیادہ محنتی ہو۔ ہو سکتا ہے بعض زیادہ خوش زبان ہوں، ہو سکتا ہے کسی کا سلوک دوسرے سے ماں باپ سے بہتر ہو۔ ہو سکتا ہے کوئی کلاس سے دوسروں کی نسبت نمبر اچھے لائے۔ ہو سکتا ہے ماں باپ بیٹی یا بیٹے کو زیادہ پسند

---

[1] غرر الحکم، ص ۴۶

[2] غرر الحکم، ص ۴۶

رستے ہوں۔

ممکن ہے اس میں کوئی حرج بھی نہ ہو کہ ماں باپ قلباً کسی ایک بچے کو زیادہ پسند کرتے ہوں لیکن ان کا سلوک سب سے ایک جیسا ہونا چاہیے اور اس میں فرق نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ بچے ذرا بھر بھی دوسروں کے بارے میں ترجیحی سلوک نہ دیکھیں۔ یہاں اس امر کا تذکرہ ضروری ہے کہ بچے ماں باپ کی محبت کے بارے میں بہت حساس ہوتے ہیں۔ اور اس پر بہت توجہ دیتے ہیں اور حقیقت کو جلد سمجھ لیتے ہیں۔ لہٰذا ماں باپ کو بہت محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔

بعض ماں باپ۔ بچوں کی تربیت کے لیے ایک کی خصوصیات دوسرے کے سامنے بیان کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں، حسن! خوب سبق پڑھو تاکہ عباس کی طرح اچھے نمبر حاصل کر سکو۔ کہتے ہیں: زہرا! تم بھی اپنی بہن زینب کی طرح ماں کی مدد کرو، زینب کتنی اچھی بچی ہے۔ کہتے ہیں: رضا! تم بھی اپنے بھائی علی کی طرح دسترخوان پر سلیقے سے بیٹھو۔ دیکھو وہ کتنا باادب بچہ ہے۔

ایسے ماں باپ کا طرز عمل بالکل غلط ہے کیونکہ اس کا نہ فقط مثبت تربیتی نتیجہ نہیں نکلتا بلکہ اس سے بچوں میں رقابت اور حسد پیدا ہو جاتا ہے اور انہیں انتقام اور دشمنی پر ابھارتا ہے۔ کبھی بچے خود بھی ایسی باتوں کا اظہار کرتے ہیں۔

بچوں کے لڑائی جھگڑے کی ایک وجہ ماں باپ کی اُن سے بے جا توقع ہے۔ بچہ چاہتا ہے کہ اپنے بھائی یا بہن کے کھلونوں سے کھیلے لیکن وہ اسے اس کی اجازت نہیں دیتے۔ لہٰذا لڑائی جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت ماں یا باپ دخالت کرتے ہیں اور پیار کے ساتھ سمجھاتے ہیں اور اگر پیار کا اثر نہ ہو تو سختی سے انہیں سمجھاتے ہیں کہ وہ اپنے کھلونے اپنے بھائی کو دے دیں۔ مثلاً کہتے ہیں: یہ تمہارا بھائی ہے، کیوں اسے کھلونے نہیں دیتے ہو؟ کھلونے لائے تو ہم ہی ہیں، کیا یہ تمہاری ملکیت ہیں کہ جو اسے کھیلنے کی اجازت نہیں دیتے ہو؟ اگر تم نے ایسا کیا تو پھر تم سے ہم پیار نہیں کریں گے اور نہ ہی آئندہ تمہیں کھلونے خرید کر دیں گے۔

بچہ بیچارہ مجبور ہو جاتا ہے۔ کھلونے دے تو دیتا ہے لیکن ماں یا باپ کو سخت مزاج

اور بھائی کو ظالم سمجھنے لگتا ہے اور دل میں دونوں سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے اور جب بھی اسے موقع ملتا ہے پھر وہ اس کا اظہار کرتا ہے کیوں کہ بچہ ان کھلونوں کو اپنا مال سمجھ رہا ہوتا ہے اور اس کا خیال ہوتا ہے کہ کسی کو حق نہیں کہ اس کی اجازت کے بغیر انہیں ہاتھ لگائے لہذا وہ اپنے آپ کو مظلوم اور اپنے بھائی اور باپ کو ظالم سمجھتا ہے۔ ایسے موقع پر یہ بچہ حق پر ہے کیوں کہ ماں باپ کسی کو اجازت نہیں دیتے کہ ان کی مخصوص چیزوں کو کوئی چھیڑے۔ پھر یہ حق وہ بچوں کو کیوں نہیں دیتے اور ہر شخص کی کچھ اپنی چیزیں ہوتی ہیں کہ جن کے استعمال سے وہ دوسروں کو روک سکتا ہے۔ البتہ عقل مند اور باتدبیر ماں باپ آہستہ آہستہ بچوں کے اندر تعاون اور ایثار کا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں۔ اور ایسی فضا پیدا کر سکتے ہیں کہ وہ خوشی خوشی اپنے بہن بھائیوں کو اپنے کھلونوں سے کھیلنے اور اپنی چیزوں کے استعمال کی اجازت دیں۔

کبھی اختلاف کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کبھی ماں باپ کوئی کام ایک بچے کے سپرد کر دیتے ہیں اور دوسروں کو ایسے ہی چھوڑ دیتے ہیں اس صورت میں لڑائی جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔ اگر ماں باپ اس طرح کی کشمکشوں سے بچنا چاہیں تو انہیں چاہیے کہ سب بچوں کو ایک نظر سے دیکھیں اور ان میں کوئی تفریق روا نہ رکھیں۔ یا تو کسی سے کوئی کام نہ کہیں۔ یا پھر ان کی صلاحیت کو سمجھ کر ہر کسی کے لیے کوئی کام متعین کریں اور ان کے ذمہ لگائیں تاکہ اختلاف پیدا نہ ہو بیکاری بھی خرابیوں کی ایک وجہ ہے بچوں کی مشغولیت کے لیے کوئی کام ہونا چاہیے تاکہ ان میں جھگڑا کم سے کم ہو۔ خاص طور پر اگر ہو سکے تو انہیں کسی ایسے کھیل پر اُبھاریں کہ جسے وہ مل جل کر کھیل سکیں۔ یہ ان کے لیے بہت مفید ہوگا۔

کبھی ماں باپ کی آپس کی لڑائی بھی بچوں میں جھگڑے کا باعث بن جاتی ہے۔ جب معصوم بچے دیکھتے ہیں کہ ان کے ماں باپ ہمیشہ ایک دوسرے سے تو تکار اور لڑائی جھگڑا کرتے رہتے ہیں تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید لڑائی جھگڑا زندگی کے لازمی امور میں سے ہے۔ اور ایک ایسا کام ہے جس سے بچا نہیں جا سکتا۔ اس لحاظ سے وہ ماں باپ کی تقلید کرتے ہیں۔ اور یہی کام وہ آپس میں کرتے ہیں۔

لہذا جو ماں باپ بچوں کے لڑائی جھگڑے سے تنگ ہوں انہیں پہلے اپنی اصلاح

کرنا چاہیے۔ آپس کے نزاع اور کشمکش کو ترک کر دینا چاہیے پھر بچوں کی اصلاح کے درپے ہونا چاہیے۔ شاید ایسا کوئی خاندان کم ہی ہو کہ جس میں کبھی کوئی جھگڑا پیدا نہ ہوا ہو۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ بچوں کی عدم موجودگی میں وہ آپس میں اس سلسلے میں بات کریں۔ اور اگر کوئی بات بچوں کے سامنے ہو جائے تو وہ بچوں سے کہہ سکتے ہیں کہ کسی مسئلے پر ہمارا اختلاف رائے ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اسے حل کریں۔

آخر میں ہم اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں کہ ممکن ہے آپ ان تمام امور کو ملحوظ خاطر رکھیں لیکن پھر بھی بچوں کے لڑائی جھگڑے سے کامل طور پر نہ بچ سکیں۔ آپ کو یہ توقع نہیں ہونی چاہیے۔ نہ ہی ہم نے اس کی ضمانت دی ہے۔ آپ کے بچے بھی عام بچوں کی طرح ہیں۔ بچوں کے جھگڑے ایک فطری سی بات ہے۔ بچوں میں توانائی زیادہ ہوتی ہے جو وہ ایسے کاموں پر خرچ کرتے ہیں۔ آپ متوجہ رہیں کہ وہ ایک دوسرے کو نقصان نہ پہنچائیں اور ایک دوسرے کو شدید اذیت نہ دیں بہتر یہ ہے کہ حتی الامکان بچوں کے چھوٹے موٹے جھگڑوں میں آپ شریک نہ ہوں۔ انہیں آپ رہنے دیں کہ وہ اپنے مسئلے خود حل کریں۔ نہ ہی آپ ایسی باتوں پر زیادہ پریشان ہوں۔ ان کا طرز عمل خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔

دوست اور دوستی

اچھا دوست اور مہربان رفیق اللہ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے۔ مصیبت میں دوست ہی انسان کی پناہ ہوتا ہے اور قلب و روح کے آرام کا ذریعہ۔ مشکلات سے بھری اس دنیا میں ایک حقیقی دوست کی موجودگی ہر انسان کی ضرورت ہے۔ جو شخص ایک مہربان دوست کی نعمت سے محروم ہو وہ وطن سے دور تنہائی کی سی کیفیت میں ہوتا ہے اور کوئی اس کا غمخوار نہیں ہوتا کہ زندگی کی مشکلات میں وہ جس کا سہارا لے سکے۔

حضرت امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ دنیا میں آرام کا بہترین وسیلہ کیا ہے۔

فرمایا! کھلا گھر اور زیادہ دوست" [۱]

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اَعجزُ الناس مَنْ عَجَزَ عَنْ اِکْتِسَابِ الاخوان۔

کمزور ترین شخص وہ ہے جو کسی کو دوست اور بھائی نہ بنا سکے [۲]

حضرت علی علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:

دوستوں کا نہ ہونا ایک طرح کی غریب الوطنی اور تنہائی ہے [۳]

---

[۱] بحار، ج ۷۴، ص ۱۷۷

[۲] نہج البلاغہ، ج ۳، ص ۱۵۳

[۳] بحار، ج ۷۴، ص ۱۷۸

جیسے بڑوں کو دوستوں کی ضرورت ہوتی ہے ویسے ہی بچوں کو بھی یار دوست کی ضرورت ہوتی ہے جس بچے کا کوئی دوست نہ ہو وہ ہر جگہ تنہا تنہا سا، مرجھایا مرجھایا سا اور افسردہ افسردہ سا رہتا ہے۔ بچے کو فطری طور پر دوست کی خواہش ہوتی ہے اور اس فطری خواہش سے اسے محروم نہیں رکھا جا سکتا۔ دوست اور ہم جولی میں فرق ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا ہم جولی تو ہو مگر دوست نہ ہو۔ کبھی بچہ ہم جولیوں اور کلاس فیلوز میں سے کسی دوست کا انتخاب کرتا ہے۔ شاید دوستی کا اصلی محرک اور عامل زیادہ واضح نہ ہو۔ ہو سکتا ہے دو افراد کی باہمی روحانی ہم آہنگی انہیں ایک دوسرے کے نزدیک کر دے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

لوگوں کے دل بھٹکتے ہوئے جنگلیوں کے مانند ہیں جو بھی ان سے محبت کرے اسی میں کھو جاتے ہیں[1]

دوست کسی پر ٹھونسا نہیں جا سکتا کہ ماں باپ اپنی اولاد سے کہیں کہ فلاں بچے کو دوست بناؤ اور فلاں کو نہ بناؤ۔ دوست کے انتخاب میں بچے کو آزادی ملنا چاہیے البتہ ہر طرح کی آزادی نہیں دی جا سکتی کیونکہ دوستوں کا اخلاق و کردار ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے اور ایک دوست دوسرے کے اخلاق اور طرز عمل کو اپناتا ہے۔ اگر بچے نے ایک خوش اخلاق اور اچھا دوست بنا لیا تو وہ اس سے اچھائیاں اپنائے گا اور برا دوست مل گیا تو اس کی برائیاں اس پر اثر انداز ہوں گی۔ بہت سے معصوم بچے اور نوجوان ہیں کہ جو اپنے برے دوستوں کے باعث گناہ کی وادی میں جا پہنچے ہیں اور ان کی دنیا و آخرت تباہ ہو چکی ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

انسان اپنے دوست کے مذہب، طریقے اور روش کا خوگر بن جاتا ہے[2]

---

[1] بحار، ج ۷۴، ص ۱۷۸

[2] اصول کافی، ج ۲، ص ۳۷۵

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:
لوگوں میں سب سے زیادہ خوش نصیب وہ ہے کہ جس کا میل جول اچھے لوگوں کے ساتھ ہو۔[1]

اسی وجہ سے اسلام اپنے ماننے والوں کو اس امر کا حکم دیتا ہے کہ وہ بُرے دوست سے اجتناب کریں۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:
فاسقوں اور گنہ گاروں کے ساتھ دوستی سے بچو کیونکہ بُرائی کی تاثیر بُرائی ہی ہے۔[2]

امام سجاد علیہ السلام نے اپنے فرزند دلبند امام محمد باقر علیہ السلام سے فرمایا:
اے میرے بیٹے! پانچ طرح کے لوگوں سے رفاقت نہ رکھو۔

۱۔ جھوٹے کے ساتھ رفاقت نہ کرو کہ وہ سراب کے مانند ہے۔ وہ تجھے فریب دے گا۔ دور کو نزدیک اور نزدیک کو دُور بتائے گا۔
۲۔ فاسق اور بدکار کو دوست نہ بناؤ کہ وہ تجھے بہت کم قیمت پر یہاں تک کہ ایک نوالے کے مول بیچ دے گا۔
۳۔ کنجوس کو دوست نہ بناؤ کیونکہ وہ ضرورت پڑنے پر مدد نہیں کرے گا۔
۴۔ کسی احمق کو دوست نہ بناؤ کیوں کہ وہ اپنی بے وقوفی کے باعث تمہیں نقصان پہنچائے گا۔ بلکہ یہ تک ممکن ہے کہ وہ فائدہ پہنچانا چاہے مگر نقصان پہنچا دے۔
۵۔ قطع رحمی کرنے والے کو دوست نہ بناؤ کیونکہ قطع رحمی کرنے والا خدا کی رحمت سے دور اور ملعون ہے۔[3]

---

[1] غرر الحکم، ص ۱۸۹
[2] بحار، ج ۷۴، ص ۱۹۹
[3] اصول کافی، ج ۲، ص ۳۷۶

لہٰذا سمجھدار اور فرض شناس ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کے دوستوں سے لاتعلق نہ رہیں کیونکہ ایسا کرنا نہ بچوں کے فائدے میں ہے اور نہ ماں باپ کے۔ البتہ ماں باپ کی اس معاملے میں بلا واسطہ دخالت بھی درست نہیں ہے۔

اگر ماں باپ اپنے بچوں کے لیے ایک اچھا اور نیک دوست مہیا کر سکیں تو انہوں نے بچے کی بھلائی کا انتظام کیا ہے اور اسے تباہی کے راستے سے بچایا ہے۔ لیکن یہ بھی کوئی آسان کام نہیں۔ اس کے لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ جب اچھے برے کی کچھ تمیز کرنے لگے تو اسے پیار محبت سے ایک اچھے اور برے دوست کی صفات بتائیں۔ برے بچوں کے ساتھ دوستی کے نتائج بھی اس پر واضح کریں۔

پھر بچوں کے دوستوں اور ان کے طرز عمل پر کچھ فاصلے سے، نگاہ رکھیں۔ اگر ماں باپ دیکھیں کہ ان کے دوست اچھے ہیں تو ان کی تائید و تشویق کریں اور انہیں ملنے جلنے کے مواقع فراہم کریں لیکن اگر دیکھیں کہ ان کے بچے دھوکا کھا گئے ہیں اور برے بچوں کو دوست بنا رہے ہیں تو پیار محبت سے ان کی خامیوں کی طرف متوجہ کر کے اپنے بچوں کو ان سے میل ملاقات سے روکیں۔ پیار محبت سے یہ کام نہ ہو سکے تو کچھ سختی سے منع کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور طریقے سے بھی ماں باپ بچے کے لیے اچھے دوست کے انتخاب میں مدد کر سکتے ہیں۔ اس کے ہمجولیوں، محلے والوں، ہمسایوں وغیرہ میں سے کسی اچھے دوست کو تلاش کریں اور ان کے درمیان بہتر رابطے کا وسیلہ فراہم کریں۔ اس طرح اگر وہ آپس میں دوست ہو جائیں تو ان کی تشویق کریں۔ اس طرح ماں باپ بہت اچھی خدمت سرانجام دے سکتے ہیں اور بچوں کی بہت سی خامیاں اچھے دوست کے انتخاب سے دور کر سکتے ہیں۔ مثلاً وہ ماں باپ جن کا بیٹا بزدل ہے وہ اس کے لیے کوئی شجاع بچہ انتخاب کریں کہ جس سے دوستی کے ذریعے اس کی بزدلی جاتی رہے۔

بہرحال ماں باپ کو نہیں چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کے دوستوں بالخصوص نوجوانی کے دور میں ان کے دوستوں سے غافل رہیں اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں کیونکہ بچہ اور نوجوان کے لیے بدلنے کے زیادہ امکانات ہیں۔ جب کہ عمومی اخلاق اور معاشرے کی حالت

بھی ٹھیک نہ ہو تو ممکن ہے تھوڑی سی غفلت سے آپ کا فرزندِ دلبند بُرائی اور بدبختی کے گڑھے میں جا گرے۔ لہٰذا یاد رکھیں کہ پرہیز علاج سے کہیں بہتر ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں :

ہر چیز کے لیے ایک آفت ہے اور نیکی کے لیے آفت بُرا دوست ہے

ایک صاحب لکھتے ہیں :

میرے ماں باپ مجھے دوستوں سے ملنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ اگر دوست مجھے گھر پر ملنے آتے تو میں مجبور ہوتا کہ ایک دو باتیں کر کے انہیں رخصت کر دوں۔ ایک دوست ہمارے گھر کے قریب ہی رہتا ہے۔ امی ابو اسے جانتے تھے لیکن وہ ہمیں ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے کی اجازت نہ دیتے۔ مجھے بہت خواہش ہوتی کہ دوستوں سے ملوں، ان کے ساتھ بیٹھوں اور ان سے بات چیت کروں لیکن کیا کرتا امی ابو حائل تھے۔ مجھے اس کا بہت غم تھا۔ ایک روز میں نے ارادہ کر لیا کہ جیسے بھی ہو دوستوں سے ملنے ضرور جاؤں گا۔ میں نے امی سے کہا : میرا امتحان ہے اس کے لیے مجھے جانا ہے اجازت تو امتحان کے لیے لی لیکن اپنے دوست کے ہاں جا پہنچا۔ اس دوست کا گھر کچھ دُور تھا۔ ایک ویگن پر بیٹھا اور اس کے ہاں چلا گیا۔ وہاں اور دوست بھی تھے۔ دن ان کے ساتھ خوب خوش گپیوں میں گزرا۔ شام واپس آیا تو امی نے کہا بہت دیر سے آئے ہو۔ پھر ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے مجھے اور کئی جھوٹ بولنا پڑے۔

آج سوچتا ہوں کہ کیا امی جان کو معلوم نہ تھا کہ دوست اور رفیق کی کسی بچے کو کتنی ضرورت ہوتی ہے۔ انہوں نے مجھے اس قدر پابند کیوں کر رکھا تھا۔

ایک لڑکی لکھتی ہے :

ایک مرتبہ میں نے اپنی کچھ سہیلیوں کو گھر بلایا۔ اور میرے پاس جو پیسے گلے میں جمع تھے۔ وہ نکالے۔ بھاگم بھاگ گئی اور ان کے لیے آئس کریم لائی۔ امی کہیں

گئی ہوئی تھیں۔ سہیلیاں آئس کریم کھا رہی تھیں اوپر سے امی گھر میں داخل ہوئیں۔ مجھے بہت خوف ہوا۔ خدا جانے امی کیا کہیں! کیوں کہ وہ تو ہمیشہ مجھے سہیلیوں سے ملنے سے منع کرتی رہتی تھیں۔ انہوں نے بالکل میری عزت کا خیال نہ کیا اور میری سہیلیوں سے کہنے لگیں! تم نے صائمہ سے فضول خرچی کروائی ہے۔ سہیلیاں چلی گئیں۔ لیکن بات یہاں تک تمام نہ ہوئی۔ امی اگلے دن سکول جا پہنچیں۔ میری استانی سے جا کر شکایت کے لہجے میں میری سہیلیوں کے بارے میں کہا یہ ہمارے گھر آتی ہیں اور میری بیٹی کو فضول خرچی پر مجبور کرتی ہیں۔ کل میری بیٹی سے آئس کریم کھا رہی تھیں۔ سہیلیاں جو میری ہم کلاس بھی تھیں وہ کہنے لگیں۔ آنٹی کل والی آئس کریم کے پیسے ہم دے دیتی ہیں۔ مجھے اتنی شرم آئی دل چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور میں غرق ہو جاؤں۔ وہ دن اور آج کا دن پھر میں سکول نہیں جا سکی۔ سہیلیاں اگلی کلاسوں میں جا پہنچیں۔ اور میں پشیمان سی۔ سہمی سہمی سی۔ اداس اداس سی آج ان سے کہیں پیچھے رہ گئی ہوں۔

بچّہ اور دینی تعلیم

اللہ اور دین کی طرف توجہ انسان کی فطرت میں داخل ہے اس کا سرچشمہ انسان کی اپنی سرشت ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں فرماتا ہے :

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ

اپنا رخ دینِ مستقیم کی طرف کرلو ۔۔۔ وہی دین کہ جو فطرتِ الٰہی کا حامل ہے اور وہی فطرت کہ جس کی بنیاد پر اُس نے انسان کو خلق فرمایا ہے ۔ (روم ۔ ۳۰)

ہر بچہ فطری طور پر خدا پرست ہے لیکن خارجی عوامل اثر انداز ہوجائیں تو صورت بدل جاتی ہے جیسا کہ

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :

كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلٰى فِطْرَةِ الْاِسْلَامِ .....

ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے مگر بعد ازاں اس کے ماں باپ اسے یہودی ، عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں[1]

ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچے کے لیے ایسا ماحول پیدا کریں کہ اس میں

---

[1] بحار ، ج ۳ ، ص ۲۸۱

فطری طور پر ودیعت کیے گئے عقائد نشو ونما پا سکیں۔ انسان بچپن ہی سے ایک ایسی قدرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ جو اس کی ضروریات پوری کر سکے۔ لیکن اس کا ادراک اس حد تک نہیں ہوتا کہ وہ اپنی مرتکز شدہ توجہ کو بیان کر سکے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ توجہ ظاہر ہو جاتی ہے۔ جو بچہ ایک مذہبی گھرانے میں پرورش پاتا ہے وہ کوئی چار سال کی عمر میں اللہ کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے اور یہی وہ عمر ہے جس میں بچے کے ذہن میں مختلف قسم کے سوالات ابھرنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ اللہ کا نام زبان پر لاتا ہے۔ اس کے سوالوں اور باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی فطرت بیدار ہو چکی ہے اور وہ اس سلسلے میں زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔

بچہ سوچتا ہے کہ:

- سورج کس نے بنایا ہے؟
- چاند تارے کس نے پیدا کیے ہیں؟
- کیا اللہ تعالیٰ مجھ سے پیار کرتا ہے؟
- کیا اللہ تعالیٰ میٹھی چیزیں پسند کرتا ہے؟
- بارش کون برساتا ہے؟
- الو کو کس نے پیدا کیا ہے؟
- کیا اللہ ہماری باتیں سنتا ہے؟
- کیا ٹیلی فون کے ذریعے اللہ سے باتیں کی جا سکتی ہیں؟
- اللہ کہاں رہتا ہے؟
- اس کی شکل کس طرح کی ہے؟
- کیا خدا آسمان پر ہے؟

چار سال کے بعد بچے اس طرح کے ہزاروں سوال کرتے اور سوچتے ہیں۔

ان سوالات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس کی فطرت خدا پرستی بیدار ہو چکی ہے اور وہ یہ باتیں پوچھ کر اپنی معلومات مکمل کرنا چاہتا ہے۔ معلوم نہیں کہ ننھا منا بچہ خدا کے بارے میں کیا تصور رکھتا ہے۔ شاید وہ یہ سوچتا ہے کہ خدا اس کے ابو کی طرح ہے لیکن اس،

سے بڑا اور زیادہ طاقتور ہے۔ بچے کا شعور جس قدر ترقی کرتا جاتا ہے، خدا کے بارے میں اس کی شناخت بڑھتی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ماں باپ پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وہ اپنے بچوں کے عقائد کی تکمیل میں بہت اہم خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں اگر انہوں نے کوتاہی کی تو روز قیامت ان سے باز پرس کی جائے گی۔ ماں باپ کو چاہیے کہ بچے کے تمام سوالوں کا جواب دیں اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو بچے کی روح تحقیق مر جائے گی۔ لیکن بچے کے سوالوں کا جواب دینا کوئی آسان کام نہیں ـــ جواب صحیح، مختصر اور بچے کے لیے قابلِ فہم ہونا چاہیے۔ بچے کا شعور جس قدر ترقی کرتا جائے جواب بھی اسی قدر عمیق ہونا چاہیے۔ یہ کام ہر ماں باپ نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے سے اس کے لیے تیاری کریں۔ زیادہ گہرے اور صبر آزما مطالب بیان نہ کریں کیونکہ یہ نہ فقط بچے کے لیے سودمند نہ ہوں گے بلکہ ناقابلِ فہم اور پریشان کن بھی ہوں گے۔ چھوٹا بچہ مشکل مطالب نہیں سمجھ پاتا لہٰذا اس کی طبیعت، فہم اور صلاحیت کے مطابق اسے دینی تعلیم دی جانا چاہیے۔

امام صادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:

بچہ تین سال کا ہو جائے تو اسے "لا الٰہ الا اللّٰہ" سکھائیں۔ پھر اسے چھوڑ دیں۔ جب اس کی عمر تین سال، سات ماہ اور بیس دن ہو جائے تو اسے "محمد رسول اللّٰہ" یاد کروائیں پھر چار سال تک اسے چھوڑ دیں۔ جب چار سال کا ہو جائے تو اسے پیغمبر خدا پر درود بھیجنا سکھائیں[1]

بچوں کو چھوٹے چھوٹے اور سادہ دینی اشعار یاد کروانا ان کے لیے مفید اور لذت بخش ہوتا ہے۔ اسی طرح انہیں آہستہ آہستہ نبوت اور امامت کے بارے۔ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں بتائیں کہ اللہ نے انہیں نبی بنا کر بھیجا تاکہ ہماری ہدایت کریں۔ پھر ان کی خصوصیات اور کچھ واقعات بتائیں۔ پھر عمومی نبوت کا مفہوم بتائیں اور نبوت کی ضروری شرائط سے انہیں آگاہ کریں اور یوں ہی امامت کے بارے میں بھی سمجھائیں۔

---

[1] مکارم الاخلاق، ج ۱، ص ۲۵۴

چھوٹے چھوٹے واقعات کے ذریعے کہانی کی صورت میں پیار سے یہ باتیں کریں گے تو بہت مؤثر ہوں گی۔

ہاں قیامت کے بارے میں بچہ جلدی متوجہ نہیں ہوتا وہ سوچتا ہے کہ وہ اور اس کے ماں باپ ہمیشہ یوں ہی رہیں گے۔ مرنے کو وہ ایک لمبے سفر کی طرح خیال کرتا ہے۔ جب تک بچہ موت کی طرف متوجہ نہ ہو تو ضروری نہیں ہے بلکہ شاید مناسب بھی نہیں کہ اس سے اس سلسلے میں بات چیت کی جائے۔ البتہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں کہ ماں باپ کو مجبوراً ان کے سامنے موت کی حقیقت کے بارے میں کچھ اظہار کرنا پڑ جاتا ہے۔ ممکن ہے کسی رشتے دار، دوست یا جان پہچان والے شخص کی موت بچے کو سوچنے پر مجبور کر دے۔ مثلاً خدا نخواستہ بچے کے دادا وفات پا جائیں اور وہ پوچھے کہ:

امّی دادا ابو کہاں چلے گئے ہیں؟

ایسے موقع پر بچے کو حقیقت بتا دینی چاہیے۔ جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔ بچے سے یہ کہا جا سکتا ہے تمہارے دادا جان وفات پا گئے ہیں، وہ دوسری دنیا میں چلے گئے ہیں ہر مرنے والا اس دنیا میں چلا جاتا ہے۔ اگر کوئی نیک ہو تو جنت کے خوبصورت باغوں میں خوشی خوشی رہے گا اور اگر کوئی برا ہوا تو جہنم کی آگ میں وہ اپنی سزا بھگتے گا۔ بچے کو موت کا یہ معنی رفتہ رفتہ سمجھایا جائے کہ یہ ایک دنیا سے دوسری دنیا کی طرف انتقال ہے۔ اسے جنت، دوزخ، حساب کتاب اور قیامت کے بارے میں سادا سادا اور مختصر طور پر بتایا جانا چاہیے۔

تربیت عقاید کا یہ سلسلہ پرائمری، مڈل، ہائی اور پھر بالائی سطح تک جاری رہنا چاہیے۔

بچّہ اور فرائضِ دینی

یہ درست ہے کہ لڑکا پندرہ سال کی عمر میں اور لڑکی نو سال کی عمر میں مکلف ہوتے ہیں اور شرعی احکام اُن پر لاگو ہو جاتے ہیں۔ لیکن دینی فرائض کی انجام دہی کو بلوغت تک ٹالا نہیں جا سکتا۔ انسان کو بچپن ہی سے عبادت اور دینی فرائض کی انجام دہی کی عادت ڈالنی چاہیئے تاکہ بالغ ہوں تو انہیں شوق سے بجا لائیں خوش قسمتی سے ایک مذہبی گھرانے میں پرورش پانے والا بچہ تین سال کی عمر ہی سے اپنے ماں باپ کی تقلید میں بعض مذہبی کام بجا لاتا ہے۔ کبھی ان کے بیچ جائے نماز بچھاتا ہے، کبھی اُن کے ساتھ سجدے میں جاتا ہے، اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے چھوٹے چھوٹے مذہبی اشعار مزے مزے سے پڑھتا ہے۔ فرض شناس اور سمجھ دار ماں باپ بچے کی ان فطری حرکات سے استفادہ کرتے ہیں۔ ان پہ مُسکرا کر اور اظہار مسرت کر کے اسے تقویت کرتے ہیں۔ اگر زبردستی یہ چیزیں بچے پر ٹھونسی نہ جائیں تو بہت مفید ہوتی ہیں۔ اس عمر میں ماں باپ کو نہیں چاہیے کہ بچے کو سکھانے اور نماز پڑھانے وغیرہ کے امور میں جلدی کریں یا ان پہ دباؤ ڈالیں۔ پانچ سال کی عمر کے قریب بچہ سورہ فاتحہ وغیرہ یاد کر سکتا ہے آہستہ آہستہ یاد کروانا شروع کریں اور پھر سات سال کی عمر میں اسے حکم دیں کہ وہ باقاعدہ نماز پڑھا کرے۔ اوّل وقت میں خود بھی نماز پڑھا کریں اور بچوں کو بھی اس کی نصیحت کریں۔ نو سال کی عمر میں انہیں حتمی طور پہ نماز پڑھنے کی تلقین کریں۔ انہیں سمجھائیں کہ سفر حضر میں نماز پڑھا کریں۔ عمل نہ کرے تو سختی بھی کریں اور اس سلسلے میں کوئی سستی نہ کریں۔ اگر ماں باپ خود نمازی ہوں تو آہستہ آہستہ بچوں کو بھی اس کا عادی بنا سکتے ہیں اور پھر وہ سن بلوغ تک پہنچ کر خود

بخود شوق و ذوق سے نماز پڑھنے لگیں گے۔ اگر ماں باپ نے یہ عذر سمجھا کہ بچہ ابھی چھوٹا ہے، بالغ نہیں ہوا اور اس پر نماز ابھی فرض نہیں ہوئی لہذا اسے کچھ نہ کہیں تو پھر بالغ ہو کر بچے کے لیے نماز پڑھنا مشکل ہوگا۔ کیوں کہ جس عمل کا انسان بچپن میں عادی نہ ہوا ہو بڑے ہو کر اسے اپنانا مشکل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ اطہارؑ نے چھ یا سات سال کی عمر میں بچے کو نماز پڑھنے کا عادی بنانے کا حکم دیا ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا،

ہم اپنے بچوں کو پانچ سال کی عمر میں نماز پڑھنے پر آمادہ کرتے ہیں اور سات سال کی عمر میں انہیں نماز پڑھنے کا حکم دیتے ہیں [۱]

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

جب آپ کے بچے چھ سال کے ہوجائیں تو انہیں نماز پڑھنے کا حکم دیں اور سات سال کے ہوجائیں تو انہیں اس کے لیے زیادہ تاکید کریں اور اگر ضرورت ہو تو مار پیٹ سے بھی انہیں نماز پڑھوائیں [۲]

امام باقر علیہ السلام یا امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

جب بچہ سات سال کا ہوجائے تو اسے کہیں کہ منہ ہاتھ دھوئے اور نماز پڑھے لیکن جب ۹ سال کا ہوجائے تو اسے صحیح اور مکمل وضو سکھائیں اور سختی سے نماز پڑھنے کا حکم دیں۔ ضرورت پڑے تو اسے مار پیٹ کے ذریعے بھی نماز پڑھنے پر مائل کیا جاسکتا ہے [۳]

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

جب بچہ چھ برس کا ہوجائے تو ضروری ہے کہ وہ نماز پڑھے اور جب وہ روزہ

---

[۱] وسائل، ج ۳، ص ۱۲

[۲] مستدرک، ج ۱، ص ۱۷۱

[۳] وسائل، ج ۳، ص ۱۳

رکھ سکتا ہو تو ضروری ہے کہ روزہ رکھے۔[1]

روزے کے معاملے میں بچے کو آہستہ آہستہ عادت ڈالنا چاہیے۔ جو بچہ سن تمیز کو پہنچ چکا ہو اُسے سحری کے لیے بیدار کریں تاکہ وہ ناشتے کی جگہ سحری کھائے اور اس کا عادی ہو جائے۔ جب بچہ روزہ رکھ سکتا ہو تو ضروری ہے کہ اُسے اس کی ترغیب دی جائے اور اگر وہ روزہ رکھ کر اسے نبھانہ پا رہا ہو تو اسے درمیان میں کچھ کھانے پینے کو دیا جا سکتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کے روزوں کی تعداد بڑھائی جائے البتہ اس کی طاقت کو ملحوظ خاطر رکھا جائے بچہ بالغ ہو جائے تو اسے کہا جائے کہ تم پر فرض ہے کہ روزہ رکھو اور نماز پڑھو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو گنہگار ہو گے۔ بہتر یہ ہے کہ اسے روزے کی فضیلت اور ثواب بھی بتایا جائے تاکہ اس میں برداشت کرنے کی قوت بڑھے۔ رمضان المبارک کے آخری ایام میں بچے کی دیگر ذمہ داریوں میں کمی کی جانا چاہیے تاکہ وہ آرام سے روزہ رکھ سکے۔ آخر رمضان المبارک میں اُسے انعام کے طور پہ بھی کچھ دیں۔ دن میں دھیان رکھیں کہ کہیں چھپ چھپا کر روزہ توڑ نہ لے۔

ماں باپ کے لیے ضروری ہے کہ بلوغ سے پہلے بچے کو احتلام کی علامتوں سے آگاہ کریں۔ غسل اور استنجا کے بارے میں اُسے بتائیں۔

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ اگر ماں باپ کی خواہش ہے کہ ان کے بچے اہل مسجد ہوں اور دینی محافل کی طرف راغب ہوں تو پھر بچپن ہی سے انہیں اس کا عادی بنائیں۔ مسجد اور دینی محفل میں انہیں اپنے ہمراہ لے جایا کریں تاکہ ان میں بھی اس کا شوق پیدا ہو جائے ورنہ بڑے ہو کر وہ رغبت سے ایسی محفلوں میں نہیں جایا کریں گے۔

آخر میں اس بات کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ بچہ بالغ ہونے سے پہلے مکلف نہیں ہوتا اور مذہبی فرائض اس پہ عائد نہیں ہوتے اور انہیں ترک کرنے پہ اُسے گناہ نہیں ہو گا مگر ماں باپ کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ بلوغ سے پہلے بچوں کو آزاد چھوڑ دیں کہ وہ جو چاہیں کرتے پھریں۔ کیونکہ نماز روزہ اس پر واجب نہیں ہو تو اگر وہ کسی کا شیشہ توڑ آئے کسی کے جسمانی عضو کو نقصان

---

[1] رسائل، ج ۳، ص ۱۲

پہنچائے مثلاً کسی کا کان کاٹ دے، آنکھ اندھی کر دے یا ہاتھ توڑ ڈالے تو واجب ہے کہ بالغ ہو کر اس کی شرعی دیت ادا کرے۔

دوسری طرف اگر آزاد چھوڑ دیا جائے کہ جو اس کے جی میں آئے کرے تو پھر بڑا ہو کر بھی وہ گناہ اور غلط کاموں کا عادی ہو گا کیونکہ بالغ ہو کر پھر وہ بچپن کا طرزِ عمل نہیں چھوڑے گا۔ لہٰذا ماں باپ کے لیے ضروری ہے کہ اُسے بچپن ہی سے واجبات اور محرمات کی حدود سے آگاہ کریں۔ حرام کام انجام دینے سے روکیں اور واجب کام کی انجام دہی میں اس کی مدد کریں۔

سیاسی اور سماجی تربیت

آج کے بچے کل کے جوان ہیں۔ ملک انہیں کا مال ہے۔ اور انہیں کو کل ملک کا نظام چلانا ہے۔ ان کی سیاسی آگاہی اور شعور ملک کے مستقبل پر اثر انداز ہو گا۔ یہی ہیں کہ جنہیں ملک کی ثقافتی اور اسلامی دولت کی پاسداری کرنا ہے۔ اور ملک کی عظمت و سربلندی کے لیے انہیں کو کوشش کرنا ہے۔ انہیں کو سامراجی اور استعماری قوتوں کے ظلم و ستم کا مقابلہ کرنا ہے۔ بچوں کو آج ہی اس مقصد کے لیے تیار کرنا چاہیے ان کی تربیت کرنا چاہیے اور یہ بھاری ذمہ داری بھی ماں باپ کے کندھوں پر عائد ہوتی ہے۔

سیاسی و سماجی تربیت کی بنیاد بھی بچپن ہی میں رکھی جانا چاہیے تاکہ وہ زیادہ ثمر بخش ہو۔ جب بچہ سنِ تمیز کو پہنچے تو اُسے اُس کے فہم و شعور کی حد تک سیاسی و سماجی مسائل کو سمجھنا چاہیے۔ اُسے اقتصادی اور سیاسی حالات کو آہستہ آہستہ جاننا چاہیے۔ ملک کے فقر محرومیت اور پسماندگی کی وجوہات تدریجاً اُسے سمجھائی جانا چاہئیں۔ حکمرانوں کی اچھائیاں اور بُرائیاں بچوں سے بیان کی جا سکتی ہیں۔ اور نظام کس طرح سے چلتا ہے انہیں سمجھایا جا سکتا ہے گاؤں، شہر اور ملک کی عمومی حالت اس سے بیان کی جا سکتی ہے۔ بچہ انتخابات میں شرکت نہیں کر سکتا، لیکن ماں باپ انتخابات میں شرکت کی خصوصیات اور شرائط کی اُس کے سامنے وضاحت کر سکتے ہیں۔ اور اسے سمجھا سکتے ہیں کہ کس طرح کے لوگوں کو منتخب کرنا چاہیے۔ مثلاً اس سے کہہ سکتے ہیں ہم نے فلاں شخص کو ووٹ دیا ہے کیونکہ اس میں فلاں خوبی ہے بچہ بھی جلسے جلوسوں میں شرکت کر سکتا ہے۔ وہ بھی نعرہ لگا سکتا ہے۔ تقریریں سن سکتا ہے۔

اشتہارات تقسیم کر سکتا ہے۔ اور دیوار نویسی (وال چاکنگ) کر سکتا ہے۔ اور یہ کام اس کے لیے مؤثر بھی ہوں گے۔ ایران کے اسلامی انقلاب نے بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ بچے اور نوجوان بھی سیاسی امور میں مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ یہی تو تھے کہ جنہوں نے اپنے نعروں، جلسے جلوسوں اور ہڑتالوں سے طاغوت کی (کہ کار خود غرض حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ انہیں نے انقلابیوں کو تقویت بخشی اور ایران کی مسلمان ملت کی مظلومیت اور شاہی حکومت کے ایجنٹوں کے ظلم و خیانت کو دنیا والوں کے کانوں تک پہنچایا۔ سب جانتے ہیں کہ ایران کے عظیم انقلاب کی کامیابی کا اہم حصّہ نوجوانوں ہی کی فعال اور متحرک قوت اور انہیں کی جانثاریوں کا مرہون منت ہے۔

چاہیے کہ بچے سیاسی واقعات کا مطالعہ کر کے، اخبارات و جرائد کو پڑھ کر، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے سیاسی اور سماجی پروگرام سُن اور دیکھ کر ماں باپ اور دوسرے بچوں سے بات چیت کر کے تدریجاً سیاسی رشد پیدا کریں۔ اور اپنے اور اپنے ہم وطنوں کے مستقبل کے بارے میں دلچسپی پیدا کریں۔ انہیں جاننا چاہیے کہ مستقبل میں ان کے وطن کی تقدیر ان کے اور ان کے ہم سن بچوں اور نوجوانوں کے ہاتھ میں ہوگی۔ بچے کو سمجھنا چاہیے کہ دنیا آخرت سے اور دین سیاست سے جدا نہیں ہے۔ اور لوگوں کو چاہیے کہ وہ اپنے سماجی اور دنیاوی امور میں دخیل رہیں تاکہ ملک آباد اور ملت باشعور بنے۔

نوجوانی اور جوانی میں اولاد کو نسبتاً زیادہ آزادی ملنی چاہیے تاکہ وہ خود باقاعدہ سیاسی اور سماجی امور میں شرکت کریں۔

بچّہ اور ریڈیو۔ ٹی۔ وی

ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینما بہت ہی سود مند ایجادات ہیں۔ ان کے ذریعے سے تعلیم و تربیت کی جا سکتی ہے۔ لوگوں کے افکار کو جلا بخشی جا سکتی ہے۔ دینی و اخلاقی اقدار کو رائج کیا جا سکتا ہے زرعی اور صنعتی شعبوں میں راہنمائی کی جا سکتی ہے۔ صحت و صفائی کے امور پر رشد پیدا کیا جا سکتا ہے۔ سیاسی اور سماجی حوالے سے عوام کی سطح معلومات کو بلند کیا جا سکتا ہے۔

انسان عوامی رابطے کے ان وسائل سے سینکڑوں قسم کے فائدے اٹھا سکتا ہے البتہ یہ وسائل جس قدر مفید ہو سکتے ہیں اُسی قدر اِن سے سوٴ استفادہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ وسائل نا اہل لوگوں کے ہاتھوں میں آجائیں تو وہ غلط راستے پر ڈال دیں گے اور ان کے ذریعے سے عوام کو صحت، ثقافت، دین، اخلاق، اقتصاد اور سیاست کے حوالے سے سینکڑوں قسم کے نقصانات پہنچائیں گے۔ ریڈیو اور ٹی۔ وی تقریباً عمومی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور اب ہر گھر میں جا پہنچا ہے۔ بیشتر لوگ اسے ایک تفریح اور مشغولیت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور انہیں دیکھنا اور سننا پسند کرتے ہیں۔ خصوصاً بچے اور نوجوان ان سے بہت دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔

باخبر لوگوں کی رائے کے مطابق ایرانی بچے امریکہ، فرانس، برطانیہ اور جاپان جیسے ترقی یافتہ ملکوں کے بچوں کی نسبت ٹیلی ویژن کے پروگراموں سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایران میں ۳/۲ کے ناظرین میں سے چالیس فیصد بچے ہیں، تیس فیصد نوجوان ہیں جب کہ بچپن

اور نوجوانی کی عمر تعلیم و تربیت کے اعتبار سے حساس ترین دور ہوتا ہے۔ ریڈیو ٹیلی ویژن کے پروگرام اچھے ہوں یا بُرے بلا شک ان کی حساس روح پر بہت اثر کرتے ہیں۔ اور انہیں سطحی اور بے اثر نہیں سمجھنا چاہیے۔ بچے کو آزادی نہیں دی جا سکتی کہ وہ ہر طرح کا پروگرام دیکھے یا سُنے۔ کیونکہ بعض پروگرام بچے کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ کاش ریڈیو اور ٹی وی کے اہل کار یہ جانیں کہ وہ کس حساس منصب پر کام کر رہے ہیں اور کتنی عظیم ذمہ داری ان کے دوش پر ہے۔ افرادِ ملت خصوصاً بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا بڑا حصہ انہیں کے ذمہ ہے۔ ماں باپ بھی اس سلسلے میں لاتعلق نہیں رہ سکتے اور بچوں کو ہر طرح کا پروگرام سننے اور دیکھنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔

ریڈیو، ٹی وی کے پروگراموں کا ایک حصہ ایسی کہانیوں اور فلموں پر مشتمل ہوتا ہے جس میں قتل، ڈاکہ، چوری، جرم، اغوا، لڑائی جھگڑا، تشدد، فریب، دھوکا وغیرہ جیسی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ بچے ایسی کہانیوں اور فلموں کے شوقین ہوتے ہیں اور ان سے بہت لطف اٹھاتے ہیں جب کہ ایسی فلمیں اور کہانیاں بچوں کے لیے کئی جہات سے نقصان دہ ہیں۔ مثلاً

۱۔ بچوں کی حساس اور لطیف روح کو بڑی شدت سے تحریک کرتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کی وجہ سے بچوں کے اندر ایک اضطراب اور خوف و وحشت کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ ہو سکتا ہے وہ رات کو ڈراؤنے خواب دیکھیں اور سوتے میں چیخ ماریں۔ ہو سکتا ہے انہیں سر درد لاحق ہو جائے اور یہاں تک ممکن ہے کہ وہ ایسی فلمیں دیکھتے ہوئے بے ہوش ہو جائیں یا ان پر سکتہ طاری ہو جائے۔

۲۔ ایسی فلموں سے ہو سکتا ہے کہ اخلاق کے حوالے سے نقصان دہ اثرات مرتب ہوں۔ اور بچوں کی پاک طبیعت کو وہ گناہ اور برائیوں کی طرف کھینچ لائیں۔ ہو سکتا ہے کہ بچے ان سے اس قدر متاثر ہوں کہ ان کے ہیرو کی تقلید کریں۔ اور جرم، قتل اور چوری کرنے لگیں۔

یونیسکو نے اس سلسلے میں جو تفصیل جاری کی ہے اس کے مطابق اسپین میں ۱۹۴۴ء سے لے کر ۱۹۵۰ء تک سزا پاتے والے بچوں میں سے ۲۷ فیصد نے جرائم پر مبنی فلموں سے متاثر

ہو کر جرم کیا ہے۔

امریکہ میں وسیع پیمانے پر ہونے والی تحقیقات کے مطابق مجرم بچوں میں سے دس فیصد لڑکے اور پچیس فیصد لڑکیاں جرائم سے بھرپور فلمیں دیکھ کر مجرم بنتی ہیں۔ یہ اعداد و شمار واقعاً ہلا کر رکھ دینے والے ہیں[1]

بلامر و پانرز کے نظریے کے مطابق ۴۹٪ مجرم فلموں سے متاثر ہو کر اپنے ساتھ اسلحہ رکھتے ہیں۔ ۲۸٪ چوری کرنے اور ۲۱٪ فیصد قانون کی گرفت سے بھاگنے اور پولیس کو چکمہ دینے کے طریقے انہی فلموں سے سیکھتے ہیں۔ تحقیق سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ ۲۵٪ عورتیں بُری فلموں کے زیر اثر بُرائی اور بدکاری کی راہ پر چل پڑی ہیں نیز ۴۵٪ عورتیں لاپرواہ فلمی ستاروں کی تقلید میں قحبہ خانوں اور بُرائی کی محفلوں کی زینت بنی ہیں[2]

یونیورسٹی لاس اینجلز کے ایک پروفیسر واکس مین کہتے ہیں:

اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹی وی کی سکرین سے نکلنے والی الیکٹرک مقناطیسی لہریں (WAVES-MAGANATIC) انسانی آرگنزم (MAGNETIC) پر بہت اثر کرتی ہیں۔ ٹیلی ویژن یا ریڈار یا گھریلو ضرورت کی بجلی کی چیزوں سے نکلنے والی لہریں شارٹ ویوز کی قسم میں سے ہیں۔ اور اس کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کے سر میں درد ہوتا ہے اور سر چکرانے لگتا ہے۔ اس سے انسان کی فکری صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ خون کا دباؤ تبدیل ہو جاتا ہے۔ طبیعت میں ہیجان پیدا ہوتا ہے اور خون کے سفید خلیوں کو نقصان پہنچتا ہے علاوہ ازیں یہ لہریں انسان کے نظام اعصاب پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہیں اور مختلف بیماریوں کا سبب بن جاتی ہیں[3]

---

[1] مجلہ، مکتب اسلام جلد ۱۵ شمارہ ۱۱

[2] مجلہ، مکتب اسلام، جلد ۱۵، شمارہ ۱۱

[3] مجلہ، مکتب اسلام، جلد ۱۸، شمارہ ۱

ڈاکٹر الکسز کارل لکھتے ہیں:

ریڈیو۔ ٹی وی اور نامناسب کھیل ہمارے بچوں کے جذبات کو تباہ کر دیتے ہیں[1]

روزنامہ اطلاعات اپنے شمارہ ۷۵۴۳ میں ایک یورپی طالب علم کے بارے میں لکھتا ہے:

کالج کے ایک اٹھارہ سالہ طالب علم کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس پر الزام ہے کہ اُس نے ایک فلمی اداکار والٹر کا نار کے بیٹے کو اغوا کیا اور پھر دھمکی دی کہ اُسے ایک لاکھ پچاس ہزار ڈالر پہنچا دیئے جائیں ورنہ وہ اسے قتل کر دے گا۔ ملزم نے عدالت کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا کہ قتل کی دھمکی دے کر غنڈہ ٹیکس وصول کرنے کا خیال اس کے ذہن میں ٹیلی ویژن کی ایک فلم دیکھتے ہوئے پیدا ہوا۔

اس سلسلے میں پولیس کا کہنا یہ ہے کہ ایسے بہت سے کیس ہمارے پاس پہنچے ہیں کہ نوجوانوں نے ٹیلی ویژن سے جرم کا ارتکاب کرنا سیکھا ہے مشہد میں ایک دس سالہ بچے نے کراٹے کی ایک فلم دیکھنے کے بعد اپنے آٹھ سالہ دوست کو لک مار کر مار ڈالا[2]

تعلیم و تربیت کے نائب وزیر جناب صفی نیا کہتے ہیں:

جب ٹی وی بُرائی کا درس دے رہا ہو تو بہترین استاد بھی کچھ نہیں کر سکتا[3]

کیوبا کے ایک پندرہ سالہ لڑکے رونی نامور لسنے ایک ۸۴ سالہ بوڑھی عورت کو قتل

---

[1] مکتب اسلام، جلد ۱۵، شمارہ ۳

[2] مکتب اسلام: جلد ۱۵، شمارہ ۱۱

[3] مکتب اسلام: جلد ۱۸، شمارہ ۱

کر دیا اس نے یہ جرم فلوریڈا میں انجام دیا۔ اور اب وہ اس شہر کی ایک جیل میں اس جرم کی سزا کے طور پر عمر قید کاٹ رہا ہے۔ اس کے والدین نے امریکی ٹیلی ویژن کے تین چینلوں کے خلاف دو کروڑ پچاس لاکھ ڈالر ہرجانے کا دعویٰ دائر کیا ہے۔ انہوں نے عدالت میں اپنے دعویٰ کے ثبوت میں جو شواہد پیش کیے ہیں ان کے مطابق بچے نے آدم کشی کا سبق امریکی ٹیلی ویژن کے پروگراموں سے سیکھا ہے۔ گذشتہ ستمبر عدالت میں اس کیس کی سماعت ہوئی اس موقع پہ یہ بات سامنے آئی کہ ملزم جب بچہ تھا تو آیا اُسے چپ کرانے کے لیے ٹی۔ وی کے سامنے بٹھا دیتی۔ اس سے اُس میں ٹیلی ویژن دیکھنے کا بہت شوق پیدا ہو گیا وہ روزانہ آٹھ آٹھ گھنٹے ٹیلی ویژن پر وگرام دیکھتا رہتا۔ اُسے ٹی۔ وی کے پروگراموں سے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی خاص طور پر "پلیس کو جاک" نامی سیریز سے وہ بہت متاثر تھا ارتکاب جُرم سے ایک رات پہلے اس فلم میں دکھایا گیا کہ کس طرح سے ایک امیر عورت کو لوٹا گیا۔

ایک لڑکی جس کا نام رضائیہ تھا۔ پندرہ سال اُس کی عمر تھی بہت خوبصورت لڑکی تھی ٹیلی ویژن پر ایک پُر ہیجان فلم دیکھتے ہوئے اس پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ زمین پر گری اور مر گئی۔ جب اس نے فلم میں دیکھا کہ ایک سفید فام شخص ایک سیاہ فام کے سر کی چمڑی ادھیڑنے لگا ہے تو اس نے ایک چیخ ماری۔ پھر اس کے دل کی دھڑکن بند ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اس کے دماغ کی رگ پھٹ گئی۔

اعصاب اور نفسیات کے ماہر ڈاکٹر جلال بریانی کہتے ہیں:

خوفناک، ڈراؤنی اور ہیجان انگیز فلمیں بچوں کی نفسیات پر نامطلوب اثر ڈالتی ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ایک بچہ مار دھاڑ سے بھرپور فلم دیکھنے کے بعد فلم کے ہیرو کی تقلید میں اپنے چھوٹے بھائی یا بہن کو قتل کر دیتا ہے۔ ایسی فلمیں بچے کی آئندہ شخصیت پر بُرے اثرات مرتب کرتی ہیں خوفناک فلموں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بڑے ہو کر ان کے اندر بزدلی پیدا ہو جاتی ہے، مار دھاڑ کی فلمیں آئندہ کی زندگی میں انہیں بھی ایسا ہی بنا دیتی ہیں۔ ان کے اثرات انسان کی روح پر رہتے ہیں اور پھر جہاں موقع ملتا ہے کسی غلط واقعہ کی صورت میں

نمودار ہوتے ہیں اور انسان کو بُرائی کی طرف کھینچتے ہیں۔

نفسیات کے ڈاکٹر شکر اللہ طریقتی کہتے ہیں:

بُری فلموں کا اثر بچے کے مستقبل پر ناقابلِ انکار ہے۔ یہ فلمیں بچوں کی نفسیات پہ ایسا نامطلوب اثر ڈالتی ہیں کہ بالغ ہو کر جب مناسب موقع ملتا ہے اور دوسرے اسباب بھی فراہم ہو جاتے ہیں تو وہ خطرناک کاموں کی انجام دہی کی صورت میں اس کی مدد کرتا ہے۔ لہٰذا میں ماں باپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اپنے بچوں کو ہرگز اجازت نہ دیں کہ وہ غلط فلمیں دیکھیں۔ خاص طور پہ وہ فلمیں جو بڑوں کے لیے مخصوص ہیں خصوصاً رات کے دس بجے کے بعد آنے والی فلموں کی اجازت نہ دیں۔ اگر بچے ایسی فلمیں دیکھنے کے لیے ضد کریں اور والدین انہیں اس کی اجازت نہ دیں تو اولاد کے حق میں یہی ان کی محبت ہے۔

تہران یونیورسٹی کے ایک استاد اور جرم شناس ڈاکٹر رضا مظلومی کہتے ہیں:

ٹیلی ویژن اور سینما گھروں میں دکھائی جانے والی بہت سی فلمیں ہمارے معاشرے کے لیے خطرناک ہیں۔ ان کے خطرات اس حد تک بڑھ چکے ہیں کہ گیارہ سالہ بچی کو انہوں نے زندگی سے محروم کر دیا اور اس کے دل کی دھڑکن کو بند۔ میں جرأت مندی کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ عصرِ حاضر میں دنیا میں ہونے والے بہت سے جرائم اور مظالم انہیں فلموں کے بُرے اثرات کی وجہ ہیں[1]

نیویارک کے ایک ہسپتال میں کام کرنے والے ڈاکٹر آرنالڈ فریانی نے جدید ترین الیکٹرانک آلات اور تجربات سے یہ ثابت کیا ہے کہ روحانی اور فکری کمزوری اور شدید سر درد ریڈیو پہ نشر ہونے والی موسیقی کے سننے سے پیدا ہوتے ہیں[2]

اخبار ٹائمز اپنے ۱۹۶۴ کے شمارہ میں لکھتا ہے:

---

[1] روزنامہ اطلاعات۔ ۱۰ آبان ۱۳۵۲ھ

[2] مکتب اسلام: جلد ۱۵، شمارہ ۲

بچوں کی بیماریوں کے ماہر ڈاکٹر نے فضائیہ کی دو چھاؤنیوں میں اس بات کو محسوس کیا کہ اس علاقے میں کام کرنے والے افسران کے بچے کہ جن کی عمر ۳ سال سے بارہ سال کے درمیان ہے ہمیشہ درد سر، بے خوابی، معدہ کی گڑبڑ، قے، پیچش اور دیگر بیماریوں میں گھرے رہتے ہیں۔ طبی نقطہ نظر سے اس بیماری کی کوئی وجہ معلوم نہ ہوئی۔ لیکن مکمل طور پر تحقیق کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ تمام بچے ٹیلی ویژن کے طویل پروگرام دیکھنے کے عادی ہیں اور ہر روز ۳ گھنٹے سے ۶ گھنٹے تک ٹی۔ وی پروگرام دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے ان کے لیے صرف یہی علاج متعین کیا کہ اُن کو ٹی۔ وی پروگرام دیکھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ یہ علاج کیا اور مؤثر بھی رہا۔ سر درد، قے، پیچش اور باقی تمام بیماریاں ختم ہوگئیں۔[1]

لہذا جن والدین کو اپنے بچوں سے محبت ہے وہ انہیں دن رات ریڈیو اور ٹیلی ویژن سننے اور دیکھنے کی اجازت نہ دیں۔ صرف ان پروگراموں کو دیکھنے کی اجازت دیں جن سے بچوں کو کوئی نفسیاتی، روحانی اور اخلاقی نقصان نہ پہنچے۔

---

[1] پیوند ہای کودک وخانوادہ ص ۱۳۱

جنسی مسائل

جنسی قوت انسان کی انتہائی قوی اور حساس جبلتوں میں سے ہے۔ یہ قوت انسان کے لیے بہت تعمیری ہے۔ انسان کی نفسیاتی اور جسمانی زندگی کے لیے اس کے اچھے یا برے اثرات مرتب ہوتے ہیں انسان کے بہت سے اعمال، یہاں تک کہ متعدد جسمانی اور نفسیاتی بیماریوں کی بنیاد یہی جبلت ہوتی ہے اگر انسان کی پرورش عاقلانہ اور درست ہو تو یہ قوت انسان کی خوشی اور آرام کا ذریعہ بنتی ہے۔ اور اگر تربیت میں افراط یا تفریط ہو تو ممکن ہے سینکڑوں جسمانی اور نفسیاتی نقصانات کا سبب بنے۔ اور انسان کی دنیا و آخرت کو تباہ کردے۔

ایسا نہیں ہے کہ جنسی قوت بلوغت کے زمانے میں پیدا ہوتی ہو۔ بلکہ یہ بچپن ہی سے انسانی طبیعت میں خوابیدہ ہوتی ہے۔ اور مختلف شکلوں میں اس کا ظہور ہوتا ہے۔ چھوٹے بچے اپنے آلہ تناسل کو چھو کر لذت محسوس کرتے ہیں اور اس سے ان کے اندر ایک تحرک کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ والدین کے اظہار محبت اور بوسوں سے لذت محسوس کرتے ہیں۔ وہ خوبصورتی اور بدصورتی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور کبھی زبان سے اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ دو تین سال کی عمر میں وہ لڑکے اور لڑکی میں فرق سمجھنے لگتے ہیں اور بڑی توجہ اور جستجو سے ایک دوسرے کی شرم گاہ کو دیکھتے ہیں۔ جب کچھ بڑے ہو جائیں تو وہاں تصویریں انہیں اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ وہ حیران ہو ہو کر ان کی طرف دیکھتے ہیں۔ زبان سے فحش اور گندے مذاق کرتے ہیں اور ان پر خوش ہوتے ہیں جنس مخالف کی طرف انہیں کچھ کچھ میلان پیدا ہو جاتا ہے۔ اور انہیں اپنی طرف

متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ تصریحاً یا اشارۃً جنسی امور کے بارے میں والدین سے سوال کرتے ہیں۔ ماں باپ کی سرگوشیوں کی طرف وہ کان دھرتے ہیں اور ان کے کاموں پر نظر رکھتے ہیں۔ اپنے دوستوں اور ہم عمروں سے گوشہ وکنار میں بیٹھ کر راز و نیاز کرتے ہیں۔ ان سب چیزوں سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جنسی قوت نابالغ بچوں میں بھی موجود ہوتی ہے لیکن مبہم اور تاریک صورت میں۔ بغیر آگاہی اور کامل شعور کے ان کی توجہ اس کی طرف کھنچتی ہے لیکن انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا چاہتے ہیں اس امر کی طرف ان کی توجہ ہوتی ہے کہ لذت کہاں سے حاصل ہوتی ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ یہ لذت کیسے حاصل کریں؛ دس بارہ سال کی عمر تک بچے اسی حالت میں رہتے ہیں اور ان کی جنسی جبلّت پوری طرح سے بیدار نہیں ہوتی اور ایک ابہام کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ لیکن بارہ سے پندرہ سال کی عمر میں وہ بڑی تیزی سے پروان چڑھتی ہے اور تقریباً بیدار ہو جاتی ہے۔

فرض شناس ماں باپ اپنے بچوں کی جنسی جبلّت سے لاتعلق نہیں رہ سکتے اور یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اس بارے میں کوئی حکمت عملی وضع نہ کریں۔ کیونکہ جنسی اعتبار سے تربیت دشوار ترین اور حساس ترین تربیتوں میں سے ہے۔ اس سلسلے میں ذرہ بھر اشتباہ یا غفلت بھی ممکن ہے بچوں کو برائی اور تباہی کی وادی کی طرف کھینچ لے جائے۔

ماں باپ کی توجہ اس امر کی طرف ہونی چاہیے کہ بلوغ سے پہلے بدنی اور فکری رشد کے اعتبار سے بچے تولید نسل اور جنسی قوت کو عمل میں لانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے بلوغ سے پہلے ان کی جنسی جبلّت کو ان کی طبیعت میں خفتہ و خوابیدہ رکھا ہوتا ہے۔ بچوں کی انفرادی اور اجتماعی بھلائی بھی اسی میں ہے کہ بلوغ سے پہلے ان کی جنسی قوت بیدار اور متحرک نہ ہو کیونکہ اگر جنسی قوت بلوغت سے پہلے اور جلد ہی بیدار ہو جائے تو اس سے بچے کی زندگی بہت سی مشکلات کا شکار ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے وہ اس کی بدبختی اور انحراف کے اسباب فراہم کرے۔

لہذا ماں باپ کو ہر اس عمل سے سخت پرہیز کرنا چاہیے کہ جس سے بچوں کی جنسی جبلّت کو تحریک ہو سکے اور وہ بیدار ہو سکے۔ اور ان کے لیے ایسے حالات فراہم کریں کہ ان کی

نشوو نما تدریجی طور پر اور فطری لحاظ سے ہو۔ والدین اگر عقل مند اور باتدبیر ہوں تو وہ خود اس ضمن میں تمیز کر سکتے ہیں کہ کون سے کام مفید ہیں اور کون سے مضر۔ لیکن ہم یاد دہانی کے طور پر کچھ باتیں بیان کرتے ہیں بچوں کی شرمگاہ پر ہاتھ پھیرنا، وہاں پیار کرنا۔ اخبار و جرائد کی خوبصورت اور ننگی تصویروں کو دیکھنا، عشقیہ اور محرک انگیز گانوں اور کہانیوں کو سننا، دوسروں کی شرم گاہ کی طرف دیکھنا یا اس پہ ہاتھ پھیرنا، دوسروں کے حسن اور خوبصورتی کی تعریف کرنا۔ اور دوسروں کے ہر حصہ بدن اور ننگی ٹانگوں کی طرف دیکھنا۔ ماں باپ کی آپس میں یا دوسروں سے معاشقہ بازی اور جنسی مذاق، شہوت انگیز مناظر کو دیکھنا یا ان کے بارے میں سننا اور اس طرح کے دیگر امور کو سرانجام دینا بچے کی جنسی قوت کو تحرک کرنے اور بیدار کرنے کا سبب بنتا ہے اور بچہ بھی ایسی لذت کے حصول کے بارے میں سوچنے لگتا ہے۔

پانچ چھ سال سے اوپر کی عمر کے بچوں کو تنہا نہ رہنے دیں۔ ہو سکتا ہے وہ ایک دوسرے کی شرمگاہ سے کھیلیں اور اس سے ان میں تحریک پیدا ہو۔ بچوں کو اجازت نہ دیں کہ وہ بستر پہ ایسے ہی پڑے رہیں اور جاگتے رہیں پانچ چھ سال کے بچوں کے بستر جدا کر دیں اور انہیں ایک بستر پر نہ لٹائیں کیوں کہ ممکن ہے ایک دوسرے سے مس ہونے سے ان میں تحریک پیدا ہو۔ پانچ چھ سال کے بچوں کو خود اپنے بستر پر نہ لٹائیں خاص طور پہ مخالف جنس کے بچوں کو۔ یہاں تک کہ ماں کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنا بدن اپنی چھ سالہ بیٹی کے بدن کے ساتھ ملے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

جب بچے سات سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان کے بستر جدا کر دیں[1]

امام صادقؑ اپنے بزرگوں سے نقل فرماتے ہیں:

عورتوں اور دس سالہ بچوں کے بستر جدا ہونے چاہئیں[2]

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

---

[1] مکارم الاخلاق، ج ۱، ص ۲۵۶

[2] وسائل، ج ۱۴، ص ۲۶۸

جو ماں اپنی چھ سالہ بیٹی سے اپنا بدن ملتی ہے ایک طرح کے زنا کا ارتکاب کرتی ہے [۱]

امام صادق علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:

مرد اپنی چھ سالہ بیٹی کو نہ چومے اور عورت اپنے سات سالہ بیٹے کو نہ چومے [۲]

بہت سے گھرانوں میں معمول ہے کہ عورتیں عریاں یا نیم عریاں بدن کے ساتھ گھروں میں چلتی پھرتی ہیں، بعض مرد بھی اس سلسلے میں عورتوں سے پیچھے نہیں رہتے۔ وہ اپنے گھروں میں نیم عریاں بدن یا ننگی پنڈلیاں اپنے چھوٹے بڑے بیٹے بیٹیوں کو دکھاتے رہتے ہیں۔ ان گھروں کی بیٹیاں اور بیٹے بھی اپنے ماں باپ کی پیروی کرتے ہیں اور گھر میں نیم عریاں بدن کے ساتھ رہتے ہیں۔ اپنے تئیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک خاندان کے افراد ہیں۔ اپنے ہیں محرم ہیں۔ محرموں کے درمیان کوئی پابندی اور حجاب نہیں ہے۔

یا ماں باپ سمجھتے ہیں کہ ان کے نیم عریاں بدن اور ان کی ننگی ٹانگیں ان کے بچوں پر کوئی اثر نہیں ڈالتے کیوں کہ اولاً تو وہ محرم ہیں اور ثانیاً بچے بھی ابھی کچھ نہیں سمجھتے۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کی بیٹی کا کھلا سینہ اور ننگی ٹانگیں ان کے بیٹے پر کوئی اثر نہیں ڈالتی اور اس سے اُن کی جنسی جبلت کو کوئی تحریک نہیں ہوتی کیوں کہ وہ آپس میں بھائی بہن ہیں۔ جب کہ یہ بات درست نہیں۔ البتہ ہو سکتا ہے کہ بہت سے بچے ان واقعات کی طرف توجہ دیں۔ لیکن یہ بات اتنی اطمینان بخش نہیں ہے۔ جنسی جبلت ایک بہت طاقتور قوت ہے اور محرم و نامحرم ہونا، بھائی اور بہن ہونا، ماں اور باپ ہونا اس کے سر میں نہیں سماتا۔ ہو سکتا ہے ایک نظر دیکھنے سے ان میں تحریک پیدا ہو جائے اور جنسی لذت کے حصول کی فکر ان میں بیدار ہو جائے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

---

[۱] وسائل، ج ۱۴، ص ۱۷۰

[۲] وسائل، ج ۱۴، ص ۱۷۰

بہت ممکن ہے کہ ایک ہی نظر سے عشق اور جنسی خواہشات بیدار ہو جائیں۔[1]

ایسی زود رس تحریکات ممکن ہے سادہ روح، ناتجربہ کار اور ناداں بچے کے لیے بہت برے نتائج کی حامل ہوں۔ ہو سکتا ہے ناتجربہ کار بچہ یا نوجوان ان کے باعث زنا یا لواطہ کی طرف کھنچ جائے۔ ہو سکتا ہے اس کے نتیجے میں استمناء کی ہولناک بیماری میں مبتلا ہو جائے۔ اس سلسلے میں ایسے بچوں کے ماں باپ ذمہ دار ہیں کہ جن کی بے احتیاطیوں اور غیر عاقلانہ طرز عمل کی وجہ سے ان کے بچوں کی اس قوت کو تحریک ملی۔

اس مقام پر برا نہیں ہے کہ ایک دانشور کی اس تحریر کی طرف توجہ فرمائیں:

اپنے بچوں کی نفسیاتی سلامتی کے لیے چاہیے کہ ہم اپنا جسم ان کے سامنے عریاں نہ کریں۔ اور حتی المقدور اس سے اجتناب کریں۔ بعض اوقات ممکن ہے ہمارے بچے چوری چھپے جب ہم نہا رہے ہوں یا کپڑے تبدیل کر رہے ہوں ہماری طرف دیکھیں۔ ہمیں نہیں چاہیے کہ اس کام پر ان کی تشویق کریں۔[2]

یہ صحیح ہے کہ ماں باپ اپنی اولاد کے لیے محرم ہیں اور گھر میں جیسے بھی چاہے رہیں لیکن اپنے اور اپنے بچوں کے اجتماعی فوائد کو اپنی بے جا ہوس اور آزادی کی نذر نہیں کر دینا چاہیے۔ اور اپنی اور اپنی اولاد کی زندگی کو تباہی کے خطرے سے دوچار نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس کے نتیجے میں زندگی حسرت و ندامت کی نذر ہو جائے گی۔

ایک شخص کی ران ننگی تھی۔ رسول اکرمؐ کی نظر پڑی تو فرمایا:

اپنی ران کو ڈھانپ لو کیونکہ یہ بھی چھپانے کی چیز ہے۔[3]

مناسب نہیں ہے کہ چار سال سے زیادہ عمر کا بیٹا ماں کے ساتھ مل کے نہائے۔ اسی طرح چار سالہ بیٹی کو بھی باپ کے ساتھ نہیں نہانا چاہیے۔ بچوں اور بالخصوص نوجوانوں کو

---

[1] غرر الحکم، ص ۱۶ ۱۴
[2] پیوندہای کودک وخانوادہ، ص ۱۷۷
[3]۔ مستدرک حاکم، ج ۴، ص ۱۸۱

تنہا اور بیکار نہ رہنے دیں کہ کہیں وہ حصول لذت اور استمنا کی فکر میں نہ پڑ جائیں۔ ننھے بچے کی شرم گاہ کو حتی المقدور اس کے بہن بھائیوں سے پوشیدہ رکھیں۔ کبھی بھی بچوں کو فحش گالی نہ دیں۔ میاں بیوی کو نہیں چاہیے کہ بچوں کی موجودگی میں ایک بستر پر سوئیں اور ان کی موجودگی میں ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کریں۔

ایک خاندان کی مشکلات میں سے میاں بیوی کے جنسی روابط کا مسئلہ بھی ہے میاں بیوی کا حق ہے کہ وہ اکٹھے سوئیں اور اس کے سوا چارہ بھی نہیں ہے۔ اور اگر گھر میں چند ایک چھوٹے بڑے بچے ہوں تو ماں باپ کے لیے آپس میں ملاپ کی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ بہر حال اس سلسلے میں ان کی ذمہ داری ہے کہ یہ عمل ایسے طریقے سے انجام دیں کہ ان کے بچے بالکل اس طرف متوجہ نہ ہوں، ورنہ ممکن ہے کہ ان کے جذبات بھڑک اٹھیں اور وہ برائی، تباہی اور گناہ کی طرف کھنچے جائیں۔

حضرت امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

مرد کو نہیں چاہیے کہ جب بچہ کمرے میں موجود ہو تو وہ اپنی بیوی کے قریب ہو، کیونکہ یہ عمل زنا کا باعث بنے گا۔[1]

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

واللہ! اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے مباشرت کرے جب کہ بچہ کمرے میں جاگ رہا ہو۔ وہ انہیں دیکھے اور ان کی آواز اور سانسوں کی صدا سنے تو وہ بچہ کبھی فلاح نہیں پائے گا۔ لڑکا ہو یا لڑکی آلودہ زنا ہو جائے گا۔

جب کبھی امام سجاد علیہ السلام اپنی زوجہ کے قریب ہونا چاہتے تو خدمت گزاروں کو باہر بھیج دیتے دروازے بند کر لیتے اور پردے گرا لیتے[2]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع کیا ہے کہ مرد اپنی بیوی کے نزدیک ہو جبکہ

---

[1] وسائل، ج ۱۴، ص ۹۴

[2] وسائل، ج ۱۴، ص ۹۴

ننھا بچہ گہوارے میں ان کی طرف دیکھ رہا ہو۔[1]

لہٰذا جن میاں بیوی کا بچہ ہو انہیں پہلے کی سی آزاد روش اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ اپنے بچوں کی عفت کی حفاظت کی خاطر ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ جنسی تعلق بالکل مخفی طریقے سے کریں اور اس طرح سے چھپ کر کہ بچے کو بالکل بو نہ آئے جب کہ ایسا کرنا کوئی آسان نہیں ہے۔ یہ نہ کہیئے گا کہ بچے تو نادان ہیں انہیں کسی چیز کا کیا پتہ۔ جب کہ بچے بڑے تیز اور شیطان ہوتے ہیں۔ ماں باپ کے کاموں پر بڑی نظر رکھتے ہیں۔ انہیں بڑی خواہش ہوتی ہے کہ ماں باپ کی پوشیدہ باتیں معلوم کریں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اپنے تئیں سوتا ظاہر کرتے ہیں تاکہ ماں باپ کے مخفی کاموں کا انہیں پتہ چلے۔ دروازے اور دیوار کی اوٹ سے کبھی بڑی توجہ سے کان لگا کے ماں باپ کی باتیں سننے کی کوشش کرتے ہیں لہٰذا ایک خاندان کی مشکلات میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ جس کا حل کوئی آسان بھی نہیں۔ ممکن ہو تو اچھا ہے کہ میاں بیوی کی خلوت کا کمرہ بچوں کے سونے کے کمرے کے نزدیک نہ ہو اور بچوں کو وہ ایسی عادت ڈالیں کہ جب وہ سو رہے ہوں یا آرام کر رہے ہوں تو ان کے خاص کمرے میں اجازت کے بغیر داخل نہ ہوں اور جنسی عمل ان اوقات میں انجام دیں جب بچے پوری طرح سو رہے ہوں لیکن ایسا کمرہ ہر کسی کو میسر نہیں آ سکتا۔

ایک مغربی دانشور لکھتے ہیں:

دور حاضر کی عمارتوں میں بیشتر گھر ایسے بنے ہوتے ہیں کہ بناتے وقت جنسی مسائل کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہوتا۔ درحقیقت آج کل کے گھروں کو جنسی تقاضوں کے مخالف گھر قرار دینا چاہیے۔ بہت کم ایسے گھر یا فلیٹ ملتے ہیں کہ جن میں والدین کے لیے جدا کمرے کی ضرورت کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔ اکثر ایسے کمروں کی دیواریں باریک ہوتی ہیں اور بچے ان کے گرد اگرد ہوتے ہیں۔ یہ ایک تلخ اور ناگوار حقیقت ہے کہ ان نکات کو ملحوظ خاطر نہ رکھنے کی وجہ سے

---

[1] مستدرک، ج ۲، ص ۵۴۶

جن والدین کے لیے الگ گوشہ آرام نہ ہو ان والدین کی طبعی خواہشات گھٹی رہتی ہیں ۔[1]

البتہ مخصوص کمرے کا ایک نقصان یہ ہے کہ والدین سوتے ہوئے اپنی اولاد سے بے خبر ہو جاتے ہیں ۔ انہیں بھی اکیلا چھوڑ دیتے ہیں خصوصاً جب ان میں کوئی بڑا بچہ ہو ۔ اور بیٹا اور بیٹی ہوں تو یہ کام بے احتیاطی سے خالی نہیں ہے ۔ اگرچہ کم خطرہ ہے بہر حال احتیاط ضروری ہے ۔ خود ماں باپ جیسے بھی ہو مشکل کو حل کریں ۔ البتہ اس صورت میں جب ماں باپ مجبور ہوں کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ ایک کمرے میں سوئیں تو وہ مجبور ہیں کہ وہ آپس میں تعلق کو مخفی رکھیں اور اس سلسلے میں زیادہ توجہ اور احتیاط سے کام لیں ۔ اولاً ماں باپ کو ایک بستر پر نہیں سونا چاہیے بلکہ ان کا بستر جدا جدا ہونا چاہیے ۔ ممکن ہو تو وہ آپس میں اسی وقت ملیں جب بچے گھر پر نہ ہوں ۔ ایسا نہ ہو تو نصف شب جب یقین ہو کہ بچے بالکل سو رہے ہیں تو چپکے سے کمرے سے نکل جائیں اور کسی خلوت کی جگہ پر چلے جائیں اور پھر سونے کے کمرے میں لوٹ آئیں ۔ بہر حال اگر ماں باپ مسئلے کی اہمیت جانتے ہوں اور اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوں تو ہر مسئلے کو حل کر ہی لیں گے ۔ یہ مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ

خداوند کریم قرآن حکیم میں ارشاد فرماتا ہے ،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيَسْتَأْذِنكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ مِّن قَبْلِ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُم مِّنَ الظَّهِيرَةِ وَمِن بَعْدِ صَلَاةِ الْعِشَاءِ ثَلَاثُ

---

[1] پیوندہای کودک د خانوادہ ، ص ۱۷۸

عَورَتِ ثَلٰثُ مرّہ

اے ایمان والو! تمہارے خادموں اور نابالغ بچوں کو تین اوقات میں اجازت لے کر تمہارے پاس آنا چاہیے۔ ایک تو نماز صبح سے پہلے دوسرے دوپہر کو جب (سوتے وقت) کپڑے بدلتے ہیں اور تیسرے نماز عشاء کے بعد، یہ تین وقت تمہارے پردوں کے وقت ہیں۔

(سورہ نور۔ آیۃ ۵۸)

بالغ ہونے سے پہلے بچے عموماً ماں باپ سے بلا واسطہ یا بالواسطہ جنسی مسائل کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ بعض ماں باپ پردہ پوشی کے لیے سوال کو ٹال دیتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں: چُپ رہو، فضول باتیں نہ کرو، یہ بات تم سے متعلق نہیں ہے، بڑے ہو کر سمجھ جاؤ گے۔

یوں وہ بچوں کو چپ کروا دیتے ہیں۔ لیکن بعض ماں باپ بچوں کے سوالوں کا جواب تو دیتے ہیں لیکن غلط اور خلافِ حقیقت۔ بچے بھی سمجھ جاتے ہیں کہ ہمارے ماں باپ ہمیں دھوکا دے رہے ہیں۔

یہ دونوں طرزِ عمل درست نہیں ہیں کیوں کہ بچہ سمجھنے کے لیے سوال کر رہا ہے اگر آپ نے اس کی صحیح راہنمائی نہ کی تو ممکن ہے دوسرا اسے بھٹکا دیں۔ خوش قسمتی سے بلوغ سے پہلے جنسی امور سے متعلق بچوں کے سوال کوئی ایسے پیچیدہ اور ناقابلِ جواب بھی نہیں ہوتے بلکہ ان کے سادہ سے سوالوں کا آسانی سے جواب دیا جا سکتا ہے۔ سب سے بڑی بات جو بچے کو ایک عرصے تک سوچ میں ڈالے رکھتی ہے وہ بچے اور بچی کی شرمگاہ میں فرق ہے ایک چھوٹا بچہ خوب سمجھتا ہے کہ اُس کی اور لڑکی کی شرمگاہ میں فرق ہے لیکن اُسے اِس کی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ وہ کبھی اپنے آپ کو ناقص سمجھتا ہے اور کبھی لڑکی کو۔ اُس کا دل چاہتا ہے کہ اس فرق کو سمجھے، اسی لیے وہ ماں باپ سے اس کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

ماں باپ کا فرض ہے کہ اس سلسلے میں اس سے صراحت سے کہیں کہ تمام لڑکے اسی طرح سے پیدا ہوتے ہیں اور تمام لڑکیاں بھی اسی طرح سے پیدا ہوتی ہیں پھر بعد میں لڑکے باپ بن جائیں گے اور لڑکیاں ماں بن جائیں گی اور پھر ان کی اولاد ہوگی اور یوں انسان دنیا میں آتے

رہیں گے اور یوں یہ دنیا آباد رہے گی۔

آپ یہ نہ سوچیں کہ آپ کا بچہ تمام حقائق جاننا چاہتا ہے۔ وہ جتنا پوچھتا ہے اتنا ہی جاننا چاہتا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ بلوغ سے پہلے بچے کو اس کی فکری سطح کے مطابق تدریجاً جنسی مسائل سے آگاہ کریں۔ اگر آپ نے اسے کچھ نہ بتایا تو اسکول یا گلی محلے کے بچوں سے اسے معلوم ہو جائے گا۔ یوں یہ راز کی باتیں اس کے لیے راز نہیں رہیں گی۔ ماں باپ سے یہ باتیں سننا گلی محلے کے گندے بچوں سے سننے کی نسبت بہتر ہے۔ اگر آپ نے اس کی صحیح راہنمائی کی تو وہ گندے بچوں کی گمراہی سے بچ سکتا ہے۔

جب آپ کا بچہ بالغ ہو جائے اور آپ کو یہ احساس ہو کہ اس کی جنسی قوت کسی حد تک بیدار ہو چکی ہے اور اس میں مسلسل تبدیلی پیدا ہو رہی ہے تو آپ کسی مناسب موقع پر اسے کہہ سکتے ہیں:

> جب بچے جوان ہو جاتے ہیں تو انہیں خواہش ہوتی ہے کہ وہ کسی کو اپنا رفیق بنائیں۔ لڑکیاں لڑکوں کو اور لڑکے لڑکیوں کو چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی عیب کی بات نہیں۔ البتہ اگر کوئی پاک باز اور نیک رفیق ہو تو انسان کی خوش نصیبی ہے ورنہ بُرا رفیق تو انسان کی دنیا و آخرت کو تباہ کر دیتا ہے......
>
> .... شادی کے بعد انسان کی ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں بیوی کے اخراجات جدا اور اولاد ہو جاتی ہے تو اس کے مخارج جدا۔ یہ سب کچھ مرد کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ تم بھی تعلیم پوری کر لو اور کمانے لگو تو تمہاری بھی شادی کر دیں گے۔ خوب دل لگا کر پڑھو، لائق بن جاؤ تو اچھے لوگ تم سے پیار کریں اور تمہیں بھی کوئی اچھی سی بیوی مل جائے......
>
> .... استمناء سے بچنا، یہ بہت بڑی بلا ہے۔ گناہ ہے، خدا دیکھتا ہے اس کی نظر میں یہ بڑا جرم ہے پھر انسان کی صحت کے لیے بھی تباہی کا باعث ہے شاید پھر انسان شادی کے بھی قابل نہ رہے۔
>
> بُرے دوستوں سے بچنا، ان کی بُری باتوں سے بچنا، وہ انسان کو تباہ کر دیتے ہیں....

بچے بالغ ہوجائیں تو ان کے زیر بغل اور زیر ناف بال اُگنے لگتے ہیں۔ انہیں ہو سکتا ہے وہ اپنا کوئی عیب سمجھیں۔ ان کی راہنمائی کیجیے گا۔ بال صاف کرنے کا طریقہ اور اس کی اہمیت انہیں سمجھائیے گا۔ بچی کو خون آنے لگے تو ہو سکتا ہے وہ خوف زدہ ہو جائے اور چھپاتی پھرے۔ ماں کو اس سلسلے میں پیار سے اس کی راہنمائی کرنا چاہیے۔ اسی طرح اس کی چھاتیاں ابھرنے لگیں تو ہو سکتا ہے وہ بہت عجیب محسوس کرے۔ ماں کو اس بارے میں بھی پیار سے اُسے ضروری امور کی راہنمائی کرنا چاہیے۔

اسی طرح بیٹے میں جب علامت بلوغ پیدا ہوتی ہے تو وہ سوتے ہوئے اُلٹے اُلٹے خواب دیکھتا ہے۔ جس سے اس کو تحریک ہوتی ہے اور احتلام ہو جاتا ہے۔ کبھی وہ اس کو نقص سمجھنے لگتا ہے اور اپنے آپ کو گنہگار، اضطراب کی وجہ سے اس سلسلے میں کسی سے بات چیت بھی نہیں کرتا۔ ایسے ایسے موقع پر والدین کی ذمہ داری ہے کہ اسے سمجھائیں، اس کی مشکل حل کریں۔ ماں بھی بیٹی کی مشکل حل کرے اور اس سے کہے تیرے زیر ناف و بغل بالوں کا اگنا، یا خون بالغ ہونے کی علامت ہے لڑکیوں میں اس عمر میں اسی طرح کی علامات ہوتی ہیں خون کے ایام میں تجھ پر نماز واجب نہیں ہے، روزہ بھی نہ رکھو بعد میں قضا کر لینا۔ پھر اسے ماہواری کے احکام اور غسل و نظافت وغیرہ کا طریقہ بتائے۔ باپ بھی بیٹے سے اس طرح کہے کہ اب تو بالغ ہو گیا ہے، تیرے زیر ناف و بغل بال اُگیں گے۔ تحریک کنندہ خواب دیکھو گے۔ تمام لڑکوں سے ایسی عمر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس سے کوئی پریشانی محسوس نہ کرو۔ اگر محتلم ہو جاؤ تو اس سے تمہارا لباس نجس ہو جائے گا۔ غسل بھی تم پر واجب ہو جائے گا۔ غسل کرنے کا طریقہ یہ ہے ....

اس طرح ماں باپ بچوں کے اضطراب اور پریشانی کو دور کر کے انہیں زمانِ بلوغ کے واقعات کے لیے پہلے سے آمادہ کر دیتے ہیں جس سے بچے اس دور کو ایک طبیعی دور سمجھ کے چھپاتے نہیں۔

کتاب کا مطالعہ

کتاب کا مطالعہ تعلیم و تربیت کا ایک بہترین طریقہ ہے۔ اچھی کتاب قاری کی روح پر بہت گہرا اثر ڈالتی ہے۔ اس کی روح اور نفس کو کمال عطا کرتی ہے اور اس کی انسانی حیثیت کو بلند کر دیتی ہے۔ اس کے علم میں اضافہ کرتی ہے۔ اس کی معلومات بڑھاتی ہے۔ اخلاقی اور اجتماعی خرابیاں دور کرتی ہے۔ خصوصاً دورِ حاضر کی مشینی زندگی میں کہ جب انسان کے پاس فرصت کم ہو گئی ہے اور علمی و دینی محافل میں شرکت مشکل ہو گئی ہے کتاب کا مطالعہ تعلیم و تربیت کے لیے اور بھی اہمیت اختیار کر گیا ہے ممکن ہے کتاب کے مطالعے سے انسانی روح پر جو اثرات مترتب ہوں وہ دیگر حوالوں سے مترتب ہونے والے اثرات سے عمیق تر اور زیادہ گہرے ہوں کبھی انسان کا مطالعہ اس کی شخصیت کو تبدیل کر کے رکھ دیتا ہے علاوہ ازیں مطالعہ کتاب بہترین مشغولیت بھی ہے اور ایک صحیح تفریح بھی۔ جو لوگ اپنی فراغت کے اوقات کتاب کے مطالعہ میں گزارتے ہیں وہ علمی اور اخلاقی استفادہ کے علاوہ اعصابی کمزوری اور روحانی پریشانی سے بھی محفوظ رہتے ہیں اور ان کی زندگی زیادہ آرام دہ ہوتی ہے۔ کتاب ہر نظارے سے زیادہ خوبصورت اور ہر باغ اور ہر چمن سے زیادہ فرحت بخش ہے لیکن جو اہل ہو اس کے لیے۔ کتاب دلوں کو پاکیزگی اور نورانیت عطا کرتی ہے اور غم بھلا دیتی ہے اگرچہ وقتی طور پر ہی سہی۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

جو شخص اپنے آپ کو کتابوں کے ساتھ مصروف رکھتا ہے اس کا آرام خاطر

ضائع نہیں ہوتا۔[1]

امیرالمومنین علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:

تازہ بہ تازہ علمی مطالب حاصل کرکے اپنے دلوں کی کسالت اور خستگی کو دور کرو کیوں کہ دل بھی بدن کی طرح تھک جاتے ہیں[2]

ہر ملت کی ترقی اور تمدن کا معیار اس کی کتابوں کی کیفیت، تعداد اشاعت اور مطالعہ کرنے والوں کی تعداد کو قرار دیا جا سکتا ہے پڑھا لکھا ہونا ترقی کی علامت نہیں بلکہ مطالعہ اور تحقیق ملتوں کی ترقی کی علامت ہے۔ ہمارے پاس پڑھے لکھے بہت ہیں لیکن یہ بات باعث افسوس ہے کہ محقق اور کتاب دوست زیادہ نہیں۔ زیادہ تر لڑکے لڑکیاں جب فارغ التحصیل ہو جاتے ہیں تو کتاب کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں وہ کاروبار اور زندگی کے دیگر امور میں مشغول ہو جاتے ہیں لہٰذا ان کی معلومات کا سلسلہ وہیں پر رک جاتا ہے۔ گویا حصول تعلیم کا مقصد بس حصول معاش ہی تھا۔ جب کہ حصول تعلیم کو انسان کے کمال اور علمی پیش رفت کے لیے مقدم ہونا چاہیے۔ انسان ابتدائی تعلیم کے حصول سے مطالعہ اور تحقیق کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ اس کے بعد اس کو چاہیے کہ وہ مطالعہ کرے۔ تحقیق کرے اور کتاب پڑھے تاکہ اپنے آپ کی تکمیل کر سکے اور پھر ایک مرحلے پر انسانی علوم کی ترقی میں مدد کر سکے اور یہ کام توانائی اور وسائل کے مطابق آخر عمر تک جاری رکھے۔ دین مقدس اسلام نے بھی اپنے پیروکاروں کو حکم دیا ہے کہ بچپن سے لے کر موت کی دہلیز تک حصول علم کو ترک نہ کریں۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

حصول علم ہر مسلمان کا فریضہ ہے اور اللہ طالب علموں کو پسند کرتا ہے[3]

---

[1] غرر الحکم، ص ۶۳۶

[2] اصول کافی، ج ۱، ص ۴۸

[3] اصول کافی، ج ۱، ص ۳۰

حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

میرے اصحاب کو اگر تازیانے سے بھی حصولِ علم کے لیے آمادہ کیا جائے تو مجھے یہ بھی پسند ہے[1]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

دو افراد کے علاوہ زندگی میں کسی کے لیے بھلائی نہیں پہلا وہ عالم کہ جس کی اتباع کی جائے اور دوسرا کہ جو حصولِ علم میں مشغول ہو[2]

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں :

لوگ تین طرح کے ہیں :

۱- عالم ،

۲- طالب علم اور

۳- باقی کوڑا کرکٹ کا ڈھیر[3]

امام صادق علیہ السلام ہی فرماتے ہیں :

حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے فرمایا : بیٹا اپنے شب و روز میں کچھ وقت مطالعہ اور حصول علم کے لیے مختص کر دو کیونکہ اگر تم نے مطالعہ ترک کر دیا تو تمہارا علم ضائع ہو جائے گا[4]

امام جعفر صادق علیہ السلام ہی نے ارشاد فرمایا :

حصولِ علم ہر حال میں واجب ہے[5]

---

[1] اصول کافی ، ج ۱ ، ص ۳۱

[2] اصول کافی ، ج ۱ ، ص ۳۳

[3] اصول کافی ، ج ۱ ، ص ۳۴

[4] بحار ، ج ۱ ، ص ، ص ۱۶۹

[5] بحار ، ج ۱ ، ص ، ص ۱۷۲

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا:
طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلىٰ كُلِّ مُسْلِمٍ وَ مُسْلِمَةٍ ۔
علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت پر فرض ہے [۱]

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:
اگر لوگوں کو علم کے فائدے معلوم ہوتے تو اس کے حصول کے لیے کوشش کرتے اگرچہ اس کام میں ان کی جان خطرے میں پڑ جاتی یا انہیں حصولِ علم کیلئے سمندر پار کا سفر کرنا پڑتا [۲]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
اگر میرا کوئی ایک دن ایسا گزر جائے کہ جس دن میرے علم میں کچھ بھی اضافہ نہ ہو تو وہ دن نامبارک ہے [۳]

ماں باپ کی ابتدائی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو پڑھنے لکھنے کے لیے اسکول بھیجیں اسلام نے اس سلسلے میں بھی بڑی تاکید کی ہے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:
بچہ سات سال کھیلتا ہے! سات سال پڑھتا ہے اور سات سال حلال و حرام کے متعلق جانتا ہے [۴]

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
بیٹے کے باپ پر تین حق ہیں۔
۱۔ اُس کا اچھا سا نام رکھے،

---

[۱] بحار، ج ۱، ص ۱۷۷

[۲] بحار، ج ۱، ص ۱۷۷

[۳] مجمع الزوائد، ج ۱، ص ۱۳۷

[۴] مستدرک ج ۲، ص ۶۲۵

۲- اسے پڑھنا لکھنا سکھائے اور

۳- جب بڑا ہو جائے تو اس کی شادی کرے۔[1]

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

جب بچے کو مدرسے لے جاتے ہیں اور استاد اُسے بسم اللہ پڑھاتا ہے تو خدا اُس کے والدین کو جہنم کی آگ سے بچا لیتا ہے۔[2]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

افسوس ہے دورِ آخر کے بچوں پر کہ جو ان کے آباء کے ہاتھوں ان پہ گذرے گی۔ اگرچہ وہ مسلمان ہوں گے لیکن اپنی اولاد کو دینی فرائض سے آگاہ نہیں کریں گے۔[3]

ماں باپ کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کی اس طریقے سے پرورش کریں کہ وہ علم و دانش حاصل کرنے، کتاب پڑھنے اور بحث و تحقیق کے شیدا بنیں۔ ان کے گھر کا ماحول علمی ہونا چاہیے۔ اور وہ اپنے بچوں کو قول و عمل سے مطالعہ کرنے کا شوق دلائیں۔ بہتر یہ ہے کہ یہ طریقہ کار بچپن ہی سے شروع کر دیا جائے۔ اور بچے کے سکول جانے سے پہلے اسے اس طرزِ عمل کا عادی بنا دیا جائے۔ پہلے آپ بچوں کو کتاب پڑھ کر سنائیں۔ چھوٹے چھوٹے، سادہ اور قابلِ فہم قصوں اور کہانیوں کی کتابیں انہیں لا کر دیں۔ اگر یہ کتابیں تصویروں والی ہوں تو اور بھی بہتر ہے پھر ہر روز ماں باپ یا بڑی بہن یا بھائی اس کتاب کا کچھ حصہ چھوٹے بچے کو پڑھ کر سنائیں اور اگر اس کتاب میں تصویریں بھی ہوں تو کتاب کے مطالب کی ان تصویروں کے ساتھ تطبیق کر کے بچوں کو بتائیں۔ پھر اس سے کہا جائے کہ اس کہانی کا خلاصہ بتائے۔ اور اگر اُس میں چھوٹے چھوٹے شعر بھی ہوں تو اسے وہ شعر یاد کرائے

---

[1] مستدرک، ج ۲، ص ۶۲۵

[2] مستدرک، ج ۲، ص ۶۲۵

[3] مستدرک، ج ۲، ص ۶۲۵

جائیں۔ البتہ اس سلسلے میں جلدی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ یا بچے کی استعداد اور خواہش کے مطابق اسے کہانیاں پڑھ کر سنائی جائیں نہ کہ اس کی استعداد سے زیادہ۔ کیوں کہ اگر اس کی استعداد اور فہم سے زیادہ اس پر ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تو وہ شروع ہی سے کتاب پڑھنے سے بیزار ہو جائے گا۔

یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رکھیں جب تک بچہ خود پڑھنا اور لکھنا سیکھ نہیں جاتا۔ اس کے بعد کتاب پڑھنے کی ذمہ داری خود بچے پر ڈال دی جائے۔ کبھی کبھی کتاب کے متعلق اس کی رائے معلوم کی جائے۔ کتاب کے مطالب کے بارے میں اس سے گفتگو کی جائے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رکھیں جب بچہ خود بخود کتاب پڑھنے کا عادی ہو جائے۔

یہاں پر والدین کی خدمت میں چند نکات کی یاد دہانی ضروری ہے۔

۱۔ بچے کہانیاں پسند کرتے ہیں۔ اور ان کے مطالب کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ البتہ کلی مطالب کو وہ اچھی طرح نہیں سمجھتے۔ اس لحاظ سے بچوں کی کتابیں حتی المقدور کہانیوں کی صورت میں ہونی چاہیے۔

۲۔ ہر بچہ ایک الگ شخصیت کا مالک ہے۔ تمام افراد کی استعداد اور ذوق برابر نہیں ہوتے۔ مختلف عمروں میں ان میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ لہٰذا ماں باپ پہلے اپنے بچے کی استعداد اور ذوق کو سمجھیں اور پھر اسی کے مطابق اس کے لیے کتابیں لائیں۔ مشکل اور بوریت سے بھرپور مطالب اس پر ٹھونسنے سے پرہیز کریں۔ کیوں کہ ممکن ہے ایسا کرنا اسے کتابیں پڑھنے سے بیزار کر دے۔

۳۔ چونکہ بچے کی شخصیت کی تعمیر ہو رہی ہوتی ہے۔ اور کتاب اس پر گہرا اور عمیق اثر چھوڑتی ہے۔ لہٰذا اسے ہر طرح کی کتاب نہیں دی جا سکتی۔ ماں باپ پہلے خود وہ کتاب پڑھیں، اس کے مطالب پر مطمئن ہونے کے بعد وہ بچے کے سپرد کریں۔ اگر بچے نے کوئی گندی کتاب پڑھی تو یہ اس کی روح پر برا اثر ڈالے گی۔ جب کہ اس کی دوبارہ تربیت کرنا اور اسے سدھارنا بہت مشکل کام ثابت ہو گا۔

۴۔ بچے جرائم کی کتابیں جن میں پولیس، قتل، اور چوری ڈاکہ کی باتیں ہوں بڑے شوق سے

پڑھتے ہیں۔ لیکن اس طرح کی کتابیں نہ فقط یہ کہ بچوں کے لیے سود مند نہیں ہیں بلکہ انہیں قتل، جرم اور چوری وغیرہ کے طریقے سکھاتی ہیں۔ جس سے ان کی سلامتی، اور روحانی و نفسیاتی سکون تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح جنسی قوت کو تحریک دینے والی کتابیں بھی بچوں کے لیے نقصان دہ ہیں۔ کیوں کہ ممکن ہے ان کتابوں سے اُن کی جنسی قوت وقت سے پہلے بیدار ہو جائے اور انہیں تباہی و بربادی کی وادی میں دھکیل دے۔

ایک صاحب اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

...... میری دادی اماں تھیں جو مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ رات کو میں ان کے پاس سوتا اور ان سے کہانی سنانے کی ضد کرتا۔ وہ مجھے سلانے کے لیے ہر رات ایک کہانی سناتیں۔ وہ مجھے جن بابا کی کہانی سناتیں اور اسی طرح دوسری ڈراؤنی کہانیاں۔ ان کہانیوں نے میری روح اور نفسیات پر اپنا اثر چھوڑا۔ میں اُسی پریشان کن حالت میں سو جاتا۔ اور خواب میں بھی یہ افکار مجھے پریشان کرتے رہتے۔ میں ان تحریک آمیز اور فرضی کہانیوں اور افسانوں کو بہت پسند کرتا انہوں نے میری روح کو بہت حساس اور پریشان کر دیا۔ میں بزدل اور ڈرپوک بن گیا۔ تنہائی سے مجھے خوف آتا۔ میں غصیلہ اور زود رنج ہو گیا یہ کیفیت ابھی بھی مجھ میں باقی ہے۔ کاش والدین اس طرح کی جھوٹی اور تحریک آمیز کہانیاں اپنے بچوں کو نہ سنائیں۔ میں نے یہ پکا ارادہ کیا ہوا ہے کہ اپنے بچوں کو اس طرح کی کہانیاں نہیں سناؤں گا۔ میں عموماً انہیں قرآنی قصے اور دیگر سچی کہانیاں سناتا ہوں۔

۵۔ کتاب پڑھنے کا مقصد صرف وقت گزاری نہیں ہے۔ بلکہ اس کا اصل مقصد اس کے مطالب کو سمجھنا اور ان سے استفادہ کرنا ہے۔ یہ بات اہم نہیں ہے کہ بچہ کتنی کتاب پڑھتا ہے بلکہ اہم یہ ہے کہ اس نے یہ کتاب کس طریقے سے پڑھی ہے۔ کیا سرسری طور پر پڑھ کر گزر گیا ہے یا غور و فکر سے اور سمجھ کر اُس نے پڑھی ہے ماں باپ کو اس سلسلے میں پوری توجہ رکھنی چاہیے۔ بچے سے کبھی کبھی کتاب کے مطالب کے متعلق

سوال کرتے رہنا چاہیے۔ اور ان مطالب کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں بھی اس کی رائے معلوم کرتے رہنا چاہیئے۔ نیز چاہیئے کہ اس سے دریافت کیا جائے اس سے اس نے کیا نتیجہ حاصل کیا ہے۔

۶۔ بچوں کو افسانوں اور جھوٹ پر مشتمل حیرت انگیز کتابیں بھی بہت اچھی لگتی ہیں بچوں کی ایسی کتابوں سے محبت کی ہی بعض دانشور تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں اس طرح کی کتابیں بچے کے وسعتِ تخیل کے لیے بہت مفید ہیں۔ لیکن راقم کی رائے یہ ہے کہ غیر حقیقی اور افسانوی کہانیاں بچوں کو جھوٹ کا عادی بنا دیتی ہیں اور اس کے دماغ میں جھوٹے اور غیر حقیقی افکار جاگزیں ہو جاتے ہیں جب وہ بڑا ہو جائے گا تو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے بھی غیر حقیقی راستے تلاش کرے گا۔

۷۔ یہ صحیح ہے کہ بچہ کہانیوں کو باقی سب چیزوں کی نسبت زیادہ پسند کرتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ فقط کہانیاں پڑھنے کا عادی ہو جائے۔ بلکہ کبھی کبھی علمی، اخلاقی اور اجتماعی امور پر مشتمل فائدہ بخش کتب بھی اسے دی جائیں تاکہ وہ آہستہ آہستہ گہرے اور دقیق علمی مطالب سمجھنے کے لیے آمادگی پیدا کرے اور بعد میں فقط علمی کتابیں پڑھنے کا عادی ہو جائے۔

۸۔ ایسا نہیں ہے کہ بچہ فقط افسانوی اور جھوٹی کتابوں کو پسند کرتا ہو بلکہ بڑی شخصیات اور حقیقی تاریخ ساز انسانوں کی زندگی پر مشتمل کتابیں بھی بڑے شوق سے پڑھتا ہے۔ اور اس طرح کی کتابیں پڑھنے سے کسی شخصیت کو اپنا آئیڈیل اور نمونۂ عمل قرار دیتا ہے اس طرح کی کتابیں بچے کے لیے دلچسپ بھی ہیں اور مفید بھی ہیں۔

ناقص الخلقت بچے

بعض بچے پیدائشی طور پر ناقص الخلقت ہوتے ہیں یا بعد میں کسی حادثے کی وجہ سے ان کے بدن میں کوئی نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ اندھے لولے لنگڑے گونگے بہرے اور اسی طرح کے دوسرے نقائص میں بہت سے افراد مبتلا ہوتے ہیں بعض بچے اگرچہ بدن کے کسی عضو کے اعتبار سے تو نقص نہیں رکھتے لیکن مناسب قامت اور مکمل خوبصورتی سے محروم ہوتے ہیں۔ کالے پیلے، کمزور، بہت چھوٹے، بہت بڑے، بہت موٹے، چھوٹی ناک والے، بڑے منہ والے یا چھوٹے منہ والے، اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں والے، اور بڑے دانتوں والے، ان نقائص کے حامل افراد اگرچہ کسی عضو کے نقص میں مبتلا نہیں ہوتے لیکن دوسروں کی نسبت مکمل اور خوبصورت بھی نہیں ہوتے۔

اسی میں ان افراد کا کوئی قصور نہیں ہے خدا نے انہیں اس طرح پیدا کیا ہے نظام خلقت میں تمام اشیاء خوبصورت اور مناسب ہیں۔ یہ تو ہماری کم فہمی اور کم ذوقی کا قصور ہے کہ کسی کو خوبصورت سمجھتے ہیں اور کسی کو بدصورت۔

ناقص اور معذور افراد چونکہ اپنے نقص کی طرف متوجہ رہتے ہیں لہذا ہمیشہ غم و اندوہ میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ احساس کمتری میں مبتلا رہتے ہیں۔ اگر اس احساس کو ختم نہ کیا جائے بلکہ اس کی تائید کی جائے تو وہ ہمیشہ کے لیے احساسِ کمتری اور کم ہمتی کا شکار ہو جائیں گے۔ جن لوگوں کے دل میں احساس کمتری گھر کرے تو وہ تو اپنی شخصیت گنوا بیٹھتے ہیں۔ اپنے تئیں بے لیاقت، ناچیز اور نااہل سمجھتے ہیں۔ وہ ذمہ داریوں کو قبول کرنے اور کاموں کے لیے لپک

کے آگے بڑھنے سے گریزاں رہتے ہیں گویا ذلت وبدبختی کے سامنے ہتھیار پھینک دیتے ہیں۔ ممکن ہے کبھی وہ اپنے اظہار وجود کے لیے قتل یا کسی دوسرے جرم کا ارتکاب کر بیٹھیں۔

اپاہج قابلِ رحم ہوتے ہیں۔ لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کے نقص کو بالکل نظر انداز کر دیں۔ ان کے ساتھ ایسا سلوک کریں کہ جیسا وہ دیگر افراد کے ساتھ کرتے ہیں اور ان کے نقص کے بارے میں نہ سوچیں نہ ان پر طنز کریں نہ تمسخر اڑائیں۔ اور نہ ان کے نازک دلوں پر زبان سے چرکے لگائیں۔ دینِ مقدس اسلام نے عیب جوئی، تمسخر بازی، سرزنش اور دوسروں کی ذلت میں کیڑے نکالنے کو گناہانِ کبیرہ میں سے اور حرام قرار دیا ہے۔ اور اس بارے میں اس قدر تاکید کی ہے کہ اپنے پیروکاروں کو حکم دیا ہے کہ آپ ہرگز کوئی ایسا کام نہ کریں کہ ناقص الخلقت افراد اپنے نقص کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

مصیبت میں گھرے افراد اور کوڑھیوں کی طرف زیادہ نہ دیکھیں کیوں کہ ممکن ہے آپ کی نظریں ان کے لیے باعث حزن وملال ہوں [۱]

علاوہ ازیں مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ ایسے افراد کے ساتھ زیادہ محبت اور ہمدردی کریں اور اس طرح سے ان کے احساس کمتری کا ازالہ کریں۔ اور ان میں احساس زندگی کو تقویت بخشیں۔ ایسے بچوں کے ماں باپ کی ذمہ داری بھی سنگین تر ہے۔ اس امر پہ ان کی توجہ ہونا چاہیے کہ ناقص افراد بھی ترقی اور کمال کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اگر ان کی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جائے اور ان کی دیگر قوتوں کو ابھار کر تقویت پہنچائی جائے تو وہ کسی نہ کسی علمی، سائنسی یا فنی شعبے میں مہارت حاصل کر سکتے ہیں اور اس طرح سے اپنے نقص کا ازالہ کر سکتے ہیں اور معاشرے میں بلند مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ کتنے ہی ناقص افراد ہیں کہ جو کوشش اور ہمت سے ایسے بلند مقام پر پہنچے ہیں کہ جس سے ان کا نقص بہت ہی پیچھے رہ گیا ہے۔ ماں باپ کو چاہیے کہ اپنی اولاد کے نقص سے بالکل چشم پوشی کریں اور اس بارے میں بالکل بات نہ کریں یہاں تک کہ مذاق، اظہار ہمدردی یا غصے

---

[۱] بحار، ج ۷۵، ص ۱۵

کی صورت میں بھی ذکر نہ کریں۔ ایسے بچوں کے ساتھ بھی ان کا سلوک بالکل ایسا ہو جیسا دوسرے بچوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر خود بچے اس سلسلے میں پریشانی کا اظہار کریں تو کوشش کریں کہ اس نقص کو غیر اہم قرار دیں۔ اور اُسے اس کی دوسری صلاحیتیں یاد دلائیں اور ان کی تعریف و ستائش کریں۔

ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ پوری توجہ سے تحقیق کریں کہ بچوں میں کیا کیا استعداد اور صلاحیت موجود ہے اور اس سلسلے میں جاننے والے افراد سے مشورہ کریں۔ اور پھر بچے کو اس طرف متوجہ کریں۔ اور اس بارے میں ان کی تائید کریں اور انہیں ترغیب دیں۔ اگر ماں باپ اس سلسلے میں کچھ توجہ کریں تو وہ اپنے ناقص بچے کی اور معاشرے کی بہت بڑی خدمت سرانجام دیں گے۔

اس صورت میں اس طرح کا شخص گویا اپنی کھوئی ہوئی صورت کو پالے گا اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکے گا۔ اور معاشرت میں بھی وہ ایک اہم مقام حاصل کر سکے گا۔

ایک لڑکی اپنے خط میں لکھتی ہے۔

.... میری ایک سہیلی نے اپنی زندگی کی داستان مجھے اس طرح سنائی: میں تیرہ سال کی تھی۔ ایک دفعہ میں چھت سے گر پڑی۔ میری ریڑھ کی ہڈی پر چوٹ لگی۔ جس کی وجہ سے میں معذور ہو گئی۔ کچھ عرصہ ہسپتال میں میرا علاج ہوتا رہا۔ اگرچہ مجھے تکلیف تھی لیکن مجھے بعد میں سمجھ آئی کہ یہ دن میرے لیے بہت بہتر تھے۔ جب مجھے ہسپتال سے چھٹی ملی اور میں گھر پہنچی تو میرے والدین نے مجھے ازلی دشمنوں کی طرح دیکھنا شروع کر دیا۔ انہوں نے کہا: تم ہمارے لیے باعث ننگ و عار ہو۔ ہم لوگوں کو کیسے بتائیں کہ ہم ایک معذور بیٹی کے والدین ہیں۔ تم ہمیشہ ہم پر سوار رہو گی۔ وہ مجھے دلاسہ دینے کی بجائے دن رات ایسی ہی باتیں کرتے اور میری پژمردہ روح کو اور جگر کے زخم) لگاتے۔ وہ یہ نہیں سوچتے تھے کہ میں بے قصور ہوں۔ میں روزانہ کئی مرتبہ خدا سے اپنی موت کی دعا کرتی تا کہ

اس سخت زندگی سے میری جان چھوٹ جائے۔ میں اپنے مفلوج پاؤں سے کے ساتھ سارا دن گھر میں کام کرتی۔ لیکن کوئی میری دلجوئی نہ کرتا مجھے اصلاً اپنی بیٹی ہی نہ سمجھتے میری جوانی کے بہترین ایام رنج و درد کے عالم میں گزرے۔ پندرہ سال کی عمر میں میں ایک پچاس سالہ بوڑھی کی طرح نظر آتی جب میرے ماں باپ مر گئے۔ میرے بہن بھائی بھی بچپن ہی سے مجھ سے متنفر تھے وہ بھی میری احوال پرسی نہ کرتے۔ پھر میری شادی کر دی گئی۔ میرے شوہر بہت مہربان شخص تھے۔ مجھ سے بہت محبت کرتے۔ اس وقت تک مجھے محبت کی ٹھنڈی چھاؤں نصیب نہیں تھی اب میری حالت دن بدن اچھی ہونے لگی اب میں بالکل تندرست ہو گئی ہوں۔ خدا نے مجھے اولاد بھی عطا کی ہے۔ اور میں خوش و خرم اور صحت و سلامتی کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوں۔

جسمانی سزا

بہت سے والدین بچوں کی تربیت کے لیے جسمانی سزا ضروری سمجھتے ہیں اور اکثر اساتذہ کے ذہن میں بھی یہ سودا سمایا ہوتا ہے۔ لوگوں میں مشہور ہے کہ "لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے" گزشتہ زمانے میں اس طرز عمل کے حامی بہت افراد تھے۔ اور یہ طریقہ کار رائج بھی تھا۔ سکول کی ضروریات میں سے ڈنڈا، زنجیر اور کوڑا وغیرہ بھی تھا۔ جو والدین اپنی اولاد کی تربیت کے خواہش مند ہوتے وہ انہیں مارنے سے دریغ نہ کرتے۔ لیکن بہت سے دانشور بالعموم اور ماہرین نفسیات بالخصوص اس طرز عمل کو بچے کے لیے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ اور اس سے منع کرتے ہیں دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں جسمانی سزا پر تقریباً تقریباً پابندی ہے اور اس سلسلے میں کئی قوانین منظور اور نافذ ہو چکے ہیں۔ دانشور کہتے ہیں۔

جسمانی سزا سے بچے کی اصلاح نہیں کی جا سکتی۔ ممکن ہے ظاہری طور پر اس کا تھوڑا بہت اثر ہو لیکن یہ ناقابل تلافی نقصان کی حامل بھی ہوتی ہیں مثلاً

۱۔ مار کھا کر بچہ اس بات کا عادی ہو جاتا ہے کہ وہ زور اور طاقت کے سامنے بلا چون وچرا سر جھکا لے۔ اور ہو سکتا ہے اس طریقے سے وہ یہ سمجھنے لگے کہ طاقت ہی کامیابی کی کلید ہے۔ اور جب بھی غصہ آئے مارنا چاہیے۔ اور اس سلسلے میں کچھ لحاظ نہیں رکھنا چاہیے۔ مار پیٹ کے ذریعے ماں باپ جنگل کے وحشیانہ قوانین اپنے بچے پر لاگو کر دیتے ہیں۔

۲۔ مار کھانے والے بچے کے دل میں والدین کے بارے میں کینہ اور نفرت پیدا ہو

جاتی ہے اور زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ وہ آخر تک اُسے فراموش نہیں کرتا۔ ہو سکتا ہے وہ کسی ردعمل کا مظاہرہ کرے اور سرکش ہو جائے۔

۳۔ مار پٹائی بچے کو بزدل بنا دیتی ہے۔ اس کے ذریعے سے بچے کی شخصیت بھی کچلی جاتی ہے اور اس کا روحانی توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ غصے اور دوسری نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

۴۔ جسمانی مار پیٹ زیادہ تر بچے کی اصلاح نہیں کرتی اور اس کے اندر اصلاح کا جذبہ نہیں ابھارتی۔ ممکن ہے مار پیٹ اور ڈنڈے کے خوف سے ظاہراً وہ بُرا کام نہ کرے اور دوسروں کی موجودگی میں وہ کچھ نہ کرے لیکن اس کی حقیقی بُرائی اس طرح سے دور نہیں ہوتی اور باطن میں موجود رہتی ہے اور بعد ازاں کسی دوسری صورت میں آشکار ہوتی ہے۔

ایک صاحب کہتے ہیں:

میرے بارہ سالہ بیٹے نے الماری سے ماں کے پیسے اٹھا لیے۔ اس کام پر میں نے اس کی ڈنڈے سے پٹائی کی۔ اس کے بعد وہ خوف کے مارے الماری کے قریب نہیں جاتا تھا۔

اور یہ درست ہے کہ بچے نے اس کے بعد الماری سے پیسے نہیں اٹھائے اور اس لحاظ سے باپ نے اپنا مقصد پا لیا ہے لیکن معاملہ اتنا سادہ نہ تھا۔ یہ قصہ آگے بڑھا۔ بعد ازاں وہ بس کا کرایہ ادا نہ کرتا۔ ماں سودا سلف کے لیے پیسے دیتی تو اس میں سے چرا لیتا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے اپنے دوستوں کے بھی پیسے چرائے ہیں۔ گویا مار نے بچے کو مجبور کیا وہ ایک کام کا تکرار نہ کرے لیکن اس کام کی اصل حقیقت تو ختم نہ ہوئی[1]

ایک دانشور لکھتے ہیں:

جن بچوں کی مار پٹائی ہوتی رہتی ہے وہ بعد از آں ڈھیلے ڈھالے اور بیکار سے

---

[1] روان شناسی تجربی کودک، ص ۲۶۲

شخص بن سکتے ہیں یا پھر ڈھونس دھاندلی جاتے ہیں گویا پوری زندگی اپنے افسردہ بچپن کا انتقام لیتے ہیں۔[۱]

مسٹر رسل لکھتے ہیں:

میرے نظریے کے مطابق بدنی سزا کسی لحاظ سے بھی درست نہیں ہے۔[۲]

اسلام نے بھی جسمانی سزا کو نقصان دہ قرار دیا ہے اور اس سے روکا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

عقلمند ادب کے ذریعے نصیحت حاصل کرتا ہے۔ یہ تو صرف حیوانات ہیں جو مار کے بغیر ٹھیک نہیں ہوتے۔[۳]

حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

جو شخص بھی دوسرے کو ایک تازیانہ مارے گا۔ اللہ تعالیٰ اس پر آگ کا تازیانہ برسائے گا۔[۴]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

تعلیم و تربیت میں پیار محبت سے کام لیں اور سخت گیری نہ کریں کیونکہ دانشمند استاد سخت گیر استاد سے بہتر ہوتا ہے۔[۵]

ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام سے اپنے بیٹے کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا:

اُسے مارنا نہ البتہ اس سے کچھ دور رہو لیکن تمہاری یہ دوری اور ناراضی زیادہ

---

[۱] روان شناسی تجربی کودک، ص ۲۶۶
[۲] در تربیت، ص ۱۶۹
[۳] غررالحکم، ص ۳۴۶
[۴] وسائل ج ۱۹، ص ۱۲
[۵] بحار، ج ۷۷، ص ۱۷۵

دیر کے لیے نہ ہو۔[۱]

بہرحال بدنی سزائیں تربیت کے لیے نہایت ہی خطرناک ہیں اور حتیٰ الامکان ان سے بچنا چاہیے۔ لیکن اگر کوئی دوسرا طریقہ مؤثر نہ ہو اور مار کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ ہو تو ایک ضرورت کی حد تک اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اسلام نے بھی اس کے لیے اجازت دی ہے مثلاً

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اپنے بچوں کو چھ سال کی عمر میں نماز کے لیے کہو اور اگر نصیحت اور ڈانٹ مؤثر نہ ہوں اور وہ تمہارے حکم کی خلاف ورزی کریں تو سات سال کی عمر میں تم انہیں مار کر نماز کے لیے کہہ سکتے ہو۔[۲]

ایک اور حدیث میں امام محمد باقر یا امام جعفر صادق علیہما السلام نے فرمایا:

جب بچہ نو سال کی عمر کو پہنچے تو اسے وضو کرنا سکھاؤ اور اس سے کہو کہ وضو کرے اور نماز پڑھے۔ اور اگر وہ نہ مانے تو مار کر نماز پڑھاؤ۔[۳]

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

اگر تمہارا خادم خدا کی نافرمانی کرے تو اسے مارو اور اگر تمہاری نافرمانی کرے تو اسے معاف کردو۔[۴]

امیر المومنین علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:

جس طرح سے اپنے بیٹے کو سرزنش کرو اسی طریقے سے یتیم کو سرزنش کرو اور جس مقام پر اپنے بیٹے کو سرزنش کے لیے مارو اس مقام پر یتیم کے لیے بھی اس سے کام لو۔[۵]

۱۔ بحار، ج ۱۰۴، ص ۹۹

۲۔ مستدرک ج ۱، ص ۱۷۱

۳۔ وسائل، ج ۳، ص ۱۳

۴۔ غرر الحکم، ص ۱۱۵

۵۔ وسائل، ج ۱۵، ص ۱۹۷

ایک شخص نبی اکرمؐ کی خدمت میں آیا اور عرض کی ایک یتیم بچہ میری سرپرستی میں ہے کیا میں اُسے سرزنش کے لیے مار سکتا ہوں فرمایا:

جس مقام پر تم اپنے بیٹے کو تربیت کے لیے مار سکتے ہو اس مقام پر یتیم کی تربیت کے لیے بھی مار سے کام لے سکتے ہو۔[۱]

بہر حال جب تک ضرورت نہ پڑ جائے اس حساس اور خطرناک وسیلے سے کام نہیں لینا چاہیے۔ اور جب ضروری ہو اس وقت بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اور سزا جچی تلی اور سوچی سمجھی ہونی چاہیے۔

ایک شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی میرے گھر والے میری نافرمانی کرتے ہیں میں کس طریقے سے انہیں تنبیہ کروں۔ فرمایا:

انہیں معاف کر دو۔

اس نے دوسری اور تیسری مرتبہ یہی سوال کیا تو حضورؐ نے یہی جواب دیا۔

اور اس کے بعد فرمایا:

اگر تم انہیں سرزنش کرنا چاہتے ہو تو پھر تمہیں دھیان رکھنا چاہیے کہ سزا اُن کے جرم سے زیادہ نہ ہو اور چہرے پر مارنے سے اجتناب کرنا۔[۲]

حضرت صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

(ضرورت کے موقع پر بچے اور خادم کو تنبیہ کے لیے پانچ یا چھ ضربوں سے زیادہ نہ مارو اور زیادہ زور سے بھی نہ مارو۔[۳]

تنبیہ کے موقع پر کوشش کریں کہ دوسروں کی موجودگی میں نہ ہو کیونکہ روحانی طور پر بچے پر اس کے بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اسے وہ عمر بھر نہیں بھولتا۔ مار حد سے

۱۔ مستدرک ج ۲، ص ۶۲۵

۲۔ مجمع الفوائد، ج ۸، ص ۱۰۶

۳۔ وسائل ج ۱۸، ص ۵۸۱

بڑھ جائے تو اسلام میں اس کے لیے دیت اور جرمانہ مقرر کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس حد تک نہیں مارنا چاہیے۔ اسلام کے قوانین کے مطابق اگر مارنے کے نتیجے میں کسی کا چہرہ سیاہ پڑ جائے تو مارنے والے کو اسے چھ طلائی دینار دینا ہوں گے۔ اور اگر چہرہ سبز پڑ جائے تو تین دینار اور اگر سرخ ہو جائے تو ڈیڑھ دینار[1]

ماں باپ کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ پاگلوں کی طرح بیچارے بچے کی جان کے درپے ہو جائیں۔ اور اُسے مکوں اور لاتوں سے ماریں۔ یا زنجیر اور ڈنڈے سے اس کا بدن سیاہ کر دیں۔

بہر حال ضرورت کے موقع پر اسلام نہ فقط بدنی سزا کو مفید سمجھتا ہے بلکہ اس کا حکم دیتا ہے۔ کیونکہ بے حد و حساب اور مطلق آزادی کا بھی مفید نتیجہ بر آمد نہیں ہوتا یہی بے حساب اور غلط آزادی ہے کہ جس نے مغرب کے بچوں اور نوجوانوں کو بگاڑ دیا ہے۔

---

[1] وسائل، ج ۱۹، ص ۲۹۵

غیر جسمانی سزائیں

بہت سے والدین اپنے بچوں کی تربیت کے لیے غیر بدنی سزاؤں سے استفادہ کرتے ہیں مثلاً بچے کو کسی اندھیرے کمرے میں بند کر دیتے ہیں۔ یا تہہ خانے میں بند کر دیتے ہیں یا کسی صندوق وغیرہ میں۔ کبھی اُس کو غصّے کے ساتھ گالی بکتے ہیں۔ اس طرح کی وحشیانہ سزاؤں کا نقصان بدنی سزاؤں اور مار پیٹ سے کم نہیں ہے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

بہت سی سزائیں ایسی ہوتی ہیں جن کا اثر حملے سے زیادہ ہوتا ہے [۱]

اور ممکن ہے یہ بدنی سزاؤں سے بھی زیادہ نقصان دہ ہوں۔ اس طرح کی سزائیں بچے کی شخصیت کو مجروح کر دیتی ہیں اور خوف و اضطراب کے عوامل اس میں پیدا کر دیتی ہیں۔ ایسا بہت دفعہ ہوا ہے کہ کسی کمرے میں بند بچے کے اعصاب پر اتنا شدید خوف طاری ہوا ہے جس سے وہ پوری زندگی نجات حاصل نہیں کر سکا کبھی اس خوف کے زیر اثر اس پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔ لہذا والدین کو اس طرح کی سزائیں دینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ بد زبانی اور گالی حرام ہونے کے ساتھ ساتھ بچے کی تربیت پر بھی بُرے اثرات مرتب کرتی ہیں اور اسے اس بُرے عمل کا عادی بنا دیتی ہیں۔

لیکن بعض غیر جسمانی سزاؤں میں اس طرح کا نقصان نہیں ہے جیسے بچے کے ساتھ

---

[۱] غرر الحکم، ص ۴۱۵

ناراض ہو جانا، اسے سیر و تفریح کے لیے نہ لے جانا۔ اسے دعوت پر نہ لے جانا اسے ایک وقت کا کھانا نہ دینا۔ اس کے جیب خرچ میں کمی کر دینا۔ اُسے کھیلنے سے روک دینا۔ اس کے ذمہ مشکل کام لگا دینا یا گھر کے بعض کام اس کے سپرد کر دینا اور اسی طرح کی دوسری سادہ اور بے ضرر قسم کی سزائیں۔ بہت سے والدین اپنے بچوں کی تنبیہ کے لیے اس طرح کی سزائیں دیتے ہیں۔ سکولوں میں بھی کم و بیش اس طرح کی سزائیں رائج ہیں۔ اس طرح کی سزاؤں کا استعمال اگر صحیح اور عاقلانہ طریقے سے کیا جائے تو یہ بچے کی تربیت کے لیے کسی حد تک سود مند ہوتی ہیں۔ اور کسی قسم کا نقصان بھی نہیں رکھتیں۔ سزائیں یہ ایک عمومی نقص ہے کہ یہ بچے کی باطنی اور اندرونی اصلاح کیلئے موثر نہیں ہوتی اور اس میں اصلاح کا رجحان پیدا نہیں کرتی۔ سزا کے ڈر سے ممکن ہے وہ کھلے عام اس بُرے کام کے انجام دینے سے باز رہے لیکن اس بُرائی کو وہ جڑ سے نہیں کاٹ پھینکتا بلکہ ظاہری طور پر وہ اس بُرائی کے جذبے کو چھپا لیتا ہے اور پھر یہ جذبہ کسی دوسری جگہ پر اپنا کام دکھاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سزا کے خوف سے وہ فریب کاری، جھوٹ اور ریا کاری سے کام لے۔ ان سزاؤں سے بہتر استفادہ کرنے کے لیے چند نکات کی طرف توجہ ضروری ہے۔

۱۔ سزا سوچ سمجھ کر دینا چاہیے۔ لازمی مقدار سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ سزا جرم سے زیادہ نہ ہو۔ کیونکہ بچے نے اگر سزا کو اپنے خلاف ایک جنگ سمجھ لیا تو وہ ردعمل کے طور پر اپنا دفاع کرے گا اور نافرمانی و سرکشی کا مظاہرہ کرے گا۔

۲۔ سزا اس طریقے سے نہیں ہونی چاہیئے کہ بچہ والدین کو اپنا دشمن سمجھنا شروع کر دے یا وہ یہ سوچے کہ والدین مجھ سے محبت نہیں کرتے۔

۳۔ بچے سے اگر غیر ارادی طور پر ایک فعل سرزد ہو گیا ہے تو اسے سزا نہ دیں۔ کیونکہ اس میں اس کا قصور نہیں ہے۔ اس کے باوجود اگر اسے سزا دی گئی تو یہ اس کے جذبات و احساسات پر منفی اثرات مرتب کرے گی۔

۴۔ سزا کبھی کبھی دینا چاہیے۔ تاکہ اُس سے مثبت نتائج حاصل کیے جا سکیں، کیوں کہ اگر اسے مسلسل سزا دی گئی تو وہ اس کا عادی بن جائے گا۔ اور یہ سزا اس پر کسی قسم کا

اثر نہیں ڈالے گی۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

ملامت اور سرزنش کی زیادتی ڈھیٹ پن کا باعث بنتی ہے[1]

۵۔ کسی انفرادی واقعے میں بچے کو سزا دینی چاہیے نہ کہ کلی طور پر تاکہ بچہ سزا کی وجہ سمجھ سکے۔ اور پھر اس کا اعادہ نہ کرے۔ جو حضرات بے نظمی پر بچے کو سزا دیں۔ بلکہ ایک خاص مقام پر بدنظمی کی وجہ سے بچے کو سزا دیں۔

۶۔ حتی المقدور اس امر کی کوشش کرنا چاہیے کہ ایسی سزا کا انتخاب کیا جائے جو بچے کے جرم سے مناسبت رکھتی ہو۔ مثلاً اگر اس نے ریاضی کا کام نہیں کیا تو ریاضی کی مشق ہی اس سے سزا کے طور پر حل کرائی جائے۔ نہ یہ کہ اس سے حساب کی کتاب کو اول سے آخر تک لکھنے کی سزا دے دیں۔ اگر اس نے اپنا بستہ اور کپڑے پھینک دیئے ہیں تو اسے ان کو اٹھا کر مرتب طریقے سے رکھنے کا حکم دیا جائے نہ یہ کہ اسے دعوت پر نہ لے جایا جائے۔ یا اُسے گھمانے پھرانے سے محروم کر دیا جائے۔ اگر کسی دعوت پر اس نے بدتمیزی کا مظاہرہ کیا ہے تو اُسے اور دعوت پہ نہ لے کر جائیں۔ نہ یہ کہ اس کا جیب خرچ کم کر دیں۔ اگر اُس نے فضول خرچی کی ہے تو اسے جیب خرچ نہ دیں نہ یہ کہ اسے سفر پہ نہ لے جائیں۔ اگر اس نے اپنی پنسل یا قلم بے احتیاطی کی وجہ سے گم کر دیا ہے تو اتنے پیسے ہی اس کے جیب خرچ سے کم کر دیئے جائیں۔

۷۔ سزا کے بعد بچے کی غلطی کو بھول جائیں۔ اور دوبارہ اُس کا ذکر نہ کریں۔ ایک شخص کہتا ہے میں نے حضرت موسیٰ بن جعفر علیہ السلام کی خدمت میں اپنے بیٹے کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا:

اسے مارو پیٹو نہ۔ اُس کے ساتھ ناراض ہو جاؤ لیکن تمہاری یہ ناراضگی زیادہ دیر تک نہیں رہنی چاہیے[1]

---

[1] غررالحکم، ص ۷

۸- اگر آپ بچے کو سزا دینا چاہتے ہیں تو اس کا دوسرے بچوں کے ساتھ مقایسہ نہ کریں۔ اور دوسروں کی خوبیاں اُس کے سامنے بیان نہ کرنے بیٹھ جائیں کیونکہ اس طریقے سے آپ اُسے سدھار نہیں سکتے بلکہ اس میں حسد پیدا کرنے کا باعث بن سکتے ہیں۔

ایک صاحب اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

..... بچپن میں میرے والد مجھے بہت برا بھلا کہتے تھے۔ رشتہ داروں اور میرے ہم جولیوں کے سامنے میری بے عزتی کردیتے۔ اور مجھے ڈانٹتے ڈپٹتے ہمیشہ دوسروں کے گن میرے سامنے گنواتے رہتے اور مجھے حقیر سمجھتے رہتے۔ میرے والد میری جتنی بھی بے عزتی کرتے میں بھی اتنا ہی ڈھیٹ بنتا گیا مجھ میں سبق پڑھنے کا حوصلہ نہ رہا۔ میں اپنے آپ کو ناچیز سمجھتا۔ کام اور سبق سے بھاگتا۔ کسی قسم کی ذمہ داری قبول نہ کرتا۔ میرے والد کی مسلسل ڈانٹ ڈپٹ نے میری شخصیت کو مجروح کردیا۔ اب میں ایک کام چور اور گوشہ نشین فرد ہوں۔

حوصلہ افزائی اور انعام

تربیت کا ایک ذریعہ بچے کے اچھے کاموں پر اس کی تعریف اور حوصلہ افزائی ہے۔ بچے کی حوصلہ افزائی اس کی تربیت کا بہترین اور موثر ترین ذریعہ ہے۔ یہ بچے کی روح پر اثرانداز ہوتی ہے۔ اور اسے اچھا بننے کی ترغیب دلاتی ہے۔ ہر انسان اپنی ذات سے محبت کرتا ہے۔ اور اپنی شخصیت کی تکمیل چاہتا ہے اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس کی شخصیت سے آگاہ ہوں، اس کی قدر و قیمت پہچانیں۔ اور اس کا شکریہ ادا کریں۔ اگر اس کی حوصلہ افزائی کی گئی تو پھر اس کا رجحان اچھائی کی طرف اور بڑھے گا اور وہ کمال کے راستے پر گامزن ہوگا۔ لیکن اگر اس کے برعکس اس کی حوصلہ شکنی کی گئی تو وہ نیکی اور اچھائی سے دور بھاگے گا۔ اس کی حوصلہ افزائی کرنے سے اچھے نتائج کے حصول کے لیے چند باتوں کی یاد دھانی ضروری ہے۔

۱۔ اس کی حوصلہ افزائی کبھی کبھی اور بڑے کاموں پر کی جانی چاہیے۔ نہ یہ کہ ہمیشہ اور ہر کام پر۔ کیوں کہ اگر ایسا کیا گیا تو بچے کی نظر میں حوصلہ افزائی اپنی اہمیت کھو بیٹھے گی۔

۲۔ اس کی حوصلہ افزائی کسی خاص مقام پر ہونی چاہیے تاکہ وہ یہ سمجھ سکے کہ اس کو داد کس لیے دی جا رہی ہے۔ لہٰذا وہ دوسرے مقام پر بھی اسی طرح کے شائستہ طرزِ عمل کا مظاہرہ کرے گا۔ ویسے ہی عمومی طور پر اس کی حوصلہ افزائی فائدہ مند نہیں ہو سکتی مثلاً اگر بچے کو اس لیے شاباش دی جائے کہ وہ ایک اچھا اور پابند بچہ ہے

تو یہ حوصلہ افزائی کسی کام نتیجے کی حامل نہیں ہو گی۔ اچھے بچے کو یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ اس کو کیوں شاباش دی جا رہی ہے۔

۳۔ یہ بھی ضروری ہے کہ بچے کے اچھے کام یا اخلاق کی تعریف کرنا چاہیے نہ کہ خود بچے کی۔ تاکہ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ سکے کہ اہمیت اچھے کام کی ہے نہ کہ کسی شخص کی۔ اور ہر آدمی کی اہمیت اس کے اچھے کام کی وجہ سے ہے۔

۴۔ بچے کی حوصلہ افزائی کرتے وقت اس کا دوسرے بچوں کے ساتھ مقابلہ نہ کریں مثلاً باپ کا اپنے بچے سے یہ کہنا اچھا نہیں ہے کہ تجھ پر آفرین کہ تم ایک اچھے بچے ہو اور حسن کی طرح جھوٹے نہیں ہو۔ حسن بُرا بچہ ہے کیوں کہ جھوٹ بولتا ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے بچہ دوسرے بچے کو حقیر سمجھے گا۔ اور یہ بھی بذاتِ خود ایک بُری تربیت ہے۔

۵۔ شاباش اور حوصلہ افزائی حد سے تجاوز نہیں کرنی چاہیے کیونکہ ممکن ہے اس سے بچہ مغرور اور خود بین ہو جائے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

بہت سے لوگ اس تعریف کی وجہ سے مغرور ہو جاتے ہیں جو ان کی شان میں کی جاتی ہے [۱]

حضرت علی علیہ السلام ہی فرماتے ہیں:

کسی کی تعریف و ستائش میں زیادہ روی اور مبالغہ نہ کرو [۲]

تعلیم و تربیت کا ایک اور وسیلہ انعام دینا ہے۔ انعام دینا بُری بات نہیں ہے بشرطیکہ غیر متوقع ہو کسی پہلے وعدہ کی ایفائیں نہ دیا جائے اور اچھا کام کرنے پر دیا جائے۔ پہلے سے اگر انعام کا وعدہ کر دیا جائے گا تو یہ بچے میں بُرے اثرات مرتب کرے گا کیونکہ ممکن ہے ایسا کرنے سے بچہ اس بات کا عادی ہو جائے کہ وہ ہر نیک کام کے مقابلے میں انعام کا منتظر رہے

---

[۱] بحار، ج ۷۲، ص ۲۹۵

[۲] غرر الحکم، ص ۳۰۹

اور یہ ایک طرح کی رشوت ہو جائے۔ وہ اس انعام اور رشوت کے بغیر اس کام کی انجام دہی پر راضی نہ ہو۔

انسان کو نیک کاموں کا عادی ہونا چاہیے۔ اور وہ ان کو خدا کی رضا اور بندگانِ خدا کی خدمت کے لیے انجام دے۔ نہ یہ کہ ہر کام پر اس کی آنکھیں لوگوں سے انعام کی منتظر رہیں۔ اس طرح کا بچہ جب بڑا ہوتا ہے تو وہ کوتاہ فکر ہو جاتا ہے، اور لوگوں کے کاموں کی انجام دہی اپنی ذمہ داری نہیں سمجھتا۔ حتی المقدور دوسروں کے کام آنے سے فرار کرتا ہے۔ مگر یہ کہ اُسے کسی انعام یا رشوت کا لالچ دیا جائے۔ یہ ایک بہت بڑی اجتماعی بُرائی ہے۔ لہذا اس لیے کہ انعام اس بُرائی کا باعث نہ بنے ضروری ہے کہ انعام اتنی مقدار کا ہونا چاہیے کہ وہ انعام یافتہ شخص کی عادت ثانوی نہ بن جائے۔ جب بچہ کاموں کا عادی ہو جائے تو آہستہ آہستہ انعام و اکرام کا سلسلہ ختم کر دیں۔ اور اسے کاموں کی انجام دہی کی ترغیب دلائی جائے۔ ضروری ہے کہ بچہ آہستہ آہستہ اپنی ذمہ داری پر عمل پیرا ہونے کا عادی ہو جائے تاکہ وہ اس کی انجام دہی سے لذت و خوشی محسوس کرے۔ بہت سے ماں باپ اپنے بچوں کو امتحان میں سو فیصد نمبر لینے پر انعام دیتے ہیں اور اس ذریعے سے وہ انہیں سبق پڑھنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ ممکن ہے یہ کسی حد تک مؤثر بھی ہو۔ لیکن اس میں ایک بہت بڑا نقصان بھی ہے وہ یہ کہ یہ پروگرام بچے کے احساس ذمہ داری پہ کاری ضرب لگاتا ہے۔ یہ بچے اس لیے پڑھتے ہیں تاکہ اچھے نمبر حاصل کر کے انعام لے سکیں۔ حالانکہ یہ ضروری ہے کہ بچے اپنی ذمہ داری اور مسئولیت کو سمجھ کر پروان چڑھیں نا یہ کہ ہر کام کے مقابلے میں کسی مادی انعام کے خواہش مند۔

ایک صاحب اپنے خط میں لکھتے ہیں:

چوتھی کلاس سے مجھے ایک دینی مدرسہ میں داخل کروا دیا گیا۔ میں قرآن کا سبق یاد کرنے میں بہت پیچھے تھا یہاں تک کہ مجھے قرآن کا ایک کلمہ بھی یاد نہیں تھا۔ لیکن میرے ہم جماعت بہت اچھی طرح قرآن پڑھتے تھے۔ قرآن کے پہلے پیریڈ میں ہی ہمارے قاری صاحب نے خندہ پیشانی کے ساتھ مجھ سے پوچھا! کیا تم قرآن پڑھ لیتے ہو؟ میں نے پریشان ہو کر کہا! نہیں۔ تو انہوں نے کہا! کوئی حرج

نہیں ۔میں تجھے سبق دوں گا اور مجھے معلوم ہے کہ تم کلاس کے لائق ترین بچے بن جاؤ گے ۔جو کچھ بھی تمہارا دل چاہے مجھ سے پوچھ لیا کرو۔اپنے استاد کی باتوں سے مجھ میں پڑھنے کا اتنا شوق پیدا ہوا کہ میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ میں سبق میں کمزور رہنے کی تلافی کروں گا میں نے خوب محنت کی۔اور سال کے آخر میں قرآن کے سبق میں بہترین ہو گیا ۔یہاں تک کہ کبھی کبھی قاری صاحب کی جگہ میں کلاس کو پڑھاتا ۔اور صبح کی اسمبلی میں قرآن کی تلاوت کرتا ۔

ایک لڑکی اپنی یادداشتوں میں تحریر کرتی ہے۔

.......میرے والد ایک روشن خیال شخص تھے ۔ایک دن میری ماں کی غیر موجودگی میں انہوں نے میرے چند اساتذہ کی دعوت کر دی۔ کھانے پینے کا سامان لاکر میرے سپرد کر دیا میں نے بھی خوشی خوشی کھانا پکانا شروع کر دیا۔ دوپہر کو میرے ابو مہمانوں کو اپنے ساتھ لے آئے ۔جب میں نے کھانا برتنوں میں ڈالا تو معلوم ہوا کہ یہ تو اچھی طرح پکا ہی نہیں ہے ۔مرغ بھی کچا تھا اور چاول بھی خراب ہو چکے تھے چونکہ مجھے کھانا پکانے کا طریقہ نہیں آتا تھا۔ لہٰذا میں بہت غمگین تھی۔اور کسی متوقع ڈانٹ ڈپٹ کی منتظر ۔لیکن میری توقع کے برخلاف میرے والد نے مہمانوں کے سامنے تعریف کی اور کہا! یہ کھانا میری بیٹی نے پکایا ہے اور کتنا لذیذ پکایا ہے۔ مہمانوں نے بھی ان کی تائید کی۔اور میری سلیقہ شعاری کی تعریف کی۔بعد میں باپ نے بھی مجھے شاباش دی ۔اپنے باپ کی حوصلہ افزائی سے میں کھانے پکانے کے امور کی طرف متوجہ ہوئی اور اب میں مزیدار قسم کے کھانے پکانے اور دستر خوان کے باقی لوازمات میں پوری طرح ماہر ہو چکی ہوں ۔

تفسیرّ فصل الخطاب کمپیوٹر سی ڈی

(از سید العلماء حضرت علامہ سید علی نقی النقویؒ)

خصوصیات فصل الخطاب کا مکمل اردو متن دیکھا جائے گا۔ قرآن کی تمام آیات کا معہ اردو ترجمہ مطالعہ کیا جاسکے گا۔ عنادین کے اعتبار سے مطالب تک پہنچنے کی سہولت موجود ہوگی۔ آیات کی تربیت کے اعتبار سے مطالب تک پہنچے کی سہولت موجود ہوگی۔ عربی الفاظ کے انڈکس کے اعتبار سے مطالب تک پہنچنے کی سہولت موجود ہوگی۔ اردو الفاظ کے انڈکس کے اعتبار سے مطالب تک پہنچنے کی سہولت موجود ہے۔ صفحہ نمبر کے اعتبار سے مطالب تک پہنچنے کی سہولت موجود ہے۔ اردو ترجے اور عربی عبارت میں سے کوئی بھی لفظ تلاش کیا جاسکے گا۔ ہر لفظ کی کل تعداد استعمال اور کہاں کہاں استعمال ہوا ہے معلوم کیا جاسکے گا۔ تلاش کئے گئے لفظ کے مقام استعمال صفحے کو دکھایا بھی جائے گا۔ قرآن حکیم کی مکمل تلاوت شامل ہے۔ خوبصورت اور دیدہ زیب انداز میں بنایا گیا ہے۔ بنانے والے ادارے کا نام اردو اور انگریزی زبان میں شامل کیا جائے گا۔ پرنٹنگ کی سہولت : مختلف انداز میں پرنٹنگ کی سہولت موجود ہوگی۔ بچوں کی دلچسپی کے لئے تصویری پزل (۱۰ اعدد) شامل کئے ہیں۔ بچوں کی معلومات میں اضافے کیلئے قرآن کے متعلق معلومات (۱۰ صفحات) شامل کئے گئے ہیں۔ بچوں کی معلومات میں اضافے کیلئے قرآن کے متعلق معلومات میں سے سوال بمع چار جوابات (۵۰ سوالات) پوچھے جاسکتے ہیں۔ دوسری ملنے والی اسلامک سی ڈیز کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ دیگر متفرق خصوصیات کا اضافہ کیا گیا ہے۔

فوائد اس سی ڈی سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوں گے۔ سی ڈیز پر آنے سے ڈیٹا زیادہ قابلِ استعمال ہوجائے گا۔ حجم میں کمی ہوجائے گی ہے۔ قیمت میں کمی ہوگئی ہے۔ انٹرنیٹ اور ویب (web) پر بھیجنا آسان ہوجائے گا۔ زمان ومکان کے لحاظ سے دائرہ کار میں وسعت آجائے گی۔ عوامی شعور وآگہی میں اضافہ ہوگا۔ تفسیرّ قرآن میں عمومی دلچسپی بڑھے گی۔ کمپیوٹر جیسے نئے میڈیا پر اس طرح کے پروگرامز کے مثبت اثرات ہونگے۔ عوام الناس کو قرآن فہمی میں مدد ملے گی۔ علماء، محققین اور دانشمندوں کو فصل الخطاب پر تحقیق میں مدد ملے گی۔ اردو ادب اور اردو زبان کی ترقی میں مدد ملے گی۔ مختلف مکاتب فکر اس علمی ذخیرے سے فائدہ اٹھائیں گے۔

تیار کردہ مصباح القرآن ٹرسٹ 10۔ گنگارام بلڈنگ فون :7320571

ملنے کا پتہ قرآن سنٹر 24 الفضل مارکیٹ' اردو بازار' لاہور فون نمبر 7312133-7314311